اختر اورینوی کے افسانے

(مع مقدّمہ)

مرتّب: عبدُالمغنی

اختر اورینوی کے افسانے

انتخاب مع مقدّمہ

مرتب

عبدالمغنی

ناشر

بہار اردو اکادمی، پٹنہ

اختر اورینوی کے افسانے ——— ۱۹۷۷ء
تعداد ——— پانچ سو
قیمت ——— پندرہ روپے ۱۵
خوش نویس ——— اس۔ ام۔ جلیل
طابع ——— دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ ۶
ناشر ——— بہار اردو اکادمی، پٹنہ ۴

ملنے کا پتہ

بہار اردو اکادمی، بھنور پوکھر
پٹنہ ۔ ۴

فہرست

اختر اورینوی (مرحوم)

اختر اورینوی کی افسانہ نگاری

جس وقت اختر اورینوی نے افسانہ نگاری شروع کی پریم چند زندہ تھے اور ان کے پیروؤں کی ایک پوری نسل پیدا ہو چکی تھی، سدرشن، اعظم کریوی، اور علی عباس وغیرہ اُبھر چکے تھے، دوسری طرف نیاز فتح پوری کا جمالستان اور سجاد حیدر یلدرم کا خیالستان سج چکے تھے۔ مجنوں گورکھپوری کا بیاباں بھی سامنے آچکا تھا۔ حجاب امتیاز علی کا کوہ قاف نمودار ہو رہا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے ابھی لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر اختر اورینوی کے لکھنا شروع کرنے کے دو تین ہی برسوں کے بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اور چند سال اور بعد، عصمت چغتائی بھی، میدان میں آگئے۔ اسی عہد میں احمد ندیم قاسمی بھی لکھنے لگے۔ اس طرح اورینوی اُردو افسانہ نگاری کی دوسری نسل کی پہلی پُشت میں وجود پذیر ہوئے۔

یہ وہ دَور تھا جب اردو ادب میں مختصر افسانہ نگاری کی بنیاد پڑ چکی تھی، مگر درو دیوار اور بام و سقف کا صرف مسالہ تیار ہوا تھا، اور کاریگری کے لئے چابکدست معماروں کی ضرورت تھی۔ پریم چند اسکول کی حد تک اردو افسانہ اپنی بالکل ابتدائی، سادہ و معصوم شکل میں تھا۔ اس کی ہیئت اور مواد کسی میں بلوغت کی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ سیدھے سادے، دیہاتی قصّے، قصباتی کہانیاں، جناتی داستانیں، کاشتکاروں اور جاگیرداروں کی دنیا کے، زر، زمین اور زن کے سادہ تر تانے بانے سے بُنے ہوئے، فسانے، اور اس پرسکون قماش کو برہم کرنے والے ان حملوں کے کچے چٹھے جو سیاست و صنعت کی اُبھرتی ہوئی نئی دنیا کے دائرے سے زراعت و اشرافیت

کی مٹتی ہوئی پرانی دنیا پر ہو رہے تھے۔ ان کچے چھنوں میں ناگہانی حملوں سے پیدا ہونے
والی تشویش اور تجسس کا اظہار، چونکتے ہوئے مبہم احساسات، اَن جانے جذبات۔
یہ تھی کُل کائنات اُردو افسانے کی۔ پریم چند کے دائرے میں۔

بات یہ ہے کہ جدید نظم اور جدید تنقید کی طرح مختصر افسانہ بھی فنی اعتبار سے
مغرب کی دین ہے۔ اردو ادب میں یہ صنفیں براہ راست انگریزی ادبیات کے زیر اثر
پروان چڑھیں۔ اس میں شک نہیں کہ پریم چند اور ان کے اکثر پیرو کسی نہ کسی طرح سے
انگریزی افسانہ کی بو پا گئے تھے۔ لیکن فنی رسوخ کے لئے ظاہر ہے کہ محض بو پا جانا کافی نہیں۔
اس کے لئے راست مطالعہ اور باضابطہ ریاضت شرط ہے۔ اس شرط کی تکمیل اردو افسانہ
نگاروں کی پہلی نسل سے ممکن نہیں تھی۔ ان میں اکثر تو انگریزی یا کسی دوسرے مغربی
ادب سے واقف ہی نہ تھے۔ اور جو کچھ واقف تھے وہ یا تو ضروری عناصر کو جذب نہیں کر سکے،
یا کسی وجہ سے انھوں نے ان عناصر کو اختیار نہیں کیا۔ اس پہلی نسل کی نارسائی میں پریم چند
اسکول تنہا نہیں۔ اس میں نیاز کی جمالیت اور یلدرم کی تخئیلیت بھی شامل ہیں، دونوں
ہی اپنے رومان میں اس درجہ سرشار تھے کہ باہر کی حقیقت کی طرف رُخ ہی نہ کر سکے۔
مجنوں کچھ دور بڑھے میں رہے اور کچھ عبوری بن گئے۔

فن ہی سے ملتا جلتا حال نسل اول کی فکر کا بھی ہے۔ اس میں ایک طرف پریم چند
کی انتہائی سادگی ہے تو دوسری جانب نیاز کی انتہائی رنگینی۔ پیچیدگی، شعور اور ٹھوس
واقفیت دونوں جگہ مفقود ہیں۔ پریم چند اور ان کے رفیقوں کے وہاں ہندوستان کی مٹی
کی بو باس ضرور ہے، لیکن پختہ و بالیدہ فن محض کچی مٹی سے نہیں اُبھرتا، خوب صورت، سبک
اور سجیلے برتنوں کو ڈھالنے کے لئے اس مٹی کو گوندھ کر چاک پہ گھمانا اور آوے میں پکانا پڑتا ہے۔
اس کے علاوہ، لطافت و نفاست میں اضافے کے لئے مٹی کی شکل بدل کر اس کو چینی کا رنگ
بھی دینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف نیاز (و یلدرم) اس دھرتی پر قدم ہی نہیں رکھتے، یہاں
تک کہ اپنے زمانہ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ نیاز تو قدیم مصری و یونانی وغیرہ اساطیر کے اتنے
دلدادہ ہیں کہ ان کے کردار اور وہ خود الف لیلہ یا طلسم ہوشربا سے نمودار ہوتے نظر آتے

ہیں۔ یلدرم ترکی وغیرہ پہ ایسے فریفتہ ہیں کہ ان کی معدودے چند طبع زاد کہانیاں بھی دوسرے کسی ادب کا ترجمہ یا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دونوں بزرگ قدیم داستان گویوں کی طرح مثالیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ نسل اوّلین کا یہ فکری نقص اس لحاظ سے تو فطری ہے کہ ابھی یہ لوگ سوچ بچار کی بھی ابتدا ہی کر رہے تھے۔ مگر یہ امر حیران کن ہے کہ اردو ادب کی دوسری صنفوں میں علم و فکر کا نہایت بالغ سرمایہ جمع ہو چکا تھا اور بڑے بڑے مفکرین پیدا ہو چکے تھے، اس کے باوجود ہمارے افسانہ نگار عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی دنیاؤں میں سانس لے رہے تھے! یعنی ہنوز رجب علی بیگ، اور میر امّن کا پروردگار رجاگ رہا تھا اور سرشار سو رہا تھا۔

یہ تھی وہ بھولی بھالی، خواب ناک فضا جس میں اختر اورینوی نے اپنے ہم عصروں کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اس فضا کا اثر، توارث اور ماحول کے نتیجے میں، موضوع یا اسلوب کی حیثیت سے اردو افسانہ نگاروں کی دوسری نسل کی کم از کم ابتدائی کاوشوں پہ طاری رہا۔ ویسے اس نسل میں حجاب امتیاز علی اپنی قیمتی انفرادیت کے باوصف ایک گذرے ہوئے دور کے احساسات ہی کو پیش کر رہی تھیں، کہنا چاہیے کہ انھوں نے ایک نیا طلسم ہوشربا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے سوہنی مہیوال اور پھر کرشن چندر کے کشمیری لیلیٰ مجنوں، اپنے رنگین ماضی کی صدائے بازگشت تھے۔ یہ ساری باتیں فطری تھیں۔ اس لیئے کہ اردو افسانے کی ایک روایت بن چکی تھی اور آئندہ ارتقا اسی کے تسلسل میں ہوتا تھا۔

بہرحال، دوسری نسل میں مثالیت اور رومانیت کا میلان بہت جلد ختم ہو گیا۔ تاریخی حالات، ادبی اور ذاتی تجربات سبھی عام رجحان کی تبدیلی میں معاون ہوئے۔ سب سے پہلے تو جدید علوم و فنون کی اشاعت نے حسّاس طبیعتوں میں نئی نئی تہیں پیدا کیں، ذہنوں پر عجائب عالم کے دروازے کھلے، نفس و آفاق کی بے شمار باریکیاں مشاہدے اور تجربے میں آئیں۔ پھر سیاسی حوادث کے طوفانوں نے زندگی کی موجوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ تلاطم کے ساتھ ساتھ کتنے ہی گرداب ابھرے۔ اقتصادی احوال بھی دگرگوں ہو گئے۔ زراعت سے

صنعت اور دست کاری سے آلات سازی کی طرف رجحان ہو گیا۔ دیہاتوں کی جگہ شہروں نے لے لی۔ تمدن کے یہ انقلابات تہذیب پر بھی اثر انداز ہوئے۔ نئی نئی قدریں بروئے کار آ گئیں۔ دلچسپیاں اور ہمدردیاں بھی بدلنے لگیں۔ چنانچہ زندگی کے دوسرے دائروں کی طرح ادب میں اور ادب کی دوسری صنفوں کی طرح افسانے میں بھی اجتماعیات و عمرانیات کا عمل دخل کافی بڑھ گیا۔ کرداروں اور کوائف کا مطالعہ معاشیات، نفسیات اور جنسیات کی روشنی میں ہونے لگا۔

حالات کی پیچیدگی یہاں تک بڑھی کہ انسان کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ علوم و فنون کی طرح افسانوں میں بھی انسانی شخصیت کے خاص خاص پہلوؤں کی تخصیص ہونے لگی۔ منٹو نے جنسیات میں اختصاص حاصل کیا، ممتاز مفتی کو نفسیات میں ابنیا زملا، عصمت چغتائی گھر کی بھیدی بنیں، راجندر سنگھ بیدی روزمرہ کی خانگی زندگی کے علمبردار ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی نے فطرت کی دل آویزیوں اور عشق کی معصومیوں کو موضوع بنایا۔ کرشن چندر نے سیاسی و معاشی استحصال کی پردہ دری کا بیڑہ اٹھایا۔ اختر اورینوی نے تخصیص کے اس رجحان سے بغاوت کی، انھوں نے وقت کی رفتار اور موضوع کی مناسبت سے حُسن کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی، زندگی کے ہر جلوۂ گذراں کو آئینہ بند کرنا چاہا۔ حیات کو ہر سطح پر اور ہر زاویئے سے دیکھا اور دکھایا، جنس، نفس، گھر، خاندان، فطرت، عشق، سیاست اور معیشت —— فرد اور سماج کے یہ سارے گوشے اختر اورینوی کے اکثر افسانوں میں الگ الگ اور بعض افسانوں میں یکجا بھی مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ، اورینوی نے ایک تازہ اور انوکھا گناہ تفلسف کا بھی کیا ہے۔ انھوں نے بہتیرے افسانوں میں جزوی طور پر بعض افسانوں میں کلی طور پر انسان کی ابتدا اور انتہا اور کائنات کے خیر و شر کی مابعد طبعی بحثیں بھی اٹھائی ہیں۔ چنانچہ فلسفے کے ساختہ الاہیات و اخلاقیات کے شجرِ ممنوعہ سے بھی انھوں نے پھل توڑ کھائے ہیں۔ ممکن ہے اس جرأت رندانہ سے ان کی یا اردو افسانے کی عقل میں زبردست اضافہ ہو گیا ہو، مگر اس کا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا ہے کہ بعض فرشتے انھیں افسانہ نگاری کے فردوس بریں کے باہر، حلقۂ بیرون در بنانے

پڑتے نظر آتے ہیں - بہر حال اختر اورینوی کی انفرادیت تنوع اور وفور میں ہے - ویسے اگر تقسیم کار کے مروج اصول کو راہ دی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اورینوی کا امتیاز روحانی تفکر ہے - مگر اس صورت میں بھی اورینوی کے افسانوں کا کوئی خاص موضوع مقرر نہیں ہوتا - یوں کہئے کہ ان کے فن کی رَو کسی ایک سانچے میں بند نہیں ہو پاتی - ایسا اس لئے ہے کہ اورینوی کو ماجرا سے بجائے خود دلچسپی کم ہوتی ہے، بلکہ ان کی دلچسپی کا مرکز وہ احساس یا فکر ہوتا ہے جو ہر افسانے کے نقطۂ عروج پر نمودار ہوتا ہے - در اصل اورینوی ایک واضح انداز نظر کے مالک ہیں، اور ان کا یہ اندازِ نظر زندگی کے ہر رُخ اور جلوے میں ایک مخصوص ارتعاش کا سراغ لگا لیتا ہے - یہ ارتعاش فی الواقع چند بنیادی قدروں کا ہوتا ہے - اس ارتعاش کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ فن کار کے پاس کہنے کی کچھ سنجیدہ، اونچی اور گہری باتیں ہیں، جنھیں اس نے قصے میں گھول دیا ہے، یا یہی باتیں پھیل کر فسانہ ہو گئی ہیں اور اگر انھیں سمیٹا جائے تو وہ چند مجرد اصولوں میں مرتکز ہو سکتی ہیں۔

اب تک اختر اورینوی کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخی ترتیب یوں ہے :-

۱- منظر و پس منظر، ۲- کلیاں اور کانٹے، ۳- انار کلی اور بھول بھلیاں، ۴- سیمنٹ اور ڈائنامیٹ، ۵- کیچلیاں اور بال جبریل، ۶- سپنوں کے دیس میں۔ اگر ہم افسانہ نگار کے ذہنی ارتقا کی تاریخ مجموعوں کی روشنی میں بیش کرنی چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ منظر و پس منظر اور کلیاں اور کانٹے ابتدائی دور کی یادگار ہیں، جبکہ فنکار کا شعور اپنے ماحول کی چار دیواری میں محدود تھا - اس کے انداز میں ابھی اتنی بالیدگی نہیں آئی تھی کہ وقت کے میلانات سے بلند ہو کر اپنی صنف کو نئی جہت دے سکے - چناں چہ ان دونوں مجموعوں میں سماج اور فرد کے معاشی و نفسیاتی مطالعے کے وہ سارے پہلو موجود ہیں جو معاصر افسانہ نگاروں کے طرۂ ہائے امتیاز تھے - یہاں زندگی کی اقتصادی کشمکش اور افراد کے ساتھ نفسیاتی ہمدردیوں کے سارے عنوان پائے جاتے ہیں - بہر حال ان حدود کے اندر

مشاہدے کی باریکی، تصور کی لطافت، بیان کی تصویریت۔ داستان سرائی کے تینوں عناصر کافی حد تک موجود ہیں۔ اس دور کے افسانوں میں سب سے نمایاں وصف ماجرا کی فنکارانہ ترتیب ہے۔ افسانوں کی ہیئت ایسی سڈول ہے۔ جیسے گڑھا ہوا زیور، پلاٹ کی تراشش اور تعمیر نک سک سے درست، بالکل بجل، واقعات کا ارتقا بالکل مربوط اور منضبط، یہاں تک کہ کلاسکی وحدتوں کی پوری رعایت۔ کلاسکی معیار سے افسانہ نگاری کا سب سے اہم فنی مرحلہ نقطۂ عروج کی تعمیر کو سمجھا جاتا ہے۔ مذکور مجموعوں کے بیشتر افسانے اس معیار پر حیرت انگیز حد تک پورے اترتے ہیں۔ ان افسانوں میں عروج کی تعمیر اتنی مرتب و منظم ہے جیسے کسی نے ایک قالب میں مواد ڈال کر کوئی مشین ڈھال لی ہو، کہیں سے کوئی گوشہ نکلا ہوا یا کھردرا نہیں، تمام گوشے ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ جیسے کسی موزوں قامت کے اعضا کا تناسب، پھر ہر ہر جزو باہم مل کر ایک معین سمت میں آگے بڑھتا ہوا، یہاں تک کہ عروج ایک مینار یا گنبد کی چوٹی کے مانند ابھر آتا ہے۔

پہلے مجموعے 'منظر و پس منظر' کے انیس[۱۹] افسانوں میں کم از کم گیارہ[۱۱] ایسے ہیں جن پر بے اختیار نگاہ ٹک جاتی ہے:۔ ٹائپسٹ، آخری اکنی، پاگل، جینے کا سہارا، تسکین حسرت، دو مائیں، جونیئر، بیل گاڑی، سینٹ تھوریم کا فقیر، مریض، پس منظر۔ دوسرے مجموعے 'کلیاں اور کانٹے' کے گیارہ افسانوں میں چھ کے نقوش حافظے پر مرتسم ہو جاتے ہیں:۔

شادی کے تحفے، زود پشیمانی، شکور دادا، کوئلے والا، بہت بے آبرو ہو کر، کلیاں اور کانٹے۔ ان افسانوں میں اپنے گرد و پیش کے ساتھ انسان کے دل و دماغ کی بھی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہاں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، اور رہر گذشت بیک وقت حکایت ہستی بھی ہے اور تجربۂ ذاتی بھی۔ فنکار نے اپنے آس پاس سانس لیتی ہوئی زندگی کے چہچلوں کو غور سے دیکھا ہے، پھر اس مشاہدۂ عالم سے دل میں پیدا ہونے والی دھڑکنوں کو غور سے سُنا ہے، اور اس آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کا گہرا تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد اس تجزیئے کی پیش کش کے لئے سوچ کر قصّے کی ایک شکل نکالی ہے اور اس شکل کا پورا تانا بانا کھڑا کیا ہے، یہاں تک کہ ہمارے سامنے خوش وضع کہانیوں کی ایک فوج آراستہ ہو گئی ہے۔

ان کہانیوں میں بڑا تنوع اور وفور ہے۔ ٹائپسٹ سے کوئلے والا، پاگل سے شکور داد اور دو بائیں سے کلیاں اور کانٹے تک، انسانیت کے درد و داغ اور جستجو و آرزو کی رنگ برنگ تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ سیدھے سادے، سامنے کے، آئے دن ہوتے رہنے والے واقعات بھی ہیں، اور بعض غیر معمولی قسم کے، خاص الخاص و نوعے بھی، پھر ان سارے واقعات کے پیچھے دبے ہوئے واردات اور ابھرے ہوئے خیالات بھی، اور ان واردات و خیالات میں تصورات و تجربات کا میل تال بھی۔ سب سے بڑھ کر افسانہ نگار کا اپنے کرداروں کے ساتھ مخصوص رویہ ہے۔ خالق کو اپنی مخلوقات کے سرد و گرم سے محض دلچسپی نہیں، بلکہ ان کی محرومیوں کے ساتھ ایسی ہمدردی اور شادکامیوں میں ایسی شرکت ہے گویا الم اور نشاط کی یہ ساری کیفیتیں خود خالق پر گذری ہوئی ہوں۔ یگانگت کے اس مقام کو بجائے خالقیت کے والدیت سے تعبیر کرنا بہتر ہوگا۔ لیکن اتنی قربت کے باوجود یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ صانع اور مصنوع کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ گیا اور معاملہ من تو شدم تو من شدی کا ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ جذب کامل کا یہ حادثہ اگر واقعی رونما ہو جاتا تو پھر افسانہ نو وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ فن کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم وضع ہیئت میں معروضیت کارفرما ہو، اور اس طرح افسانہ نگار اور اس کے تخلیق کردہ کرداروں کے درمیان کچھ ذہنی فاصلہ لامحالہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس فاصلے کی بدولت ہی افسانہ نگار مختلف اور کبھی متضاد کرداروں کے ساتھ رشتۂ الفت قائم کر لیتا ہے۔ اس طرح اصل معاملہ حلول اور نفوذ کا ہو جاتا ہے، یعنی فنکار کی اپنے نمونوں کے ساتھ ایسی گہری موانست جو صرف دو رازدار دوستوں کے درمیان ہوا کرتی ہے اور یہ رازداری محض تبادلۂ اطلاعات تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ بیچ میں ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ واردات صرف معلوم نہیں محسوس بھی ہوتی ہیں۔ یہ چھٹی حس اور یبوی کے پاس وافر مقدار میں ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ مختلف شخصیتوں کے دل و دماغ میں گھس جاتے ہیں، یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے لئے ان کی دھڑکنوں کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں اور اسی حالت میں ان شخصیتوں کو نقش بند کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قاری جب ان نقش بندوں کے احوال پڑھتا ہے تو اس پر بھی تقریباً اسی قسم کے کوائف گذر جاتے ہیں جیسے خود فنکار پر دورانِ مطالعہ گذرے

چیکے ہوتے ہیں۔ ہیئت کے سرد خانے کی یخ بستگیوں کے باوجود تخلیقات میں اتنی حرارت اور زندہ دلی غیر معمولی تصور اور نہایت تیکھے نقوش کے استعمال سے ہی بروئے کار آسکتی ہے، اور اورینوی تصور اور نقوش دونوں کے عظیم سرمایہ دار ہیں۔

افسانے کی تنگ تکنیک میں کسے ہونے کے باوجود زیرِ نظر مجموعوں کے فسانوں میں "محسوس زندگی کے احساس" کی یہ فراوانی یقینی طور پر فکر و فن کی آئندہ رفعتوں کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ آئندہ رفعتوں سے قطع نظر، اپنی اس ابتدائی شکل میں بھی اورینوی کی افسانہ نگاری اردو ادب میں ایک مقام کی مستحق ہے، بالخصوص جب اس کو اپنے دور کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ اورینوی نے اپنے فن کی ابتدا ان افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہو کر کی جو ایک زمانے میں ترقی پسند کہے جاتے تھے۔ بہر حال اس دور کے لکھنے والوں میں (منٹو اور عصمت کے علاوہ) کرشن چندر اور بیدی سب سے نمایاں ہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ تصور میں اورینوی کرشن چندر سے زیادہ قریب ہیں، مگر (زیرِ نظر مجموعوں میں) تکنیک کے اعتبار سے وہ بیدی سے مماثل ہیں۔ بیدی کے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہی تراش خراش اور چستی ہے جو اورینوی کے ابتدائی افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ تھوڑا سا فرق عروج کی تعمیر میں پایا جاتا ہے۔ اورینوی کا عروج تیز رفتار ارتقائے ماجرا پر ایک جھٹکے کے ساتھ بریک نہیں لگاتا، بلکہ گاڑی کو رفتہ رفتہ، فطری رفتار سے، نہایت سکون کے ساتھ، قاری کے اندازے کے مطابق، منزل پر لے آتا ہے۔ بیدی بھی گرچہ عروج میں ڈرامائیت کے قائل نہیں، مگر ان کے وہاں ارتقا میں اتنی تراشیدہ ہمواری نہیں۔ ایک ہی قسم کے عمل میں یہ درجوں کا فرق ہے۔ شاید اس کی وجہ پلاٹ کی تشکیل میں بھی دونوں کے درمیان چند درجوں کا فرق ہے، بیدی کے پلاٹ میں کچھ الجھاوے ملتے ہیں، جب کہ اورینوی کا پلاٹ ناک کی طرح سیدھا ہوتا ہے۔ غالباً اسی لئے اورینوی کا عروج جتنا نوکیلا ہے بیدی یا کسی دوسرے افسانہ نگار کا نہیں۔

اختر اورینوی کی فنی تربیت کا یہ دور اُن کے تیسرے مجموعے "انار کلی اور بھول بھلیاں" تک جاری رہتا ہے۔ عنوان کے افسانے کے علاوہ مجموعے کے دوسرے نمایاں افسانوں۔

بیداری، ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، تاریک سائے، کواڑ کی اوٹ سے، آئینہ ۔
سب میں جنس و نفس کی گہرائیوں کی وہی پیمائش ملتی ہے جو پہلے اور دوسرے مجموعے میں
پائی جاتی ہے ۔ اب تک اوریتوی کا تخیل ترقی پسندی کی چاردیواری سے باہر نہیں
نکلا ہے ۔ وہی زر، وہی زمین، وہی زن اور وہی جھگڑے اور الجھیڑے ۔ حد تو یہ ہے
کہ ننگا ہیں، نام کے ایک افسانے میں اوریتوی نے عصمت چغتائی کے محبوب موضوع،
زنانہ ہوس کو بھی مجسم کر دیا ۔ اس طرح "جنگلی" میں وہ کرشن چندر کے عالم انسانیت
میں دائمی قحط کو پیش کرتے نظر آتے ہیں ۔ "بیداری" اور "تاریک سائے" دونوں
پر منٹو کا عکس ہے ۔ "کواڑ کی اوٹ سے" ممتاز مفتی کو رستہ دکھاتا ہے ۔ اس طرح
اوریتوی اپنے ہم عصروں کے، ہم مذاقی کی حد تک، قدم بہ قدم ہیں، بلکہ کہنا چاہیے،
ہم زلف ہیں: ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے ؎ سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

لیکن اس ترقی پسندانہ بے خودی میں ایک ہوشیاری بھی اوریتوی کے
یہاں پائی جاتی ہے ۔ یعنی موضوعات کی یکسانی کے باوجود ان کی پیش کش کا انداز
بالعموم اپنے ہمعصروں سے قطعی مختلف ہوتا ہے ، جنس، نفس، اور شکم، تینوں معاملوں
میں وہ اپنے جذبات کی تہذیب دوسروں سے کہیں زیادہ کر لیتے ہیں ۔ دوسری بات
یہ کہ ان ٹھیٹ معاملات میں بھی ان کا انداز نظر فلسفیانہ یا شاعرانہ ہوتا ہے ۔ وہ نہ مزدور
بن پاتے ہیں نہ مریض اور نہ عاشق ۔ بلکہ ہر حال میں ایک فنکار یا مفکر ہی رہتے ہیں ۔
نتیجتہً ان کہانیوں میں الجھنوں، توڑ پھوڑ اور برہنگی کا ثبوت نہیں ملتا ، صرف ابنِ آدم
اور بنتِ حوا کی ہزار خواہشوں اور ناآسودگیوں کی لکیریں مل جاتی ہیں ۔ معلوم نہیں،
اوریتوی قصداً ذہنی عیاشیوں سے دامن بچاتے ہیں ، یا ان کی طبیعت ہی اِدھر نہیں
آتی ۔ شاید مادی لذتوں سے ان کی تنزیہہ کی وجہ وہ جانکاہ سوچ ہو جو ان کے ذہن
پر ہر وقت مسلط رہتی ہے اور کبھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتی کہ کھل کھیلیں ۔

یہ سوچ گرچہ ابھی تک واضح اور منظم شکل میں نمودار نہیں ہو سکی ہے ، مگر ۔
"کواڑ کی اوٹ سے"، "آئینہ" میں جھانک ضرور رہی ہے ۔ اور اس کا دھندلا دھندلا

عکس اب تک کے بیشتر افسانوں میں بکھرا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "انار کلی اور بھول بھلیاں" اور رینوی کی افسانہ نگاری کے اس عبوری دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ پچھلے موضوعات ہنوز چلے جا رہے ہیں مگر اندازِ نظر اور پیش کش میں فرق ابھرا ہے۔ اب افسانہ نگار کے ذہن میں زیادہ وسعت اور شعور میں زیادہ گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ اسے زندگی کے بلند تر حقائق اور انسانیت کی عمیق تر قدروں کا مبہم احساس ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تکنیک کا وہ سانچہ اب پگھلنے لگا ہے جو پیش پا افتادہ واقعات کی ترکیب کے لئے کافی ہے۔ ہیئت میں وہ تراشیدگی اور چستی نہیں جو منظر و پس منظر، اور کلیاں اور کانٹے تک قائم تھی۔ اب فن کار کے تجربات زیادہ وسیع پیچیدہ اور بالیدہ ہونے لگے ہیں۔ اب اس کی روح کا وفور اور سیل رسمی حدود میں بند ہونے والا نہیں، اس کی جدتیں اپنے بھرپور اظہار کے لئے اب نئے پیمانوں کی طالب ہیں۔ ع

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

کہہ سکتے ہیں کہ اور رینوی کی فنی تربیت کا دور اب ختم ہو رہا ہے، انہیں اردو افسانہ نگاری میں جو کارنامہ انجام دینا ہے اور اس کے صلے میں جو امتیاز حاصل کرنا ہے اس کے لئے قدرتِ فن کی جو شرطِ اولیں تھی وہ اب پوری ہو رہی ہے۔ پہلے دو مجموعوں میں اور رینوی نے افسانے کی ہیئت پر قدرت حاصل کی اور تیسرے مجموعے میں انھوں نے اپنی فکر کی ندرت کے پیشِ نظر اپنے فن کی انفرادیت کے لئے تجربے شروع کر دیے، بلکہ تجربوں کی کامیابی کی راہ پر لگ گئے۔

اختر اور رینوی کا چوتھا مجموعہ "سیمنٹ اور ڈائنامیٹ" ہے، جس کے کل آٹھ افسانوں میں چھ کو ہم چن لے سکتے ہیں:۔ سیمنٹ، پندرہ منٹ، گھر کو واپسی، پر اب بھی کبھی کبھی، رات بھر، ڈائنامیٹ۔ پانچویں مجموعے "کیچلیاں اور بالِ جبریل" کے دس افسانوں میں عنوان کی کہانی کے علاوہ یہ کہانیاں سنایاں ہیں:۔ سیکھ جمہور، الکاہٹ، گرجا کے سائے میں جنت سے دور، انھیں مرد سے نہ کہو، کل آج کل، راج محل، ایک

معمولی سی لڑکی۔ چھٹے مجموعے کے افسانوں میں : سپنوں کے دیس میں اور اشٹ گرہ، قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تینوں مجموعے مجموعی حیثیت سے بھی اور اپنے بعض منفرد افسانوں کی بدولت بھی، اور رینوی کی افسانہ نگاری کے عروج و کمال کا واضح نقش پیش کرتے ہیں۔ اب اور رینوی کو زندگی کی داستان سرائی کے لیے کسی بندھے ٹکے سانچے کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ ان کے تجربات اتنے وسیع اور بصیرت اتنی گہری ہو چکی ہے کہ وہ افسانہ کہیں سے شروع اور کہیں پر ختم کر دے سکتے ہیں ؎

شنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے شنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

انھیں اپنے تخیل کی رنگینی، فکر کی لطافت اور اسلوب کی جاذبیت پر پورا بھروسا ہے۔ ان کی نگاہ اتنی باریک اور تصور اتنا گداز آفریں ہو چکا ہے کہ دقیق فلسفیانہ، یہاں تک کہ مابعد طبیعی افکار بھی چھن اور پگھل کر ایک طلسم ہوشربا تخلیق کر سکتے ہیں۔

یہ آخری تین مجموعے قبل کے تین مجموعوں سے اس معنی میں ممتاز نہیں ہیں کہ ان میں اور رینوی چھلانگ لگا کر یک بیک دھرتی سے آکاش پر چلے گئے ہیں۔ ایسی بات تو نہیں کہ موضوعات یک لخت بدل گئے ہیں اور بالکل اچھوتے واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے، یا اندازِ نظر یک سر متغیر ہو گیا ہے، یا اسلوب میں کوئی نمایاں تغیر آگیا ہے۔ اور نہ یہ بات ہے کہ اور رینوی افسانے کی تکنیک سے بالکل بے پروا ہو گئے ہیں۔ اور رینوی کے طویل دورِ افسانہ نگاری (جو قریباً ربع صدی پر محیط ہے) کے مذکورہ تین مرحلے ان کی فکری و فنی پیش رفت میں کسی انقلاب کی نشان دہی نہیں کرتے، بلکہ معاملہ صرف ارتقائے مسلسل کا ہے۔ مثال کے طور پر منظر و پس منظر کا مریض ابھی ہے جس کے شعور نے سپنوں کے دیس میں، اقامت اختیار کی ہے۔ اس طرح اعداد و شمار کی اگر جستجو کی جائے تو دریافت ہو گا کہ اور رینوی نے اپنے ہر دوسرے مجموعے میں پہلے مجموعے کے ایک سے زیادہ موضوعات کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن یہ واقعہ جمود اور تکرار پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ بس ایک ارتقا ہے، جس کی نوعیت یہ ہے کہ فنکار لمحاتِ زندگی کے تسلسل کا راز داں ہے، وہ جانتا ہے کہ دنیا میں ایک ہی قسم

کے واقعات مختلف اوقات میں پہلو بدل بدل کر مختلف شکلوں میں سامنے آتے رہتے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ احوال و ظروف کے اعتبار سے مسائل کی بے شمار صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ مگر
ان مسائل کی تہہ میں پڑی ہوئی قدریں اپنی جگہ استوار رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ کا
موضوع لے لیجئے۔ اوپیندر ناتھ اشک؟ اور بیدی نے زندگی کے اس اہم مسئلے پر اپنی افسانہ نگاری کے ہر دور میں
مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے، اگرچہ مرکزی نقطہ ایک، وہی درد انسانیت کا رہا ہے۔
کلیاں اور کانٹے میں 'پناہ گزیں'، انار کلی اور بھول بھلیاں میں 'آئینہ'، سیمنٹ اور ڈائنامیٹ
میں 'گھر کو واپسی'، پیچلیاں اور بال جبریل میں 'انھیں مُردے نہ کہو' اور سپنوں کے دیس
میں 'حدیں'، 'نقشِ قدم' اور 'میلی پیڈ'۔ ایک ہی حقیقت کے متفرق جلوؤں کو پیش
کرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ دوسرے فنکاروں کی طرح افسانہ نگار بھی، اگر وہ حقیقت پسند
ہے، گرد و پیش سانس لیتی ہوئی حیات کے ابھرتے اور مٹتے ہوئے نقوش کی اپنے اندازِ فکر
کے مطابق ترجمانی کرتا رہتا ہے اور یہ نقوش بنیادی طور پر یکساں ہونے کے باوجود ہمیشہ
روپ بدلتے رہتے ہیں، پھر زندگی کی حقیقتیں اپنی ظاہری سادگی کے باوجود بڑی پیچیدہ
اور پُر اسرار ہیں، یہ کبھی ایک دفعہ پوری گرفت میں نہیں آتیں، کوئی ایک لمحہ، وہ کتنا ہی
طویل ہو، ان حقیقتوں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کافی نہیں، ایک نارمل آدمی کے سامنے
ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو مختلف وقتوں میں آتے ہیں، چنانچہ جو ذہین اور متحرک فنکار
ہیں ان کی تلاشِ حقیقت کبھی ختم نہیں ہوتی، ان کا سینہ برابر جستجو و آرزو کی ناآسودگیوں سے
گرم جوش رہتا ہے، وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں چوکنا رہتے ہیں، آخری سانس تک ان
کی آنکھوں میں دم رہتا ہے اور وہ گلزارِ ہست و بود کو بار بار دیکھتے رہتے ہیں، مبادا کب
کوئی نیا شگوفہ کھل جائے اور ان کی نگاہیں لذتِ دید سے محروم رہ جائیں۔ اس کے علاوہ
فنکار کا طبعی عدمِ اطمینان بھی ہے، ایک صاحبِ ذوق اور باشعور فنکار کو حقیقت کے
کسی جلوے کی صورت گری کے بعد شاید ہی تکمیل و تشفی کا احساس ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ ایک ہی جلوے کی ایک تصویر ختم نہیں ہوتی کہ دوسری کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت

کے پیچیدہ موضوع اور فنکار کی جستجوئے پیہم سے جو صورتِ حال بروئے کار آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر، بدلتے ہوئے حالات میں جب کبھی کوئی نیا پہلو سامنے آجاتا ہے تو فنکار چوکنا ہو جاتا ہے اور موضوع کے نئے پہلو کو فوراً اپنے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ تازگی ان فنکاروں میں پائی جاتی ہے جن کی شخصیت اپنے ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔ اختر اورینوی ایسے ہی ایک فنکار ہیں۔

اس صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حقیقت پسند فنکار سب سے پہلے اپنے زمانے اور ماحول کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس پڑی ہوئی چیزوں کو اٹھاتا ہے اور انھیں ایک قالب میں ڈھال کر فن بنا دیتا ہے۔ اس کا پہلا اور براہ راست واسطہ اپنے زمان و مکان کے ان ہی عناصر سے ہوتا ہے جو بظاہر نہایت معمولی اور محدود معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فنکار بھی جن کا مقصود مثالی اور تخیلی ہوتا ہے اپنے افکار و خیالات کی تجسیم کے لیے روزمرہ کے حقائق و واقعات کو استعمال کرنے پر مجبور رہے، ورنہ ان کی فکر فن نہیں بن پائے گی۔ فکر کتنی ہی لطیف ہو، اپنے فنی انعکاس کے لئے اس کو کثافت کا سہارا لینا ہی پڑے گا جو دُنیوی زندگی کی رونق ہے۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ اپنے زمانے کے جنسی، نفسیاتی اور اقتصادی مسائل کے ساتھ انھوں نے پورا انصاف کیا ہے۔ 'جونیر وکیل' سے 'کوئلے والا' تک شاید ہی کوئی سماجی ٹائپ ہو جو ان سے چھوٹ گیا ہو۔ اسی طرح 'لےلیں'، 'یہ دنیا'، 'بہت بے آبرو ہو کر'، 'نگاہیں'، 'تاریک سائے'، اور 'تمنا' جنسی الجھنوں کے متنوع تیوروں کو پیش کرتے ہیں۔ 'کواڑ کی اوٹ سے'، 'ایک معمولی سی لڑکی'، 'بوڑھی ماما'، 'دیکھ جھور'، 'شکور دادا'، 'جینے کا سہارا' انسانی نفسیات کی نت نئی گرہوں کو کھولتے ہیں۔

لہٰذا جہاں تک موضوعات اور اجتماعی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کا تعلق ہے، اورینوی کا انداز پہلے مجموعے 'منظر و پس منظر' سے آخری مجموعے 'سپنوں کے دیس میں' تک یکساں ہے، جس طرح نوجوانی میں انھوں نے فرد اور سماج کے پیش پا افتادہ مسئلوں کو داستان بنایا تھا، اسی طرح کہولت میں بھی عام حقائق کے ساتھ ان کا تجسس جوں کا توں قائم ہے۔ وہ

اب بھی اُٹھتی اور مچلتی ہوئی جوانیوں، پس ماندہ انسانوں اور جنگ کی دردناکیوں کی کہانیاں بڑی لہک سے سناتے ہیں، وہ ابھی تک ایک افسانہ نگار کی طرح معصوم بچہ کتنا اور چونچال ہیں۔ ان کی الشاء ایک زندہ دل کا اشاریہ ہے۔ لیکن طبیعت کی اس تازگی کے باوصف ذہن کی بڑھتی ہوئی سنجیدگی افسانوں کے تاثر سے صاف نمایاں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نظر وہی ہے مگر اندازِ نظر بدل گیا ہے۔ گرچہ بدلنے کا عام مفہوم یہاں بہ مشکل لاگو ہوگا۔ اس لیے کہ اوریموی کا یہ اندازِ نظر شروع ہی سے ان کے فن کو ایک خاص رُخ پر بڑھا رہا ہے۔ یہ رخ کینچلیاں اور بالِ جبریل، اور سپنوں کے دیس میں آ کر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار جس چوٹی تک پہنچنے کے لیے متنوع نشیب و فراز کی پیمائش کر رہا تھا وہ ان عظیم افسانوں میں سر ہو جاتی ہے۔ قبل اور بعد کے جتنے افسانے ہیں وہ اس چوٹی کی راہ میں چڑھاؤ اور اتار کے پڑاؤ ہیں۔ حکایتِ ہستی کی جتنی تعبیریں اوریموی نے پیش کی ہیں وہ سب ان ہی دو داستانوں کی پکار یا بازگشت ہیں۔ یہ افسانے حکایتوں کی حکایت پیش کرتے ہیں، ان میں انسان کی دُنیوی زندگی کے تمام درد و داغ اور جستجو و آرزو کو نچوڑ دیا گیا ہے، تخلیق سے ارتقا تک کے سارے مرحلوں کو ان میں نقش بند کر دیا گیا ہے، یہاں تک کہ زوال اور فنا تک کی پیش قیاسی کر دی گئی ہے، بلکہ حیاتِ نو کا اشارہ بھی دے دیا گیا ہے۔

"میں اپنے خوابوں کا نفسی تجزیہ و تحلیل کرنے لگا۔ کیا یہ دجال اور آزاد پرومیتھیوس، یہ اژدہے، سانپ اور آتشیں بچھو خود میرے نفس سے نہیں نکلے؟ کیا ارتقا صرف کینچلیاں بدلنے کا نام ہے؟ اور میں سانپ کا سانپ ہی رہا؟ کیا یہ بھی میرے اندر ہے؟ کیا میں نے اپنی روح کے ایک گوشے کو شیطان کے تصرف سے بچا لیا ہے؟ کیا مجھے جبریل کے پر پرواز بھی عطا ہوں گے؟ یا میں اس غم میں خودکشی کر لوں گا؟ اگر مجھے جوہرِ روح نہ ملا تو میں مادہ کی جوہر شکنی کر کے خدا کی کائنات کو فنا کر دوں گا اور خود بھی فنا ہو جاؤں گا۔"

زوال آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟ "

(خاتمہ کہیلیاں اور بالِ جبریل)

"سپنوں کے دیس میں یاجوج و ماجوج موجیں مارنے لگے ۔ کوہ قاف کے دیو زادوں نے آکاش اور پرتھوی پر قبضہ کر لیا ۔ سند باد جہازی کے سفر الف لیلوی دنیا سے باہر نکل آئے ۔ دجلِ فریب کا عفریت اپنی مٹھیوں میں دوزخ و جنت لئے دنیا کو ناپنے نکلا ۔ اس نے ذرے کو آفتاب ساماں بنا دیا ۔ اہرمن کو مادہ پر قدرت حاصل ہوئی اور دجال نے خدائی کا دعویٰ کر دیا ۔ مگر جوہرِ مادہ تک رسائی مادہ کی شکست بھی تھی ۔ مادہ انادی نہیں ، ازلی و ابدی نہیں ، اصل توانائی ماورائے مادہ ہے اور خود اہرمن کے ہاتھوں مادہ اور مادیت کے لات و منات ٹوٹ گئے ۔ جنوں نے طلسمی گولے لے کر ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیا ۔ عالم تو نور افشاں بھی تھا اور ہوشربا بھی ۔ بڑی کشمکش پیدا ہوئی ۔ سخت تصادم رونما ہوا ۔ بھیانک دھماکے ہوئے ۔ کائنات لرزہ بر اندام ہو گئی ۔ خواب کے پتلے فنا ہو گئے ۔ سپنوں کا سنسار تحلیل ہونے لگا ، شاید برہما کی نیند و اور برہما کی کہانی ختم ہو رہی تھی ۔ یہ عظیم دماغ کا ایک لمحہ تھا یا ابدیت کی ایک کڑی ؟ کون جانے ! عظیم دماغ خلفشارِ عالم سے بیدار ہو رہا تھا ۔ برہما کی نیند دھماکوں سے اچٹ گئی تھی ۔ سپنوں کا سنسار چھا یا ! خواب کی دنیا مایا ! کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا ؟ کیا برہما پھر اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا ؟ "

(خاتمہ : سپنوں کے دیس میں)

یہ دونوں افسانے میرے مطالعہ کی حد تک اردو ہی میں نہیں ، پوری دنیائے ادب میں فقید المثال ہیں ۔ افسانہ نگاری کی دنیا میں کسی ادیب نے اب تک یہ جرأت ، اور اس سے زیادہ صلاحیت بہم نہیں پہنچائی تھی کہ تخلیق و تقدیر کے پیچیدہ و سربستہ اسرار کو اس فلسفیانہ تحقیق کے ساتھ

افشا کرنے کی کوشش کرے ۔ فکر و فن دونوں اعتبار سے ان افسانوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں اب تک کی معلوم تاریخ انسانی کے تمام حقائق کو سمیٹ لیا گیا ہے ۔ ارتقائے آدم کے ہزار رہا مرحلوں کو ایک نظام فکر کے تحت مربوط کر دیا گیا ہے ۔ جسم و روح کے تمام انقلابات کو مرتب کر دیا گیا ہے ۔ فلسفہ ، مذہب ، شاعری ، سائنس ، نفسیات ، ناول ، اقتصادیات ۔ زندگی کی تمام تعبیروں اور ذہن انسانی کی تمام رووں کو منضبط کر لیا گیا ہے ۔ پھر علوم و فنون پر مبنی افکار کو محض بیان نہیں کیا گیا ہے ، بلکہ ان افکار کو فنی نقوش کی صورت بھی دی گئی ہے ، علوم و فنون کے بے شمار استعارے اور تلمیحیں اس طرح عبارت میں چست کر دی گئی ہیں کہ عام زبان کا حصہ معلوم ہوتی ہیں ۔ یعنی صرف افسانے کی ہیئت ہی میں نہیں بلکہ اسلوب میں بھی علوم و فنون کو علامات کی حد تک جذب کر لیا گیا ہے ۔ ادبی اعتبار سے مذکورہ افسانوں کا سب سے بڑا کمال یہی ہے ۔

لیکن خالص فکری اعتبار سے افکار کا اس حد تک گداز کچھ الجھنوں کا باعث بھی ہو جاتا ہے ۔ اور رضوی نے افسانے کی تکنیک کو افکار کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لئے دونوں افسانوں میں خواب کا چوکھٹا استعمال کیا ہے ۔ "کیچلیاں اور بال جبریل" کا نوجوان آدم خواب دیکھتا ہے اور اپنی جسمانی و روحانی معراج (یا شاید زوال) کے تمام مراحل طے کرتا ہے ۔ "ادھ سپنوں کے دیس میں" خالق آدم خواب دیکھتا ہے اور تخلیق کائنات و حیات کے تمام نشیب و فراز سے گزرتا ہے ۔ اس طرح پردۂ سیمیں جیسی ایک خواب ناک فضا پیدا ہو جاتی ہے ، جس میں رنگ برنگ مناظر ابھرتے ہیں اور متنوع کردار اپنے اپنے حصے کی نقلیں کرتے ہیں ، اور ایک دلچسپ تماشے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، ایک ڈرامائی ماحول بن جاتا ہے اور آخر تک تجسس سا قائم رہتا ہے ۔ اس انداز سے دقیق افکار کے ہجوم میں بھی فن سالم رہ جاتا ہے ۔ مگر فکر اگر سلیم رہ بھی جاتی ہو تو اس کی رفتار مستقیم تو یقیناً نہیں رہ پاتی ۔ اس لئے کہ خواب کتنا ہی معنی خیز ہو ، بیداری کے ایسا حقیقت افروز نہیں ہو سکتا ، خواب خواہ آدمی کا ہو یا خدا کا ، عالم واقعہ کی ٹھوس زندگی کی پوری توجیہ کرنے سے قاصر ہے ۔ خواب سے کچھ اس قسم کا فریب آرزو پیدا ہوتا ہے جیسا ان زبان زد

مصرعوں سے ٹپکتا ہے:

"ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں"،

"زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا"۔

شاید اسی خواب کا اثر ہے کہ زبردست ذہنی کاوش اور فکری قوت کے باوجود دونوں افسانوں کا انجام قنوطیت پر ہوتا ہے: 'میں مادہ کی جوہر شکنی کر کے خدا کی کائنات کو فنا کر دوں گا اور خود بھی فنا ہو جاؤں گا' (پہیلیاں اور بال جبریل) "سپنوں کا سنسار چھایا! خواب کی دنیا مایا!" (سپنوں کے دیس میں)، اگرچہ ان اختتامیوں کے ساتھ ذیل کے فقرے اور جملے بھی لگے ہوئے ہیں 'اگر مجھے جوہر روح نہ ملا تو......' (بال جبریل اور پہیلیاں)۔ 'کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا؟ کیا یہ ہما پھر اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا؟' (سپنوں کے دیس میں) اس سے قطع نظر کہ 'اگر' کا شرطیہ بجائے خود اندیشہ و خوف پر مبنی ہے، 'عظیم دماغ' کا اب تک خفتہ رہنا اور دنیا کو فقط 'مایا' کی چھایا' دیتے رہنا: ('عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے') پھر جاگ کر بھی دوسرے سپنے میں چلا جانا۔ یہ ساری باتیں عالم انسانیت کو امید کا کوئی پیغام نہیں دیتیں، بلکہ قصے کے درمیان خدا کے آخری پیغام اور "آتشیں شریعت" کے طلوع و فروغ کی جو بصیرت انگیز بشارت دی گئی تھی وہ بھی خاتمے کے بعد مجموعی تاثر کے نتیجے میں زائل ہو جاتی ہے۔

بہر حال، ان افسانوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان کو پڑھ کر سرگذشتِ آدم کی ایک رنگین تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ انسان کے نفس و آفاق کی تہوں اور گرہوں کا شعور حاصل ہوتا ہے، ابن آدم زمین پر جس صورت حال سے دوچار ہے اس کا علم ہوتا ہے، آدمی کے حوصلوں اور شکستوں کی آگاہی ملتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئی دنیا میں انسانیت کے مستقبل کے متعلق نہایت سنجیدہ فکر لاحق ہو جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جس دھرتی پر، جن فضاؤں اور جن سمندروں میں آدمی اپنی حکمت کا تخت رواں لئے چلا جا رہا ہے وہ محفوظ نہیں، اور یہ کہ جس راہ پر ہمارا سفر جاری ہے وہ منزل کی طرف لے جانے والی نہیں ہے، ہم نے ازل ابد کے بیچ میں کہیں پر اپنا رخ غلط سمت میں موڑ

لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ ہمیں اس زیاں کا احساس تک نہیں، پس چہ باید کرد! اس طرح اور رینوی کا کارنامۂ عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے جدید انسان کے سامنے اس کی انسانیت کے متعلق ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے، اس کے ذہن، فریب خوردہ ذہن، کو جھنجوڑ دیا ہے کہ وہ جس بات کو عروجِ آدمِ خاکی سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت زوالِ آدمِ خاکی ہے۔ چنانچہ خالص فن کے دائرے میں اختر اور رینوی پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس لیے کہ بالعموم فن کا کام اسی طرح زندگی اور اس کے مظاہر کے متعلق سوال، معنی خیز اور کار آفریں سوال اٹھانا ہے تاکہ انسان کی روح کسی لمحے تعمیرِ حیات کے منصبی وظیفے سے غافل نہ ہو۔ اس کے علاوہ خالص فلسفیانہ سطح پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں نے معمولی آدمی کی حدودِ عقل میں رہتے ہوئے صرف اس کیفیت کی آئینہ سامانی کی ہے:

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

افسانہ نگار نے جہاں سے جہاں تک حکایتِ ہستی سنی ہے بلا کم و کاست بیان کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے اشارہ و استعارہ ہے، جس میں کاوشِ فکر کے نتیجہ خیز ہونے کا کوئی تیقن نہیں۔

"کیچلیاں اور بالِ جبریل" اور "سپنوں کے دیس میں"، اختر اور رینوی کے فن کے بہترین نمائندے ہیں، ان دونوں سے اور رینوی کی افسانہ نگاری کا قد اور رفتار دونوں متعین ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ افسانے کسی اچانک عمل کی پیداوار نہیں۔ ان کے پیچھے ایک وسیع و عریض فن کا پورا ارتقا ہے۔ یہ افسانے اور رینوی کی افسانہ نگاری کے پورے کردار کے اشاریے ہیں اور یہ کردار اردو افسانہ نگاری کی روایت میں ایک منفرد استعداد، ایک انوکھا تجربہ پیش کرتا ہے۔

نئی اعتبار سے ادب کی چند قسمیں، کچھ نظم اور کچھ نثر میں، منفرد کر دی گئی ہیں،

جنھیں اصطلاح میں اصناف کہا جاتا ہے۔ یہ صنفیں، کلاسکی نقطۂ نظر سے، نہ صرف اپنی علاحدہ شکلیں رکھتی ہیں، بلکہ ان کے مزاج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا رنگ اور آہنگ جدا جدا ہے۔ مثلاً ڈراما ادب کی دوسری صنفوں سے الگ اپنی ایک مخصوص فضا رکھتا ہے۔ کشمکش، کشیدگی، رفعتِ تخئیل، عمقِ نگاہ، شوکتِ اسلوب، بالخصوص ڈرامے کے وہ عناصر ہیں جو اسے اوروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اسی طرح رزمیہ کے اندر ایک خاص انداز کا کرّوفر، پرواز، سیل اور ہیجان پایا جاتا ہے، اس کا طرز ڈرامے سے بھی زیادہ تند اور آتشیں ہوتا ہے، اس کی تخئیل میں ڈرامے سے بھی زیادہ بلندی ہوتی ہے، اور اس کے جذبات کی تہیں غیر معمولی ہوتی ہیں۔ افسانہ نگاری بھی ایک ممتاز صنفِ ادب ہے۔ اس میں انسان کے معمولی، روزمرہ کے سماجی تعلقات و واقعات، اور ان تعلقات و واقعات کے پس منظر میں افراد کے عمل اور ردعمل اور اس عمل اور ردعمل سے ابھرنے والی سوچ کا بیان ہوتا ہے، اس کا اپنا ایک سیدھا سادا، نرم و سبک اسلوب بھی سمجھا جاتا ہے۔

اورینوی کی افسانہ نگاری، بحیثیت مجموعی، اسی فنی روایت کے سامنے ایک مسئلہ بن کر آتی ہے۔ اورینوی کے منفرد اور نمائندہ افسانے اس کلاسیکی چوکھٹے میں بہ مشکل سمائیں گے جس کا نقشہ اوپر پیش کیا گیا۔ بحیثیت فنکار، اورینوی کا تجربہ اور تخئیل دونوں افسانہ نگاری سے زائد ایک قدر اپنے اندر رکھتے ہیں، ان کا مطالعہ، تفکر اور جذبات بھی افسانے کے ٹکسالی تصور سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ وہ طبعاً ایک شاعر، تربیتہً ایک عالم اور عادتہً ایک فلسفی ہیں، اس کے علاوہ اپنے فکر و جذبے سے مجبور ہو کر وہ مجاہد بھی بننا چاہتے ہیں اور کچھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں، کم از کم خیالات کی حد تک وہ برابر میدانِ عمل کے ارد گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان سب خصوصیتوں نے مل کر اختر اورینوی کو یونانی المیہ کی ایک شخصیت بنا دیا ہے، وہ راسن کا رازِ حیات ہیں، علم و عمل دونوں کی داد دینا چاہتے ہیں۔ نتیجۃً ان کا ذہن زندگی اور اس کے ساتھ ادب کو الگ الگ سربند خانوں میں تقسیم کرنے پر آمادہ نہیں، وہ اپنے تسلی بخش اظہار کے لئے پوری کائنات

کی وسعت مانگتا ہے ، اس کے تصور میں زندگی کا ہر جلوہ شعر ، فلسفہ ، ڈراما ، رزمیہ ، فسانہ وغیرہ کی متنوع اداؤں کو لے کر آتا ہے ۔ ایسا ذہن جب اپنے وفور و سرجوش کو کسی ایک ہیئت میں بند کرنا چاہتا ہے تو لامحالہ بعض دوسری ہیئتوں کے احساسات بھی اس میں در آتے ہیں۔ چنانچہ ادریندی کے نمایاں افسانوں میں ہمیں ڈراما ، رزمیہ ، شاعری اور فلسفہ کے تیور اور لہجے بھی محسوس ہوتے ہیں ۔ ادریندی کا ایک افسانہ پڑھ کر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ کوئی کہانی سن لی ہے اور خوش وقت ہو گئے ہیں ، بلکہ پڑھنے کے دوران ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ محض قصہ نہیں ، اس کے اندر بہت سے تقاضا یا ہیں ، اس میں ایک صدائے درد ہے ، ایک ندا ہے ، ایک نغمہ ہے ۔

"........ ہر طرف زندگی متحرک و جولاں تھی ، پتے پتے بوٹے بوٹے میں ، چڑیوں کے نغمے اور ان کی پروازمیں ، بہار کی لہریں اپنے کو آشکارا کر رہی تھیں ، مظاہر و آثار کی حیات افزا دنیا ، پرنور ، گرم ، رنگین ، بہار جوشاں تھی ، ہر سو اشجار کی ولولہ خیز نمو و نمائش سے نیلے آسماں میں نئے نئے بسنتی فانش بن رہے تھے ۔ نئی کونپلوں پر کرنیں ناچ ناچ کر انھیں بھی رقصاں اور بے تاب کر رہی تھیں ، درختوں کی چوٹیوں پر سبز شعلے سے لپکنے لگے تھے ، ہر طرف رنگین چراغاں سا تھا ، غیر مرئی چشمۂ حیات کی محسوس ، مرئی ، زرنگار شکلیں گذراں اور فانی ہونے کے باوجود اپنی سرجوشی میں ابدی اور اٹل تھیں ، دکھ ، درد اور موت سے ارفع سربلند اور ارجمند ہو کر دوسری شئے کے خلاف دعوائے مقابلہ و محاربہ کر رہی تھیں ...."

(ڈائنامیٹ)

"........ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا ، یہ کرہ ، سارے سامانِ حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح شن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلا تاریک و سرد خلا میں معلق ، ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ

گیا - موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپنے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں - آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بنا تھا، طوفان کے بعد پھر سے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا - اور اب ایک نئی آندھی آشیانۂ حیات کو نوچ نوچ کر برباد کر رہی تھی - میں نے کتنی ہی تمناؤں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا۔ اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں - کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہارِ تازہ کا پیغام لا رہی تھی، مستقبل پھر فریب تمنا دے رہا تھا کہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا، ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت! "

(کلیاں اور کانٹے)

"...... اس عورت کے حسن اور التفات کے تصور سے اس کے شہوانی جذبات دب جایا کرتے تھے - ایک بہشت منزہ سامنے آجاتی تھی اور سانپ رینگتا ہوا کہیں تاریک خلا میں جا چھپتا تھا! "

(راج محل میں)

"...... فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی محکم، ورثی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر و ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے، دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔"

(کلیاں اور کانٹے)

"...... انوکھے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے - فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو

ناپیداکنار سمندر بنا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔" (کچیاں دیکھیے)

افسانہ نگاری میں احساس و ادراک کی یہ تہیں اور اسلوب کے یہ پیچ و خم، اور رینوی کے فن اور اس پر تنقید دونوں کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ اور رینوی کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ احساس ہوا ہے جیسے میں کوئی المیہ یا رزمیہ پڑھ رہا ہوں۔ ان کے تخیل کی بارکیی اور اسلوب کی رنگینی بار بار مجھے افسانے کی سطح سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ سوال ہے کہ اس تخیل اور اسلوب کا آخر کیا مقام افسانہ نگاری میں متعین ہوتا ہے؟

سب سے پہلی بات تو مجھے یہی کہنی ہے کہ کوئی بھی جینیئس اپنے فن کی ٹکسالی ہیئت کے رسوم میں جکڑ کر نہیں رہتا۔ اس کی انفرادیت لامحالہ روایت کے سانچوں کو کچھ پھیلا دیتی ہے، ہر تازہ قطرہ جو سمندر میں گرتا ہے، فنا ہوتے ہوئے بھی سمندر کے دائرے، سطح اور روانی میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔ کسی عمل سے اگر اتنی جدت پیدا ہوئے کا مدہ نہ آسکے تو سمجھنا چاہئے کہ اس عمل میں کوئی امتیازی بات نہیں۔ دوسری بات یہ کہ حدود کی حد تک تو ہر ہیئتِ فن کا دائرہ متعین ہے اور اس میں کوئی تبدیلی معقول نہیں مگر دائرے کی حد میں ایجاد و اختراع کی پوری گنجائش ہے، ورنہ ندرت، تازگی اور ارتقا کی حرکتوں سے محروم ہو کر ہیئتِ فن جامد ہو جائے گی اور اس کے آئندہ امکانات ختم ہو جائیں گے۔ تیسری بات یہ کہ اسلوب کی قماش موضوع کے اعتبار سے ہی مرتب ہوتی ہے، جیسا نالہ ہو گا، نَے سے آواز ویسی ہی نکلے گی۔ فکر و فن کا ارتباط اب ادب کا ایک مسلّم اصول ہے، پھر تحریر کا وصف محض فصاحت نہیں، اس سے زیادہ بلاغت ہے، ادبیت صرف قواعد کی چیز نہیں، اس کا اصل جوہر نقوش ہیں۔

اختر اورینوی اردو افسانہ نگاری میں ایک جینیئس ہیں، اور پُرتخیل اور منفرد۔ یہ ممکن نہ تھا، نہ موزوں تھا، کہ وہ افسانہ نگاری کے عام گھریلو پن اور نرمی کی حدود میں سکڑ کر رہ جائیں۔ ابتدا میں دو تین مجموعوں تک وہ بالعموم ٹکسال کی کھینچی ہوئی لکیروں کے اندر اپنے آپ کو سمیٹے رہے۔ چنانچہ اس دور کا تقریباً ہر افسانہ ہیئت کے اوزاروں سے تراشا ہوا اور ہر پہلو سے سجل ہے، اسی مناسبت سے معنوں کے واقعات و احساسات بھی قیمتی

پر طاری ہیں۔ لیکن جب اوریںوی کا فن اپنی پوری بہار پر آتا ہے اور غنچہ کھل کر گلِ تر بن جاتا ہے تو عیاں ہوتا ہے کہ رنگ و نور کی ایک بالکل نئی اور انوکھی قماش ابھری ہے۔ اوریںوی آخر تک رہتے افسانہ نگار ہی ہیں، پورے داستان گو اور ماجرا ساز، مگر ساتھ ہی وہ نہایت ممتاز طور پر "اوریںوی" بھی ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کی قماش توڑی نہیں ہے، صرف اس میں چند ابعاد کا اضافہ کیا ہے۔ بالعموم افسانہ نگار "حکایتِ ہستی" کا آغاز جنت میں رینگ جانے والے سانپ اور پھر ہابیل و قابیل کی کش مکش سے کرتے ہیں، اور ختم اس لمحہ و کیفیت پر کر دیتے ہیں جس سے وہ اپنے وجود میں دوچار ہیں، حالانکہ انسان کی خودی کا حال یہ ہے کہ :

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے

نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے

یہ صحیح ہے کہ ہم نے اپنے وجود کی حکایت درمیان سے سُنی ہے، ہمیں نہ ابتدا یاد ہے نہ انتہا معلوم، لیکن انسانی و الٰہی علوم نے ہمیں ازل کی بھی خبر دے دی ہے اور ابد کا بھی نقشہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا اب ہماری داستان مکمل طور پر اسی وقت بیان کی جا سکتی ہے جب افسانہ خواں ہماری تخلیق اور عاقبت دونوں کا شعور رکھتا ہو۔ اُردو افسانہ نگاری میں اختر اوریںوی کا امتیاز سرگذشتِ آدم کی یہی مکمل قصہ خوانی ہے، وہ کوشش کرتے ہیں کہ فرد کی شخصیت اور سماج کی ہیئت کا کوئی پہلو مطالعہ میں نظر انداز نہ ہو جائے، ان کے سامنے زندگی کا ہر واقعہ اور انسانیت کا ہر نمائندہ اپنی پوری شکل میں آتا ہے، وہ حیات کے کسی رُخ کا بھی مطالعہ کرتے ہیں تو اس پر ہر جہت سے روشنی ڈال کر اس کی کلی اصلیت کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، ایک جلوۂ گزراں بھی ان کے سامنے ایک جہانِ معانی کے دروازے کھول دیتا ہے، صرف پندرہ منٹ میں وہ پورے عرصۂ وجود کو طے کر لیتے ہیں، قطرے میں دریا اور جزو میں کُل دیکھ لینے کا یہی وہ ملکہ ہے جو متعدد مراحل سے گزرتا ہوا "کیچلیاں اور بال جبریل" اور "سپنوں کے دیس میں" میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔

بہر حال، بحیثیت افسانہ نگار، اوریںوی واقعات و حالات سے زیادہ اہمیت اشخاص و کردار کو دیتے ہیں۔ وہ بالعموم اپنے مطالعے کے لئے کسی اشرف المخلوقات کو چُن لیتے ہیں، اس کے

بعد حسب موقع اس کے ارد گرد ایک ماحول پیدا کر گئے ہوں کے کوائف اور امکانات کا جائزہ لیتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اس انداز کار کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو وہی المیہ اور رزمیہ کی رفعت و شوکت جس کا اظہار شخصیتوں ہی کے پیچ و خم میں ممکن ہے، دوسرے غالباً کارگاہِ حیات میں کامیابی و ناکامی کے لئے انفرادی ذمہ داری کا دینی احساس؛ "کوئی بارکشِ حیات دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔" "ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔" "ہر نفس کو اپنے کئے کا اچھا اور برا مل جاتا ہے۔" "جو ایک ذرہ بھی نیکی کرے گا اس کو پالے گا، جو ایک ذرہ بھی بدی کرے گا اس کو پالے گا۔" اور رینوی کے شعور میں نیک و بد اور انفرادی عمل کے نتیجے میں جزا و سزا کا تصور پوری طرح جاگزیں ہے۔ اپنی شوخ گفتاری اور بعض اوقات فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود رینوی اپنے خدا اور اس کے نظامِ کائنات سے شدید ذہنی وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ وابستگی فنِ افسانہ نگاری میں کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ہر کردار اپنے حالات میں مبتلا رہنے کے باوجود اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں کی داد دیتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کہانی کے خاتمے پر اس کے مقدر کا اندازہ اس کے ذاتی عزائم یا کارگذاریوں سے ہی ہوتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

'پھلیاں اور بال جبریل' کا ہیرو 'بھی' 'میں' ہے اور 'سپنوں کے دیس میں' کا ہیرو 'بھی' 'میں' ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر کا 'میں' انسان ہے اور ثانی الذکر کا 'میں' برہما ہے، گرچہ برہما اپنے افعال کے لئے کسی کو جواب دہ نہیں، جب کہ انسان ہے، برہما کا اپنا کوئی حشر اور آخرت نہیں، جب کہ انسان کا ہے۔ بہر حال یہ بنیادی نقطہ انسان اور برہما کے درمیان مشترک ہے کہ وہ اپنی اپنی مستقل ذات و صفات اور شخصیت و کردار رکھتے ہیں، اور یہ کہ دونوں اپنے اپنے عمل میں لگے ہوئے ہیں۔ اس عمل کی سطح دونوں کے درمیان خواہ کتنی ہی مختلف ہو مگر ہر ایک کے عمل کے اپنے اپنے اثرات ہیں۔ اب خدا تو اثرات کا حساب لے گا اور آدم کو حساب دینا ہوگا۔ چنانچہ احتساب کی گراں باری ہر فرد کی زندگی کو نہایت گراں مایہ بنا دیتی ہے، ہر آدم اچھا

ایک عالم ہے، اپنا ایک نظامِ شمسی ہے، اس کے اپنے سیارہ و ثابت اور مہ و اختر ہیں، اپنی قضا اور سرحدیں ہیں۔ اور رینوی آدمی کے اس مقام سے باخبر ہیں۔ ٹائپسٹ، کوئلے والا، سیکھ جھور، شکور دادا، بوڑھی ماما، پاگل جونیئر، مریض، بینے ٹوریم کا فقیر، ایک معمولی سی لڑکی، پناہ گزیں ـــــ یہ تو چند عنوان ہیں خاص کرداروں ہی کے، ان کے علاوہ بہت سی سرخیاں ہیں حضرتِ دل کے افسانے کی، ممتا، کواڑ کی اوٹ سے، آئینہ، بہت بے آبرو ہو کر، پندرہ منٹ، راج محل میں، جینے کا سہارا، تسکینِ حسرت ـــــ یہ سب منفرد کرداروں کے آئینے ہیں۔

اختر اور رینوی کے ہم عصروں میں قدر اوّل کے تین دیو اور ہیں: کرشن چندر، منٹو، بیدی۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر منٹو سے اور رینوی کی کوئی مماثلت نہیں۔ نہ فن میں نہ فکر میں۔ دونوں قطبین پر واقع ہیں۔ بیدی سے خالص فنی سطح پر دور اوّل کے اور رینوی کا تقابل کیا جا سکتا ہے، جب کہ دونوں اپنی اپنی ہیئت فن کی تراش خراش چینی کے برتن کی طرح کرتے ہیں بلکہ، زیادہ موزوں الفاظ میں، بلور سازی کرتے ہیں۔ لیکن یہ مشابہت تکنیک سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور رینوی اور بیدی کے موضوع و ماحول میں نمایاں فرق ہے، اس سے بھی زیادہ فاصلہ دونوں کے احساسات میں ہے۔ دونوں کے ذہن یکسر مختلف ہیں، بیدی گھریلو اور بالعموم پنجاب کے گھریلو معاملات کے بھیدی ہیں، وہ اس حلقۂ زندگی کے ماہر ہیں، اور اس مہارت پہ قانع ہیں، چنانچہ اپنے خاص الخاص معاشرتی دائرے سے باہر قدم کم ہی نکالتے ہیں، وہ اپنے مضبوط قلعے میں محفوظ و مامون رہنا پسند کرتے ہیں، بیرونی میدان کے طوفانوں کی زد پر آنا گوارا نہیں کرتے ہیں، یہ ایک لحاظ سے بیدی کی بڑی خوبی ہے، اور دوسرے لحاظ سے یہی خامی ہے۔ بیدی کا فن بہت بالیدہ ہے، مگر فکر نہایت محدود ہے، تجربہ قلیل، مطالعہ مختصر اور نگاہ پست ہے۔

اپنی صنف کے ہم عصروں میں اختر اور رینوی کا پورا تقابل صرف کرشن چندر سے ممکن ہے۔ دونوں کے تجربات وسیع اور متنوع ہیں، دونوں تفکر کے عادی ہیں، دونوں کے طرز میں شعریت پائی جاتی ہے، اور دونوں ورائے افسانہ چیزے دگر کے طالب ہیں۔ یہ تو اتفاق

کے نقطے ہوئے، مگر اختلاف کے نقطے بھی کم نہیں۔ کرشن چندر کپڑے اتار کر زندگی کی تہوں میں غوطے لگا چکے ہیں، جب کہ اوریںوی نے سمندر کی گہرائیوں کو آبدوز میں بیٹھ کر ناپا ہے۔ کرشن چندر تمام تفکر کے باوصف فلسفے یا مذہب کی بلندیوں تک پرواز نہیں کر پاتے، اور اوریںوی کا تفکر ہی کسی نظریے یا فلسفے سے وابستہ ہے۔ شاید اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ کرشن چندر معاشیات، نفسیات اور بہت ہوا تو سیاسیات سے زیادہ گہرائی میں جانے کی اہلیت نہیں رکھتے، انھیں سماجی زندگی کے صرف مسئلوں کا شعور حاصل ہے، جب کہ، اوریںوی مابعد الطبیعات، عمرانیات، سائنس، اخلاقیات اور الاہیات تک کو کھنگالے ہوئے ہیں۔ انھیں انسانیت کی بنیادی قدروں کا عرفان بھی حاصل ہے۔ کرشن چندر کے راست مشاہدات گرچہ اوریںوی سے زیادہ ہیں مگر ان کے علمی مطالعات اوریںوی سے بہت کم ہیں، لہٰذا کرشن چندر کو حیاتِ انسانی کے ایک منظم کل ہونے کا وہ شعور میسر نہیں جو اوریںوی کو حاصل ہے۔ اوریںوی زندگی کے کائناتی نظام سے، کرشن چندر کے مقابلے میں، زیادہ واقف ہیں۔

کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو افسانہ نگاری کی صفِ اوّل کے عناصر اربعہ کی ترتیب یوں ہونی چاہیے: کرشن چندر، منٹو، اوریںوی، بیدی۔

اس انتخاب میں اختر اوریںوی کے افسانوں کے چھ مجموعوں میں سے ہر ایک سے ترتیب وار تخلیقات لی گئی ہیں۔ صرف ایک اور آخری افسانہ "ایک درخت کا قتل" کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے، لیکن مطبوعہ ہے اور ماہ نامہ "آج کل" دلّی کی اشاعت مئی ۱۹۷۱ء سے لیا گیا ہے۔ اوریںوی کا پہلا افسانہ "بدگمانی" ہے جو ان کے دوسرے مجموعہ "کلیاں اور کانٹے" میں شامل ہے۔

۲۵ جولائی ۱۹۷۶ء کو اختر اوریںوی سے میں نے ایک انٹرویو لیا۔ وہ پچھلے کئی سال سے بیمار ہیں اور جسمانی طور پر بہت معذور ہو گئے ہیں، لیکن ان کا دماغ ہنوز بیدار اور توانا ہے۔ محترمہ شکیلہ اختر کے سہارے وہ اپنے قدموں سے چل کر ملاقات کے کمرے میں تشریف لائے اور میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ قریب آدھ گھنٹے تک میں ان سے مسلسل سوالات کرتا رہا

اور انھوں نے ہر سوال کا واضح، مفصل اور مرتب جواب دیا۔ گرچہ فالج کے حملے کا ان کی زبان پر کافی اثر ہے اور ان کی عمر چھیاسٹھ سال کی ہو چکی ہے، مگر دورانِ گفت و گو ان کی مشہور خطابت کبھی کبھی جھلک پڑتی تھی۔ ذیل کے بیانات میری اختر صاحب کے ساتھ اسی گفت و گو پر مبنی ہیں۔

اپنے افسانوں میں اختر صاحب کو سب سے زیادہ پسند علی الترتیب "کلیاں اور کانٹے"، "کچلیاں اور بال جبریل" اور "محشر" ہیں۔ ان کے بہ قول ان کی افسانہ نگاری کے تین ادوار ہیں، پہلے دور میں انھوں نے نیاز فتح پوری کا تتبع کیا، دوسرے میں ترقی پسند رجحان کی عکاسی کی، تیسرے میں فلسفیانہ میلانات کا اظہار کیا، اور یہی آخری دور ان کے نزدیک سب سے اہم ہے۔

فنِ افسانہ نگاری کے متعلق اختر صاحب کا خیال ہے کہ ایک مقررہ تکنیک کا التزام ضروری ہے، افسانے میں لازماً اختصار، وحدتِ فضا اور اختتام ہونا چاہیئے۔ افسانے کا موضوع تو یقیناً غیر محدود ہے اور ساری زندگی پر مشتمل ہے، لیکن ہر موضوع اور ہر رنگ میں کہانی کو پُر اثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ تکنیک کا لحاظ کیا جائے۔ فکری و فنی تجربات یقیناً کئے جاسکتے ہیں، مگر عمومی تکنیک کی حدود میں ہونے چاہئیں۔

اختر صاحب سمجھتے ہیں کہ اپنے افسانوں میں انھوں نے انسانی زندگی کے تمام ہی اہم موضوعات کو برت لیا ہے۔ سائنس اور ایٹم بم کے موضوع پر بھی انھوں نے کہانی لکھی ہے، گرچہ ممکن ہے کہ ایسی کوئی کہانی کسی مجموعے میں اب تک نہیں آئی ہو۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہونے والے ان کے افسانوں کی تعداد، جہاں تک انھیں یاد ہے، چار ہے: "تاوانِ جنگ"، "سفید و سیاہ اور سرخ"، "ایٹم بم"، "ایک درخت کا قتل"۔

افسانہ نگاری کے جدید رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے اختر اورینوی نے واضح کیا کہ یہ مرکب ہے اشاریت (Symbolism) اور سریت (Mystification) سے، اور یہ رجحان فنی طور پر اُردو میں کامیاب نہیں ہے، چناں چہ اس کے تحت بروئے عمل آنے والی تخلیقات افسانہ نگاری کی اس سطح سے بہت نیچے ہیں جو ترقی پسند رجحان کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں اپنی افسانہ نگاری کے متعلق اختر صاحب نے یہ وضاحت

کی کہ ان کے بعض افسانوں میں اشاریت (سمبلزم) ضرور پائی جاتی ہے، مگر وہ سرّیت (مسٹی فکیشن) سے مبرا ہیں۔ اختر صاحب کا خیال ہے کہ اردو افسانہ نگاری کے موجودہ رجحان کے امکانات ضرور ہیں، اس لئے کہ اس میں ایک تازگی اور جدت بہرحال ہے۔ لیکن ان امکانات کے بروئے عمل آنے کے لئے شرط یہ ہے کہ لکھنے والے برخود غلط نہ ہوں اور کھلے ذہن سے ماضی کی روایات سے استفادہ کریں۔

اپنے افسانوں کے انتخاب کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے اختر اورینوی نے خیال ظاہر کیا کہ اس سے ایک تو ہر رنگ کی تخلیقات کی یکجا نمائندگی ہو جائے گی، دوسرے ان کی اہم ترین تخلیقات کا ایک مجموعہ مرتب ہو جائے گا۔

عبدالمغنی
وارثی گنج، عالم گنج، پٹنہ ۷
۳ راگست ۱۹۷۶ء

سیمنٹ

"...... وہ لیٹی لیٹی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔ لڑکپن سے وہ بہت اور بہت کچھ سوچنے کی عادی تھی۔ وہ خیال ہی خیال میں سفر کیا کرتی تھی، ہوا کے گھوڑے دوڑاتی، ہوائی قلعے بناتی اور کبھی سات سمندر پار کی شہزادی بنتی، مگر وہ صرف سوچتے رہنے والی لڑکی نہ تھی۔ بلکہ ساتھ ہی نہایت چونچال اور مجلس آرا تھی، ہنس مکھ کی ہنس مکھ، اور لڑاکن کی لڑاکن، تیز مزاج حوصلہ مند اور ہر بات میں آگے۔ دنیا بھر کا شوق اس کو تھا، مرغیاں، کبوتر، خرگوش وغیرہ پالنا، پتنگ اڑانا، طرح طرح کے کھیل سیکھنا اور کھیلنا۔ مدرسے میں کسی سے پیچھے نہیں، باورچی خانہ میں سب سے آگے۔ سلائی پرائی میں بھی تیز، ابھی دس ہی کی تھی کہ گاؤں بھر میں سگھڑ کہلانے لگی تھی۔ اور اس کو ان سب باتوں کا بڑا احساس اور پندار تھا۔ وہ کاموں اور کھیلوں میں آگوا بننے کی خاص صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ مجمع میں لیڈر بن جاتی تھی اور اپنی من مانی کرنے میں اسے بڑی لذت ملتی تھی۔ بھائی بہنوں سے الجھ پڑنے کے علاوہ ماں سے بھی لمبی دراز کر گذرتی تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی ڈکٹیٹر تھی۔

گھروندے تو وہ کھیلا ہی کرتی تھی، گڑیا اور گڈے کا بیاہ رچانے سے بھی اُسے خاصی دلچسپی تھی، گیت گانا اور جھولے جھولنا اس کے دو محبوب مشغلے تھے، گڑیا اور گڈے کا بیاہ رچاتے رچاتے وہ تصورات کی دنیا میں پہونچ کر اپنی بھی کئی خیالی شادیاں کر ڈالتی تھی۔ وہ دلہن بنتی، دولہا آتا، اور پھر بہت سی باتیں سوچ لی جاتیں، اسی طرح وہ بہت دیر دیر تک سوچتے سوچتے ہلکان ہو جاتی، تب وہ گڑیا کو اوڑھنی اوڑھاتا، یا چائے کے پکیٹ والے

جستہ کا زیور پہنا چھوڑ کر کبھی جھولا جھولنے لگتی، گاہ کسی سے جا کر ناحق لڑنے لگ جاتی، اور لڑتے لڑتے رونے لگتی۔

......عجیب......ایک دفعہ......جھولے......رسی......تھی......

......لڑتے لڑتے......رسی پکڑ کر......چڑھنے......اس تجربہ کی سنسنی خیز لذت......"

ایک ہفتہ وار مصور رسالے کا ایک ورق راشدہ کے ہاتھ میں تھا اس نے ابھی ابھی سونف اور الائچی بازار سے منگوائی تھی۔ دو ماہ سے اس کا سر چکرا رہتا تھا اور گذشتہ ایک ہفتہ سے تو وہ مارے متلی کے پریشان تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے الائچی کھنگی اور سونف کے ساتھ ملا کر کھا گئی۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو ہاتھ پھیلا کر اس نے چوکی کے گوشے سے پاندان کھینچا۔ چاندنی میں سلوٹیں پڑ گئیں تو جیسی پر جبیں ہوتے ہوئے اس نے کروٹ لی، اور بائیں ہاتھ پر ٹھوڑی کو ٹیک کر دائیں ہاتھ سے شکنوں کو برابر کرنے لگی۔ چاندنی سمجل نہ ہوئی تو اس نے چڑ کر اسے ویسے ہی چھوڑ دیا اور دھب سے تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پھر لیٹے لیٹے اس نے پاندان کے ایک خانہ میں سونف اور الائچی کو انڈیل دیا اور پٹ بند کر کے یونہی پڑیا کے کاغذ سے شغل کرنے لگی، اس کی نظر مندرجہ بالا عبارت پر پڑی تو وہ پڑھتی چلی گئی آگے ورق پھٹا ہوا تھا اور وہ بھی یوں کہ ہر کتر دیا گیا ہو۔ راشدہ کا جی چاہنے لگا کہ قصہ کو مکمل پڑھے، دوسرے صفحہ پر کوئی نظم تھی، اس نے کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا مگر قصہ کا اور چھور کچھ نہیں ملا۔ اس کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی، مگر یہ لا علاج بات تھی۔ راشدہ کی خواہشات میں ادھر بڑی تیزی پیدا ہو گئی تھی، کبھی کچھ کھانے کو جی چاہتا تو اس شدت سے کہ وہ بے بس ہو جاتی، مثلاً امرود، بیر یا کوئی مٹھائی، یا مٹی کپڑے کے ٹکڑے، یا چولھے کی راکھ، یا سوندھی مٹی۔ پر جب دل آتا تو ایسا لگتا کہ لپکا لگ گیا ہو۔ اندر سے ہوک اٹھتی اور ایسی بے قراری طاری ہو جاتی جیسے وہ چیز حاصل زندگی ہے۔ کچھ کرنے پر طبیعت مائل ہوئی تو طوفان کی طرح بس ابھی ابھی ایک انھونی بات کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ راشدہ نے کئی بار اسی ایک عبارت کو پڑھ ڈالا، اور ہر بار وہ اس انتظار میں مبتلا رہی کہ وہ پڑھتی ہی چلی جائے گی، اور قصہ کا انجام اسے معلوم ہو جائے گا۔ بے حاصل، کہانی ادھوری ہی رہی۔ ورق کا پھٹا ہوا حصہ جڑ نہ سکا اسے زور سے

ابکائی آئی، وہ اُٹھ بیٹھی، اور اگلدان پر سر جھکا کر قے کرنے لگی۔ اس نے گھر کے چھوکرے کو پانی کے لئے آواز دی، اور رونا شروع کر دیا۔

اسے اپنے میاں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ آخر میری شادی ان سے کاہے ہوئی؟ یہ سوال اس کے دل میں اٹھتا رہا، اور کبھی کبھی خیالات ہچکولے لیتے رہے۔

"میں تو گھر سے آنا ہی نہیں چاہتی تھی، شادی کے بعد تین سال کیسے گذر گئے۔ میری شامت آئی کہ ان کی منت سماجت سے میرا دل پسیج گیا۔ اور اس پرائے دیس میں آ کر اپنی زندگی عذاب میں ڈال لی۔ بس یہ چھوکرا اور بھائیں بھائیں کرتا ہوا مکان، دس بجے دن سے بھری شام تک، وہ غائب ہی رہتے ہیں...... اور جو وہ ہوتے بھی تو کیا بن جاتا۔"

"لیجیے حضور پانی لیجئے!" چھوکرے نے گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ راشدہ نے بڑی نقاہت کے ساتھ گلاس لیا اور اُگال دان میں کلیاں کرنے لگی۔

"جلدی سے پان لگا دو بدّو!"

اس نے اپنا چہرہ بھی دھویا۔ اور ہلکان ہلکان ہو گئی۔ ذرا دم لینے کے لئے بیٹھی۔ پان لگ گیا تو گلوری منہ میں ڈال کر پھر تکیہ پہ گر پڑی۔

"بدّو! سہ پہر ہو رہی ہے۔ آگ جلد جوڑ لے شام کو تیرے بابو کے ساتھ کچھ مہمان بھی آئیں گے۔ کئی چیزیں پکیں گی۔ ناشتہ اچھا ہونا چاہئے۔ تاؤ آجائے تو مجھے بلا لینا۔"

راشدہ کی اس علاقہ میں بڑی قدر ہوتی تھی۔ ہاشم کے دوستوں اور عزیزوں میں وہ بہت سگھڑ، سلیقہ شعار اور نفیس مزاج مشہور تھی۔ کھانے پینے کا ڈھنگ، رہنے سہنے کا انداز، کپڑے لتے کا رکھ رکھاؤ، سب باتیں راشدہ کی عام سطح سے بہت بلند تھیں۔ اور وہ اس نام پر بٹہ لگنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ شوہر کے خیال سے نہیں، بلکہ صرف اپنی نمود کے لئے۔ وہ اچھے کھانے پکاتی، گھر کی آرائش کرتی، اور رشتہ دار لڑکیوں کے بلاؤز اور جمپر تراشتی رہتی، یہی نمود و نمائش تو اس کا سہارا تھی۔ ورنہ شوہر سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"بھابی جان کتنی کتنی لذیذ اور نفیس چیزیں پکاتی ہیں۔" "ممانی امی بلاؤز ایسے تراشتی ہیں کہ کمپنی والے بھی کانوں پہ ہاتھ دھریں۔" "دولہن سنتھا گھر کو بھی دولہن بنائے رکھتی ہیں۔"

براہ راست قبیل کے اور نعرہ بھی لکھے راشدہ کو اس دیار میں اب کے بار کھینچ لائے تھے۔ شادی کے تین سال تک وہ اپنے میکے سے ٹس سے مس نہ ہوئی پر اس گذرتے سال میں وہ اپنے میاں کی نوکری پر دو دفعہ آئی۔ یہاں اس کے کچھ سسرالی عزیز و اقارب بھی رہتے تھے۔ اور ہاشم کے دوست احباب بھی تھے۔ بدکو چولھا سلگانے کے جتن کرنے لگا۔ اور راشدہ پھر رسالے کے پھٹے ہوئے ورق کو پڑھنے لگی۔ پر اب کے دفعہ وہ اسے پڑھ کر ہنس دی۔ اور پھر حیرت زدہ ہو کر اسے غور سے پڑھنے لگی۔ کیا حقیقت اور افسانے میں اتنا لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ تو ہو بہو اس کے بچپن کی تصویر تھی۔ سوائے اگوا بننے اور لیڈری والی بات کے۔ یہ وہ "سچ مچ راشدہ ہی تھی۔ یہ کسی نے مذاق تو نہیں کیا۔ راشدہ کو اپنی باتیں پڑھ کر بڑا اچھا لگ رہا تھا جیسے آئینہ دیکھ کر بانو ٹو کھنچا کر اچھا لگتا ہے۔ پھر ایک خیال آکر گذر گیا۔ ہاں ہاں اس کے اندر لیڈری اور سرداری کی صلاحیت بھی تو ہے ہی۔ وہ تصویر کی نوک پلک تک کو اپنی مثال سمجھنے پر مصر تھی۔ ایک اور خیال آیا۔ اور دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ ہلکی سی مسکان کی لہر اٹھی مگر دبا لی گئی۔

"کتنا عجیب ہے۔ میں نے بھی تو اپنی کئی خیالی شادیاں کی تھیں۔ روز ہی کرتی رہتی تھی۔ اس کا سارا بدن سنسنا گیا۔"

"اور وہ جو رحیلہ آپا کا دلہا بھائی کے نام خط پڑھ کر میں نے بھی ایک خط لکھ ڈالا تھا۔ خوب! آٹھ دس سال کی عمر اور خط لکھا ـــ

"میرے پیارے سرتاج! میں تمہارے دیدار کے لئے بیتاب ہوں...... سرتاج! ہونہار رحیلہ آپا بھی بالکل کھوسٹ ہی تھیں۔ کیا القاب ہیں! اور پھر دیدار کا لفظ! ارے آپا تو آج تک محترم کی رسیا ہیں۔ زیور سے لدی پھندی، ہر وقت بنی سنوری ہوئی، گلے میں پانچ بھر سونے کے گلوبند کا طوق۔ جب دیکھو لہالوٹ رنگ برنگی ساری۔ مگر میاں جدھر چاہیں بچالیں۔ چھی! ـــ نقل کی بھی تو میں نے ان کی! اور رجو اماں نے پکڑ لیا تھا خط، تو قیامت آگئی تھی۔ بس سمجھیں کہ دال میں کالا ہے۔ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ پوچھا۔ "ماری کمبخت! بے حیا تو نے یہ کیسے ناک کٹائی! غضب ہو گیا! خاندان بھر کا سر مونڈ

دیا تو نے۔" میں نے سہم کر کہا تھا ۔ "کچھ بھی نہیں ۔ رجیلہ آپا کا خط دیکھ دیکھ کر میں اتار رہی تھی ۔ میں کیا جانوں سرتاج ورتاج کیا ہوتا ہے۔" کلثوم دراز تھی نا ۔ راشدہ اکیلے میں زور سے ہنس دی ۔ اُسے یاد آگیا کہ رجیلہ آپا نے کیسا کیسا فیل مچایا ۔ کتنا چراغ پا ہوئی تھیں وہ گالیاں اور کوسنوں کی تو کچھ نہیں ۔

پر اسی واقعہ کے بعد سے اماں جان کو میری شادی کی فکر لاحق ہو گئی ۔ پرانے لوگ بھی خاصے ہوتے ہیں ، چار پانچ سال تو جیسے پہاڑ ہو گئے ، اور نے پونے مجھے ان کے سر پھینک دیا ...." ابے بدلو! سر کوٹ دے گا بے ! انگنائی میں جا کر کوئلے کیوں نہیں توڑتا ۔ باورچی خانے میں فرش پر کیسی ٹھائیں ٹھائیں لگا رکھی ہے ۔ کمبخت فرش بھی نہیں پھٹ جاتا ! تیرے سر پر چھت کیوں نہیں گر پڑتی ! کمبخت ، مردود ، حرامزادہ "...... راشدہ کا مزاج اچانک برہم ہو اٹھا تھا ۔ کوئلے پہ ٹھائیں ٹھائیں تو دور ہو گئی مگر راشدہ کے دل و دماغ پہ ٹھائے ٹھائے برابر جاری رہی ، اندرونی ٹھائے ٹھائے ، ضربیں لگتی ہی رہیں ۔

" آخر اماں نے میری شادی ان سے کیوں کر دی ؟" ۔ یہی سوال سوہانِ روح تھا ۔ اس کا لڑکپن اور آغازِ شباب سامنے آگئے ۔ عالمِ نشوونما میں اس نے بہت کچھ سیکھا ، اور بہت کچھ سوچا ۔

راشدہ واقعی بہت لطیف الخیال اور نفیس مزاج لڑکی تھی ۔ نازک ، حساس اور خوابناک ، اس کا عنفوانِ شباب تصورات کی دنیا میں گذر رہا تھا ۔ ایک عالمِ مثال و رومان میں ہر وقت وہ بسی رہتی تھی ۔ گل طرازی ، کشیدہ کاری ، چمن بندی اور ادب نوازی ، یہ اس کے محبوب مشغلے تھے ۔ اس کا ذوقِ آرائش و تجمل بہت بالیدہ تھا ۔ وہ زود رنج اور بہت جلد رو دینے والی تھی ۔ اس کی صبیح گلابی رنگت ہر وقت چونکی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ اس کی ہرن جیسی لانبی سُرمگیں آنکھیں اور گھنیری پلکیں جذبات سے دبی ہی رہتی تھیں ۔ وہ اپنے ذوقِ جمال میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کو اپنی ناک کے چھوٹی ہونے اور ستواں نہ ہونے کی کڑھن تھی ۔ اُس کا قد بوٹا سا تھا ۔ مگر جب اُسے یہ شبہہ سا ہوتا کہ کوئی اسے پست قد سمجھ سکتا ہے تو وہ پہروں کمرہ بند کر کے روتی رہتی ۔ اگر اس کے سنگار دان کی پالش پھیکی

پڑ جاتی، یا کوئی اس کی کتابوں کی الماری کو ذرا بے ترتیب کر دیتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی الم انگیز حادثہ ہو گیا ہو۔ اُس پر اس طرح جوانی آئی جیسے بیلے کے پودے، یا چمپا کے پیڑ پر شباب آتا ہے۔ وہ چنار کی طرح لہک پڑی۔ اور اُس کا شوقِ ادب رشمر جوہی کے پھولوں کی مانند کھل کر مہک اُٹھا۔ اس کی تمنائیں کونلوں کی مانند کو کنے لگیں۔ اس نے اپنے من کی دنیا میں اپنی زندگی کا ایک رنگین نقشہ بنایا۔ اُس پر ایک عمارت کھڑی کی اور اسے سجایا۔

مگر اس کے والدین کی سات لڑکیاں تھیں اور برادری میں لڑکے کم۔ اور ان سے بھی کم تر نوکریاں۔ اُس پر طرہ یہ "میرے سرتاج" والی خلش جو اُس کی ماں کی نظروں میں اسے بری طرح جوان ثابت کرتی رہی۔ راشدہ نے کتنے ذوق شوق سے اپنے تخیل اور جذبات کی ہم آہنگی کے ساتھ، اپنے مثالی رفیقِ حیات کا ایک پیکرِ جمیل بنایا تھا۔ مگر دنیا، دُنیا ہے۔ یہاں کس کا معیار قائم رہا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ راشدہ کا معیار بری طرح کچلا گیا۔ وہ باسی ہار کی طرح کمھلا کر رہ گئی۔ ہاشم اچھا خاصا بھلا مانس تھا۔ وہ کسی بھی سادہ مزاج لڑکی کے لئے نہایت لائق شوہر تھا، مگر وہ راشدہ کو پسند نہ آیا۔ وہ اس کے پیکرِ خیال کی طرح نہیں تھا۔ معمولی صورت شکل، ذوقِ جمیل اور شوقِ ادب سے دور۔ اور جو چیز دل کو نہ بھائے، اس کی ہر ادا بُری ہی لگتی ہے۔ راشدہ کو شکایت تھی کہ وہ ہر وقت پان چباتا رہتا ہے۔ اور عجیب بد وضع طور پر سکڑ سکڑا کر لیٹتا ہے۔

ابھی راشدہ لیٹی لیٹی اپنی ساری زندگی پر تبصرہ کر رہی تھی۔ اُس کی زندگی میں ایک زلزلہ آیا تھا، جس کے جھٹکوں سے اس کے خیالوں کا رنگ محل دھم سے زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ بے در و دیوار سا ایک گھر بننے لگا تھا۔ بے جوڑ، اَن گڑھ۔ اس کی زیست معلق سی تھی۔ بے بنیاد، کوئی وسیلہ ایسا نہیں تھا جو حیات کے دونوں حصوں میں ربط، تسلسل اور موزونیت پیدا کر دے، جیسے اس کی زندگی کے ورق کو کسی نے بیدردی سے پھاڑ دیا ہو۔ راشدہ کے ہاتھ میں رسالے کا پھٹا ہوا نامکمل ورق تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رسالے کے افسانے والی لڑکی کی فطرت اور خود اس کی فطرت میں کتنی یگانگت تھی۔ پتہ نہیں اس افسانوی لڑکی کی قسمت کیسی تھی؟ اُسے بڑی کرید تھی کہ انجام معلوم ہو جاتا مگر رسالے کا ورق پھٹا ہی ہوا تھا۔ اسے کوئی تدبیر بھی گمشدہ حصے سے جوڑ نہیں سکتی تھی۔ راشدہ

ایک گہری ٹھنڈی سانس کھینچ کر رہ گئی۔

پتھر کوئلہ ابھی سلگا نہیں تھا۔ گھٹا گھٹا دھواں چولہے سے نکل کر راشدہ کے کمرے میں داخل ہوا غلیظ کاربن کی بدبو پھیلی اور سیدھی اس کی ناک میں گھستی چلی گئی۔ راشدہ کے پیٹ کے اندر ہچکولے اُٹھے۔ بڑی شدت کی متلی اُٹھی، اوپر تلے اُبکائی آنے لگی، سر چکرا رہا تھا، اور سارا بدن سن سن کر رہا تھا۔ وہ گرتی پڑتی ہوئی صحن کی طرف اٹھ کر بھاگی، اور بیچ صحن میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جب طبیعت ذرا سنبھلی تو اُسے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ آخر ایسا ہونے ہی کیوں دیا اُس نے۔ وہ آپ اپنی نگاہوں میں ذلیل لگ رہی تھی، اُس کا جی چاہا کہ خودکشی کر لے۔ موت بڑی سنجیدگی اور سکون سے اس کے خیالات سے لپٹ گئی۔ سر اب تک جیسے جھولے پر سوار ہو۔ پھر اُبکائی آئی اس کے جسم و جان لرز اُٹھے۔ "یا اللہ، پانی ...... یہاں کوئی بھی اپنا نہیں، کتنا بڑا ظلم ہے، مجھے یہاں لانا۔"

راشدہ کو اپنے اوپر رحم آ رہا تھا۔ ہاشم کے خلاف ایک تیز نفرت کی رو اٹھی۔ ایک بیمارانہ نفور کی رو جس کے نتیجے میں اُلٹا مقابل پر ٹوٹ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہاشم سے گتھم گتھا ہو کر اُس کی تکا بوٹی کر دے۔ اس سے بھاگنے کی بجائے اس سے اُلجھ کر اُس کو فنا کر دے، اُس نے سوچا۔

"کاش! یہ ہماری بیماری ہی ہو۔ پر یہ متلی؟ ایسا نہ ہوتا تو شاید مجھے طلاق مل جاتی! جان چھوٹتی میری۔ اُن کے سب رشتہ دار تو زور دے ہی رہے تھے۔ کیا کیا ارمان ہیں! خاندان چلنے کا ارمان! چولہے میں جائے خاندان، بڑی اچھی صورت ہی تو ہے۔ مٹ جائے ایسا خاندان تو اچھا! ...... پیسے بھی تو نہیں، کنبہ کی پرورش کیسے ہوگی۔ دو آدمیوں کا خرچ تو نہیں چلتا۔" سوچتے سوچتے وہ رونے لگی۔ بدتوا بدحواس اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ آخر مالکن کو ہو کیا گیا ہے۔

جب دل کچھ ہلکا ہوا تو راشدہ اُٹھی۔ اور پھر کمرے میں آکر یوں ہی بلا تکیہ کے تخت پہ پڑ رہی۔ نہ اُس نے پان کھایا، اور نہ الائچی ہی کھائی۔ وہ بیزار اور کڑھی کڑھی تھی، بارہ سال کا چھوکرا بدتوا مالکن سے بڑی ہمدردی رکھتا تھا، مگر ڈرتا بھی بے حد تھا۔ کوئلے میں اب تاؤ

آگیا تھا، پر وہ اب مالکن کو اُٹھائے کیسے اور وہ بھی اُس حال میں۔ اُس نے ایک ترکیب سوچی، چلو اُلٹا ہی سہی۔ اس نے پہلے انڈے تلنے کا ڈول ڈالا۔ کڑھائی چڑھایا، کڑوا تیل جوش دینے لگا۔ تیل کے کر، کر، کھولنے کی آواز آئی اور پھر چھن، چُن انڈے کے تلے جانے کی۔ راشدہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور سیدھی باورچی خانہ کو دوڑی۔ غضب ہو گیا۔ غربت کی فضا میں پلے ہوئے نوکر بھی آخر کیسے ہوں؟ مہمان آ رہے ہیں اور آج بھی انڈے تیل میں تلے جا رہے ہیں۔

"اے کمبخت! تجھے کس نے انڈے تلنے کو کہا؟ گھی میں تلے جائیں گے، گھی ہیں!"

بگڑ کر آخر کش راشدہ نے خود ناشتہ پکانے کا اہتمام شروع کیا اور تیل کا تلا ہوا انڈہ رات کو کھانے میں ہاشم کو دینے کے لئے علیحدہ رکھ دیا۔

راشدہ کو اپنا میکہ یاد آیا، وہاں ساری چیزیں کتنی افراط سے ہوتی تھیں۔ جب مہمان آیا کرتے تھے تو طرح طرح کی چیزوں کی کتنی ریل پیل ہوتی تھی، اور ایک یہاں ہے گنی بوٹی ناپا شوربا۔ اُسے اپنی اماں جان یاد آنے لگیں اور سب بھائی بہن۔ اس کے ہاتھ ناشتہ کے سامان میں مشغول تھے مگر دل میکے میں تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ پر لگا کر اپنے ماں باپ کے گھر پہنچ جائے، پھر معلوم نہیں ایسے حال میں وہ کہیں مر ہی نہ جائے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ آنسوؤں نے ماحول پر پردہ ڈال دیا۔ عالم تصور میں وہ اپنی ماں کے سامنے دوبدو کھڑی تھی۔

"راشدہ! آج نہر کے افسر آ رہے ہیں۔ ناشتہ پکانا ہے۔ دیکھو ہم سے پوچھ پوچھ کر پکانا۔ اپنی آپا سے سب چیزیں دکھلا کر۔ تم ابھی نوسکھ ہو۔ دیکھو ہاتھ روک کے۔ تم تو پھوڑ دلال ہو، لڑکیوں کو کفایت شعار ہونا چاہئے۔ کس کی قسمت کیسی ہوتی ہے کون جانے!"

راشدہ کے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا، اماں جان اب تک مجھے بچہ ہی کیوں سمجھتی ہیں؟ آپا لاکھ خرچہ کر دیں تو کچھ نہیں، اور میں چیزوں پہ ٹھہر بھی دوں تو پھوہڑ۔ میرے جتنا کون گھر سر پاتا ہے؟"

اُسے یاد آیا کہ وہ کئی بار اپنی ماں سے لڑ پڑی تھی۔ آخر اس کی اپنی انفرادیت بھی تو ہے؟ ...... اور میں یہاں کیوں آتی! یہ سو بار سر پٹکتے، میں جیسے اپنی جگہ سے برسوں نہ ہلی،

اب بھی نہ ملتی۔ یہ تو اماں جان کے غصہ پر میں یہاں پر چلی آئی۔

راشدہ کو اپنی مظلومیت کے احساس سے سخت دکھ ہوا۔ اس کی اماں جان بھی اُسے نہیں چاہتیں۔ وہ نہایت ہی بدنصیب ہے۔ پھر اُسے سکون کا کچھ احساس ہوا۔ "چلو یہاں میں آزاد ہوں۔ یہیں نا اکیلے میں یہاں مر جاؤں گی۔ کسی کو احساس تو نہ ہو گا۔ سب کو خوشی ہی ہو گی کہ راشدہ سے جان چھوٹی۔ تم بہت نازک مزاج ہو! تم بہت نازک مزاج ہو، سنتے سنتے کان پک گئے۔

اسے موت سے محبت سی محسوس ہونے لگی۔ دردِ زندگی کا علاج   ۔ وہ بہت دیر تک فنا کے خیالات سے ہم آغوش رہی۔ جیسے وہ ایک ماں کی گود سے بچھڑ کر دوسری ماں کی گود میں پناہ لے رہی ہو۔

"اچھا! ناشتہ کا بڑا اہتمام ہے!"

ہاشم آج سویرے ہی دفتر سے آ گیا۔

راشدہ خاموش ہی رہی۔ پھر اُسے کچھ یاد آیا تو بولی:

"آپ جا کر بازار سے مٹھائیاں تو لے آیئے اور سگریٹ بھی۔ بدّو تو میری مدد کر رہا ہے۔ آج بھی آپ نے اتنی دیر لگا دی۔" ہاشم ملزم ملزم سا معلوم ہو رہا تھا۔ بڑی سعادت مندی سے اُس نے پھر سائیکل پکڑی اور بازار چلا گیا۔ بازار سے واپس آیا تو حکم ہوا۔

"تکیوں کے غلاف اور پلنگ کی چادریں بدل دیجیئے"

تخت اور پلنگ پر کی چادریں بدل دی گئیں۔ پر غلاف تین ہی تھے اور تکیے چار۔ جب راشدہ دعوت کا مرکزی سامان تیار کر چکی تو مکان کا جائزہ لینے آئی۔ کمرے اور دالان کے فرش کو پانی سے دُھلوایا۔ دھلوانے سے پہلے جھاڑو دلوایا۔ اور دھلوانے کے بعد بھی جھاڑو دلوایا اور جب فرش خشک ہو گیا تو داغ دھبوں کو مٹانے کے لئے اس نے خود ہی کپڑے کا ایک ٹکڑا لے کر فرش کو رگڑ رگڑ کر پونچھا۔ خانہ داری اور آرائش اسے ہاشم سے زیادہ عزیز تھیں۔ اس میں اس کی شخصیت اور ذوق کے مطالبات کی تسکین ہوتی تھی۔ دیوار کے گوشوں اور چھتوں کے زاویہ سے وہ صبح کو ہی جھول جھاڑ چکی تھی۔ اس کی نظر

جب ایک میلے غلاف پر پڑی تو آتشِ زیر پا ہو اٹھی اور ہاشم پر خوب برسی - غلاف اتار پھینکا اور جب اسے کوئی دُھلا ہوا غلاف نہ ملا تو سرہانے چادر کے نیچے تکیہ کو جی بھر کر کے ڈھانپ دیا اور دیر تک چیں بر جبیں رہی۔ مگر بلا اُس وقت نیم پر چڑھا جب اسے ایک بھی دھویا ہوا میز پوش نہ ملا - کوئی چادر بھی الگ کی نہ تھی کہ کھانے کی میز پر اُسے ہی بچھا دے - دل کا بخار ہاشم پر اتنا اترا کہ وہ بھی تلملا اٹھا - آج غیر معمولی درجہ حرارت تھا - ہاشم نے بھی آخر تپش محسوس کی اور اسے اپنی تضحیک سمجھا -

"چادریں اور غلاف ہوں کہاں سے ؟ دو چادریں اور غلاف تو تم اپنے گھر موتی پور چھوڑ آئیں - یہ بھی شوق کہ ان کے وہاں کا بھی کمرہ سجا رہے اور یہاں بھی چمک دمک قائم رہے، اور آپ کے بھائی صاحب کے ساتھ ایک چادر اور دو غلاف گئے - اُن کی میلی چیزیں اب تک دھوبی کے یہاں پڑی ہوئی ہیں "

راشدہ نے کبھی ہاشم سے یوں کڑوا جواب نہیں سنا تھا - بے بس سی ہو گئی ، اور انتہائی بیگانگی کی خاموشی کے عالم میں اس کے گلابی رخساروں پر آنسوؤں کے چند گرم قطرات ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح گر پڑے - مگر ابھی ابھی دعوت تھی ، مہمان آرہے تھے - اُس نے ایک پھٹی ہوئی چادر اس سلیقے سے پلنگ پر بچھا دی کہ چاک کا پتہ نہ چلے - پائتانے میں اوڑھنے کی چادر رکھ کر عیب پر پردہ ڈال دیا اور اچھی چادر اُٹھا کر کھانے کی میز پر لگا دی - پھر اسی قرینے سے ناشتہ سجایا ، اور غسل خانہ میں مُنہ اور ہاتھ دھونے چلی گئی - وہاں خوب دل کی بھڑاس نکالی - اُسے مسلسل نئے تجربات ہو رہے تھے جس کے لئے وہ تیار نہ تھی - آرائش و زیبائش اور غازہ و گلگونہ کے باوجود اس کی روئی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کھانے کی میز پر مہمانوں نے یہ محسوس کیا کہ بادل برس کر کھلا ہے - راشدہ کی مسکراہٹوں اور دلنوازیوں کی سطح کے نیچے غمناکیاں کانپ رہی تھیں -

٭ ٭

آخر ہاشم نے اپنی سعادت مندیوں سے راشدہ کے دل کا غبار کو کچھ ہلکا ضرور کر دیا - وہ نہایت متین و شریف آدمی تھا - مگر راشدہ بہت ہی سست رہنے لگی - رفتہ رفتہ

شمسی، فکرمندی میں تبدیل ہوگئی، اور عیادار عزیت میں کوئی ہمراز نہیں تھا۔ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ راشدہ نے ہاشم سے سب کچھ کہہ دیا۔ طبی معائنہ کرایا گیا اور بات پختہ ہوگئی۔

ہاشم کو حیات ازدواجی میں سب سے پہلی بار راشدہ سے یگانگت محسوس ہونے لگی، ورنہ شادی کے پہلے دن سے آج تک راشدہ نے اُسے اپنے حریم دل میں آنے نہ دیا تھا مگر اب ہاشم بے بلائے ہوئے اس دروازے پر دستک دینے لگا تھا۔ وہ راشدہ کو پہروں دیکھتا رہتا، اور اُس کا بے حد خیال رکھتا، نازبرداریاں تو وہ پہلے بھی کرتا رہا تھا۔ مگر دل برداشتہ طور پر اخلاقاً۔ لیکن اب وہ ایک انجان جذبہ کے ماتحت راشدہ کو اپنی آنکھوں میں بٹھا لینا چاہتا تھا۔ "آپ نہایت خود غرض ہیں۔ میری قدر نہیں ہو رہی ہے، یہ کسی اور کا مان ہے۔" راشدہ اکثر کہتی۔ پر اس طعنہ میں کبھی کبھی اسے مبہم سی لذت بھی محسوس ہوتی۔

اب ہاشم اور راشدہ میں قریباً روز لڑائی ہوتی۔ وہ بات بات پر ٹوکتا، یہ احتیاط! وہ احتیاط! یہ غذا! وہ دوا! راشدہ کو تو ہر کھانے کی چیز سے نفرت سی ہوگئی، اور دوائیں تو اس کی بیرن تھیں۔ وہ سوچتی، ہاشم نے تو پہلے اُس کی زندگی میں اتنا دخل نہ دیا تھا، بلکہ وہ اکثر باتوں میں بے درد حد تک بیگانہ رہتا تھا۔ اُسے پہلے کوفت محسوس ہوئی۔ بعد میں ہاشم کی یہ دیکھ ریکھ اُسے گوارا لگنے لگی، اور پھر کچھ یوں ہی بھلی سی۔ تسکین پندار کی حد تک خودنمائی و خود بینی! ادھر ہاشم یہ محسوس کرنے لگا کہ کسی نے راشدہ سے اسے وصل کر دیا ہے، دراصل اب ان کا عقد ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا کہ کسی نے اُس کے دل کو راشدہ کے جسم کے اندر رکھ دیا ہے، اور وہ دل بالیدہ ہو رہا ہے دھڑک رہا ہے۔ اس کی حیات جذبی انہی دھڑکنوں سے خون حاصل کر کے پرورش پا رہی ہے۔

راشدہ کے ابتدائی دوروں کا سلسلہ رُک گیا، اور ایک ماہ بعد اس کی صحت بہت اچھی ہوگئی۔ اُسے غیر معمولی طور پر بہت بھوک لگنے لگی۔ اُس کی شرابی آنکھوں اور گلابی رخساروں کے درمیان ہلکی سی گھلاوٹ سی پیدا ہوگئی تھی، اور اس کیفیت سے ایک لطیف سی مستی انگڑائی لے کر جاگ اُٹھی تھی۔ اس کے شاداب چہرے پر دل رُبا نقاہت

مچلتی رہتی تھی - اس کا کھلتا ہوا رنگ اور کھل کر نکھر گیا تھا - دل کی دھڑکن ذرا تیز ہو گئی تھی - سانس کی رفتار میں ذرا نازک سی گرم جوشی چونک پڑی تھی - ان باتوں کے نتیجے میں اس کا گورا مکھڑا ذرا سی تھکن میں بھی گلنار ہو جاتا تھا - اس کی پلکیں افسانہ سرا لگتیں اور اس کے لب شمار کے تاروں کی لرزش لئے ہوئے تھے - بدن نا قدرولی کیفی ہو گیا تھا، گداز، بالیدہ و نرم، سڈول اور سرافراز، آرام جاں، نازک سی حمدت اس کے تندرست سراپا سے یوں پھوٹتی تھی جیسے بند مٹھی میں سے بیلے کے پھول کی مقید خوشبو - راشدہ اکثر پر سرور حالت میں رہتی، چال میں البیلی لڑکھڑاہٹ، اور بات میں متبسم شرارت - اس پر ایک سکون پرور نڈھال پن طاری رہتا - دل چسپ سی سہل انگاری اور رسیلی آسکت میں وہ غلطاں غلطاں رہتی، فضا میں، ماحول میں، زیست میں وہ ایک خوش گوار پھیلاؤ محسوس کرتی، ایک خواب ناک وسعت دماغ کی سنسناہٹ اور دل کا نرم سا مبہم اضطراب بھی اُسے بھاتا، اور رات کی نیندیں اس کے لئے انجان شیریں سپنوں، سرمست فراموشی، اور بے پایاں آرام کا پرستان ہوتیں - سوتے وقت وہ ہاشم سے مسہری کا پردہ گرانے اور اس کے حاشیوں کو موڑنے کو کہتی تو اس شان سے گویا وہ ایک شہزادی ہے - پر اُسے ایسا لگتا کہ ہاشم ملازم نہیں محافظ ہے - پہلے تو راشدہ ہاشم کو شاید بدلوا سے بھی اوچھی سمجھتی تھی - جب وہ اُسے کچھ کرنے کو کہتی تو وہ حکم ہوتا - حکم تو اب بھی دیا جاتا تھا پر اب اس کے اندر نازکی شیرینی بھی ہوتی تھی - ہاشم تو رات کو اٹھ اٹھ کر خاموشی سے راشدہ کے حسنِ خوابیدہ کو تکتا رہتا، جیسے وہ بڑی گراں مایہ دولت کی حفاظت کر رہا ہو - وہ شب کے سناٹے میں حیات، چٹکتی، پھولتی، کھلتی، جھومتی ہوئی حیات کی سرگوشیاں سنتا، خاموش، حیرت زدہ - کبھی وہ بڑے پیار سے راشدہ کو سر سے پاؤں تک یوں چھوتا جیسے نسیم سحر سوئی ہوئی بھرپور ندی کو سہلا جائے - صبح سویرے اٹھ کر وہ راشدہ کے بہت سے خانہ داری کے کام کر دیتا، سید ھا نکلواتا، جھاڑو دلواتا، منہ ہاتھ دھونے کا سامان بھی غسل خانہ میں آراستہ کر دیتا، بدلوا کو تاکید کرتا کہ شور نہ ہو تاکہ خوابِ ناز میں خلل نہ پڑے - راشدہ تھکی تھکی شکر بہ آغوش حالت میں اٹھتی تو کبھی کبھار ہاشم پر رحم یا ممنونیت کی نگاہ ڈالتی اور گاہے گرم گسترانہ پرسش کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے

کم ہے - ہاشم کے لئے یہ دولت دوجہاں تھی -

⁂

پھر اس کی طبیعت خراب رہنے لگی - تھکا، بے حد تھکا ہوا جی، ٹوٹتا ہوا بدن جوڑ جوڑ جیسے کوئی ڈھیلا کئے دیتا ہو، کمر، کولھے اور ریڑھ کی ہڈیاں سب کھنچی کھنچی رہتی تھیں - ہر وقت وہ اپھری اپھری سی رہتی - ہر گھڑی پڑے رہنے کو دل چاہتا، مگر لیٹے رہنے میں سر چکرانے لگتا اور دم گھٹنے لگتا - عجیب عجیب خواہشیں ہوتیں، بعض دفعہ بے سرِ پا، اور ان ہونی، وہ بہت چڑچڑی اور بد مزاج ہو گئی - بات بات پر ہاشم سے لڑتی، روتی اور روٹھتی کئی کئی دن برافروختہ رہتی -

ایک دن عجیب سی بات ہوئی - باورچی خانہ کا فرش کوئلہ کوٹتے کوٹتے تڑخ کر ٹوٹ گیا تھا اور پھر چند دوسرے حصوں کی مرمت کی ضرورت تھی، مستری بلایا گیا - دوپہر کے وقت کھانے کو وہ گھر چلا گیا - ایک لوہے کی کڑاہی میں وہ سیمنٹ گھول کر رکھ گیا تھا - اُسے دیکھ کر یک بیک راشدہ کو خواہش ہوئی کہ گھولا ہوا سیمنٹ چاٹ جائے - یوں تو وہ کوئلے کی راکھ، دیوار کے پلاسٹر کے ٹکڑے، اور دریا کے کنارے کی گوری مٹی کھایا ہی کرتی تھی، سیمنٹ چاٹنے کی تیز خواہش کو وہ روک نہ سکی - وہ اُٹھ کر کڑاہی کے پاس گئی، اور بہت سا لیس دار گاڑھا سیمنٹ یوں چاٹ گئی جیسے لذیذ فرنی کھا رہی ہو، کھانے کو تو وہ کھا گئی، مگر شام تک اس کے پیٹ میں درد اُٹھا، اور کچھ دنوں کے بعد اسے ایک وہم پیدا ہو گیا - وقت تیزی سے گذر رہا تھا اور وہ دوہری ہوتی جاتی تھی - اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے کلیجے پر سل رکھ دی تھی - دم گھٹا گھٹا رہتا، اور اب تو اُس کے پیٹ میں پھڑکن نے بڑھتے بڑھتے خلفشار کی حالت اختیار کر لی تھی - ہر اندرونی جنبش کے ساتھ جی سنسنا اُٹھتا اور کبھی اُبکائی آنے لگتی، ایک دو ہفتوں کے بعد جنبش تیز ہو گئی - راشدہ اس حال میں اور گھبرا گئی، گھٹن اور اپھرن زیادہ محسوس ہونے لگی - طبیعت بہت بے چین لگتی، ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے پتھر کے ٹوٹے کو اس کے جسم کے اندر سا دیا ہے - ہلچل سے یہ اپھار زیادہ بڑا تھا - اُسے احمقانہ سا شک ہونے لگا کہ یہ سیمنٹ کے کرشمے تو نہیں - یہ وہم اتنا بڑھا کہ اُسے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی - اُس نے فوراً اپنے میکے تار دلوا کر بھائی کو بلوا لیا - اور متھرا پور جانے پر تُل گئی، وہ سمجھتی

تھی کہ اندر کچھ ہو گیا ہے، زہر کھلنے کا ہر آن شبہ تھا۔

ہاشم یہ کہتا تھا کہ دیہات جانا مناسب نہیں۔ اس حال میں شہر میں رہنا چاہیے ہر وقت طبی مدد مل سکتی ہے۔ مگر راشدہ کو وہ ضد ہوئی کہ کیا کہیے۔ ہاشم سے اسے سخت تنفر محسوس ہو رہا تھا۔ ہاشم بھی اڑا ہوا تھا۔ بڑی تو تو مَیں مَیں ہوئی، اور جب اچانک راشدہ نے پھر اندرونی جنبش محسوس کی تو بھی وہ اپنی دُھن کی پکی ہی رہی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ ضرور گھر جائے گی۔ بھائی کو کیسے یوں ہی واپس کر دے۔ ہاشم سے اچھی خاصی لڑائی ہو گئی۔ اب وہ پھر پہلی سی راشدہ تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ اگر ہو سکتا تو ہاشم کے سارے آثار اپنے سے علیحدہ کر کے میکے چلی جاتی۔ راشدہ تنہائی اور کم مائیگی کا الاہنا دینے لگی۔

"مَیں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ کسی کی لونڈی نہیں۔ رحم بھی نہیں آتا کسی کو۔ ایک چھوکرا ہے۔ اس سے کھانا تک تو پکتا نہیں، اور اس پر ہر چیز کی تنگی۔ مَیں اس حال میں مر جاؤں گی......" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہاشم متردد، متوحش اور محجوب تھا۔

"واقعی راشدہ کو آرام کی ضرورت ہے۔ مَیں نے بڑا ظلم کیا ہے۔" ہاشم کو خیال ہوا۔ مگر وہ مطمئن نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہیں آپا کو بلوا لیا جاتا اور ایک ماما ساتھ آ جاتی۔

اس کشاکش میں راشدہ کی ہی ہٹ رہی۔ اُس کی جیت ہوئی۔ دوسرے روز ہاشم اسے اسٹیشن تک پہنچانے آیا۔ راشدہ بھائی کے ساتھ تو تی پور جا رہی تھی۔

جب راشدہ ڈبے میں بیٹھ گئی اور گاڑی کھلنے کا انتظار کیا جانے لگا تو ہاشم اسٹیشن کے رستوران سے چائے اور ناشتہ منگوانے کو جانے لگا، مگر راشدہ نے کہا۔

"آپ مت جائیے۔"

"پھر چائے کیسے آئے گی؟" ہاشم بولا۔

"محمود جا کر لے آئیں گے۔" راشدہ نے غیر معمولی نظروں سے ہاشم کو دیکھتے ہوئے اور اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

محمود نے رستوران کا رُخ کیا۔ سیاہ برقعے سے ایک ہاتھ بڑھا، اور اس نے ہاشم کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہاتھ کے لمس میں بھی گویائی ہوتی ہے۔ نازک، تھرتھراتی ہوئی

انگلیاں نوکِ زبان کا کام کر رہی تھیں ، اور نکہت کان کا دامن بنا ہوا تھا ۔ برقی موجیں اعصاب کے تاروں پہ لہرا لہرا کر دل و جان کے مرکز کو کپکپا رہی تھیں ۔ راشدہ اور ہاشم دونوں کی آنکھیں پُرنم تھیں ۔ خموشی تھی ، لب تھرتھرا رہے تھے ، سکوت میں تاثیر بڑھ جاتی ہے ۔ جب جائے آئی تو دونوں ہاتھ بڑے درد و کرب سے علیحدہ ہوئے ، جیسے کسی نے شدید ضرب لگا دی ہو ۔

ٹرین کھل گئی ۔ ہاشم پلیٹ فارم پر تھا ۔ اور راشدہ درمیانی بنچ پہ ۔ اس کی خواہش تھی کہ دریچے سے ملحق ہوتی ۔ مگر مارے شرم کے دریچہ کے پاس نہ جا سکی ۔ جذبات سے بوجھل آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے ٹپ ٹپ گر رہے تھے ۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی ۔ ہاشم ٹک لگائے راشدہ کو دیکھ رہا تھا اور راشدہ سے بہت آگے ، ٹرین کا چلنا اس کے لئے جراحت کی چھری کا چلنا تھا ۔ اس کے دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے ۔ اس کی روح پرواز کر کے راشدہ کے ہمراہ جانے کی تمنا میں پھڑپھڑا رہی تھی ۔ راشدہ نے محسوس کیا کہ ہاشم کی شخصیت اس کے ساتھ مضبوطی سے چسپاں ہے —— اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے آنسوؤں کے ہالے میں ایک ننھا سا فرشتہ دریچہ سے باہر ہاشم کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا رہا ہے ۔

"سیمنٹ و ڈائنامیٹ"

پس منظر

"نا بہن زمانہ بُرا ہے۔ ایسا بھی کیا۔ دھاکڑ سی جوان جہان لڑکیوں کو بندریا کی طرح در بہ در لیئے پھرنا۔ بڑی بجا بھی تو زمانہ بھر سے نرالی ہو گئی ہیں۔ آخر میں نے بھی تو دو تین لڑکیوں کو پوس پال کر بیاہا۔ اور اب یہ ماشاء اللہ چوتھی شاکرہ ہے۔ بھلا کوئی انگلی تو اُٹھائے۔"

—اور اس کے جواب میں نہیں' صدائے بازگشت کے طور پر—

"سچ کہتی ہو بہن۔ کنواری لڑکیوں کو داب کر رکھنا چاہیئے۔ واقعی بڑی بجا وج شرافت پر بٹہ لگاتی ہیں۔ تنویر و پروین کو تو دیکھو۔ یہ فرنگنوں کے سے انداز۔ اُٹھان پک لڑکیاں اور ایسی سر چڑھی۔ بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں ٹپ ٹپ دخل کیے دیتی ہیں۔"

یہ تھی وہ گفتگو جو شاکرہ نے اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے سُنی۔ اس کی ماں اور رشتے کی خالہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ کو غصہ آ گیا۔ اُسے ان خالہ صاحبہ سے نفرت تھی۔ ایک تو اس کی والدہ سخت پابندیوں کی قائل اور اس پر یہ کریلے اور نیم چڑھے والی بات۔

"خالہ بنی ہیں! اونہہ خالہ! ہے کیسی موٹی۔ گول مٹول۔ ہر وقت کچر کچر پان چباتی رہتی ہے۔ بوڑھی بکری!" شاکرہ نے غصے سے گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے زیرِ لب کہا۔ اس کی تیوری پر بل آ گئے۔

شاکرہ پندرہ سال کی تھی۔ مگر اس کی پرورش ایسے خاندان میں ہو رہی تھی جہاں کنواری لڑکیاں اس طرح رکھی جاتی ہیں، جیسے جیل کے خطرناک قیدی یا پاگل خانے کے تشدد پسند مریض۔ اس کی صحت تو یوں اچھی خاصی تھی مگر وہ کچھ گھٹی گھٹی اور چڑچڑی سی معلوم ہوتی تھی۔ خالہ بی کی باتیں سُن کر وہ جل ہی تو گئی۔ پھر کچھ واضح اور غیر واضح خیالات اس کے دماغ میں چکرانے لگے۔ وہ

تنویر و پروین کو بے حد پسند کرتی تھی۔ ان کی خوب صورت ساریاں، اُن ساریوں کی حسین بندش، نظر فریب آرائشِ گیسو، اگر گابیاں، سنٹ اور لبوں کا گلگونہ۔ یک بہ یک تنویر و پروین کے گلنار لب شاکرہ کے تصور میں مہک اٹھے۔ "کاش میں بھی اس طرح سج سکتی!" پھر اُن بہنوں، دو حسین بہنوں کی پیاری پیاری باتیں، ادب، افسانے، نظمیں، آہ اُن نظموں میں کیا جادو ہوتا ہے!

وہ بھلی سی نظم۔ اچھا وہ ___ کاش تم چلے آتے مسیح صبا بن کر ___ اور میرے ہاں۔ کل کا گھوڑا، سمندری شہزادی، جیسے میں ابھی تک تختی ہی دھری ہوں۔ ہوں! اور یہ دیکھو تو۔ کیا کتاب ہوئی! راہ نجات، سورج کا ثواب، جنت کا حصول، بہشتی زیور، برائی کا انجام، صبغتہ اللہ،

وہ تو خدا بھلا کرے ناصر کا۔ بھائی جان کی میز پر سے اچھے اچھے رسالے چرا کر لا دیتا ہے بیچارہ ناصر۔ اور جو ناصر نہ ہوتا! اونہہ ......

شاکرہ ابھی خیالات میں گم تھی کہ پھر گفتگو کی ایک سمع خراش موج باہر سے آئی۔

"یہ تنویر و پروین تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ مجھے اُن کے لچھن اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ بھلا کنواری لڑکیاں یوں ٹھٹھا کے لگاتی ہیں" یہ خالہ بی کی تنقید تھی۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ انھیں چڑا کر خوب زور سے قہقہے لگائے مگر یہ ناممکن تھا۔ اس کا ارادہ بغاوت بجھ کر رہ گیا۔ اسے تو مسکرانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ہر وقت سنجیدہ، کیا مانگی چہرہ بنائے بیٹھے رہنے کا حکم تھا اسے۔ ہنسو مت، بولو مت، چوروں کی طرح دبے پاؤں چلو، مجرموں، خطاکاروں کی طرح سمٹے سمٹائے رہو۔ غرض سینکڑوں احکام تھے جن کے مسلسل بوجھ تلے اس کی ساری اُمنگ پس کر رہ گئی تھی۔ شاکرہ کے چہرہ پر نفرت، لپسائی اور ایک بیزاری چڑچڑاہٹ کے نقوش بنے اور پھر نوع در نوع جذبات کی موجوں کے ہلکوروں سے مٹ گئے۔

یہ خالہ بی شاکرہ کی والدہ کی ہاں میں ہاں ملاتیں اور ان کی ہر بات کو سراہتی تھیں۔ اس لیے پہلے پہل دعوتیں، مہمانیں اور ہر طرح کی خاطر داریاں۔ ان کے میاں نے ایک رنڈی رکھ لی تھی اور یہ انتقاماً گھر سے اکثر غائب رہا کرتی تھیں۔ ایسے ہی قدرداں عزیزوں کے یہاں۔ مگر ان کے برتاؤ میں ایک خاص ٹھسا اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ ہاں میں ہاں ملاتیں بھی تو اس انداز سے

جیسے بزرگانہ پسندیدگی کا اظہار فرما رہی ہوں۔ شاکرہ کی والدہ پر انھوں نے اپنی اہمیت اور ضرورت ثابت کر دی تھی۔ اور یوں بھی گھر گرہستی اور سماجی اصولوں میں دونوں کا اتفاق تھا۔ شاکرہ کی والدہ "خالہ بی" کی پسند اور ناپسند کا بڑا پاس کرتی تھیں۔ جیسے ایک فن کار دوسرے ہم نظر و ہم ذوق فن کار کی تعریف کو بہت عزیز رکھتا ہے اسی طرح انھیں "خالہ بی" کا سراہنا بہت مرغوب تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ کنواری لڑکیوں کی تربیت کا معیار قائم کرنے میں بھی خالہ بی، تو سرزنش تک کی قائل تھیں اور اس بلند معیار پر شاکرہ کی والدہ کا پورا اترنا ضروری تھا۔ لہذا جب بھی یہ خالہ بی، گھر میں رونق افروز ہوتیں، شاکرہ اپنے کندھوں پر تربیت کا وزن زیادہ محسوس کرتی۔ جب شاکرہ نو سال کی ہوئی اسی وقت سے باضابطہ طور پر وہ محض لڑکی سے کنواری لڑکی شمار کی جانے لگی اور مکلف بنا دی گئی اور اوامر و نواہی کی بوچھاڑ اس پر شروع ہو گئی۔ احکام سے ممانعتوں کی فہرست زیادہ طویل ہوتی گئی۔ کنواری لڑکیاں یوں نہیں کرتیں، وہ یوں نہیں کرتیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ احکام مستحکم اور ممانعتیں زیادہ شدید ہوتی گئیں، یہاں تک کہ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک کوٹھری میں مقید ہو کر رہ گئی۔

شاکرہ سینا پرونا، کھانا پکانا، اور خانہ داری کے دوسرے کام سب سیکھ چکی تھی۔ گھر میں باورچن، خادمائیں، مامائیں موجود تھیں۔ لہذا اسے کچھ خاص کام بھی کرنا نہ ہوتا، بس یونہی بیٹھے پروتے رہنا۔ کبھی کبھار باورچی خانہ میں کوئی اچھی چیز پکانے چلے جانا اور پھر اپنی کوٹھری میں پڑے بہشتی زیور پڑھنا۔

"اتنی بڑی ہو گئی اور اوڑھنی گلے میں لپیٹے پھرتی ہے۔ ادھر آ۔ اسے یوں اوڑھتے ہیں۔ کمبخت اتنا بھی سلیقہ نہیں تجھے۔"

یہ تھے تادیبی الفاظ جو شاکرہ نے آٹھ سال کی عمر میں سُنے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ اوڑھنی اوڑھنے میں مجھ پر یہ پابندی کیوں لگائی جا رہی ہے؟ حکم کو تو وہ بھول گئی لیکن حکم کی تلخی کا ایک مبہم احساس اس کے دل سے دور نہ ہو سکا۔ اُس نے کئی بار گھڑکیاں سُنیں۔ مگر وہ اوڑھنی کے الجھاوے میں گرفتار ہونے کے لیے تیار نہ تھی۔ ماں اور بڑی آپا کے سامنے تو خیر، مگر بچیوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت وہ کچھ اتفاقاً بھی اوڑھنی کو اُتار پھینکتی۔ بارہ سال کی

عمر میں اسے خود اوڑھنی سلیقے سے اوڑھنے کی ضرورت نمایاں نظر آنے لگی۔ لیکن حکم کی غیر ہموار شدت کی خلش اسے اکثر عدولی حکم پر مجبور کرتی اور اوڑھنی گلے میں نام کے لئے لپیٹ کر کبھی گھر کی انگنائی یا کوٹھے کی چھت پر یونہی یا کسی چھوٹے بچے کو پکڑنے کے لئے دوڑ جاتی۔ اسے کپڑے کی سرسراہٹ، اور ہوا کے لمس سے لذت حاصل ہوتی اور سب سے بڑھ کر نافرمانی کی مسرت۔

"اری کمبخت! بے حیا! اُچھلتے لگائے پھرتی ہے۔ بے شرم! جوان ہوگئی اور لاج شرم کچھ نہیں۔ جب دیکھو اُڑی ہوئی ہے۔ یہاں آ، شاکرہ! کُدکڑے مت لگاتی پھر!" اسی قسم کی آوازوں سے شاکرہ کی پھوٹتی کونپل کو "خوش آمدید" کہی جاتی تھی۔ وہ سوچتی کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے، جو یک بہ یک اماں جان اور ابا جان مجھ سے ناحق کے خفا رہنے لگے ہیں۔ جب سنو "جوان ہوگئی ہے" یہی سنتے سنتے تو کان پک گئے۔ جیسے ان باتوں میں میرا قصور ہے۔ شاکرہ اچٹتی ہوئی نظروں سے اپنی پیش نگاہ تبدیلیوں کو دیکھتی اور ایک مسرت آگیں حیرت کے احساس میں بزرگوں کی سختیوں کو بھول سی جاتی۔

"کنواری لڑکیوں کو دبا کے رکھنا چاہیے۔ جوانی دیوانی ......" ایک روز شاکرہ نے خالہ بی کی یہ بولی سُنی۔ اُس روز اسے ایک نہایت ہی عجیب اور وحشت ناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ اب تک اُس تجربہ کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈری ڈری، سہمی ہوئی، پریشان، متفکر، بدحال۔ خالہ بی کی بکواس سے وہ سر سے پاؤں تک سلگ اُٹھی۔ وہ سوچنے لگی۔ "لوگوں کو مجھ سے اگر نفرت ہوگئی ہے تو میں بھی سب سے نفرت کروں گی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے اور یہ لوگ بے حس بنی ہوئی اُلٹا میرے خلاف مشورے کر رہی ہیں۔ میں جوان ہو ہوئی تو جیسے بڑا گناہ کیا، جس کی سزا مجھے دی جاتی ہے۔ اے اللہ میں مر کیوں نہیں جاتی۔ اچھا ہے اب اسی طرح جان نکل جائے گی۔"

شاکرہ کبھی سوچتی کہ آخر یہ جوان ہونا کیا بات ہے۔ وہ مبہم مگر حقیقی نئی کیفیتوں کی تہہ میں ڈوب کر اپنے آپ سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اس کے ذہن و تخیل نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں بدل رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے احساسات غیر واضح انداز میں انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک موہوم مگر شیریں سرگوشی کا سراغ پانے لگی تھی۔ اس کی

زندگی کا افق وسیع اور رنگین ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس وسعت میں ایک کپکپا دینے والا حیرت افزا خوف بھی تھا۔ اور اس رنگینی کے ساتھ بے دردی اور اوامر و نواہی کے سیاہ بادل بھی منڈلاتے نظر آتے تھے۔ وہ اب تک چھوٹے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ مگر اب وہ جوان لڑکیوں کی صحبت پسند کرنے لگی۔ شاید وہ ان کے مطالعہ سے اپنا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دو بہنیں ہنوز کنواری تھیں۔ ایک اکیس سال کی اور دوسری اُنیس کی۔ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور آپس میں گاہے گاہے رازدارانہ طور پر باتیں کرتی پائی جاتیں۔ شاکرہ کو بھی ایک جستجو سی رہنے لگی کہ وہ کیا باتیں کرتی ہیں اور ایسی باتیں جو امی جان اور بڑی آپا کے سامنے آتے ہی رک جاتی ہیں۔ مگر وہ ان کی صحبت میں بار نہیں پاتی تھی "شاکرہ! تو بڑھی کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ آ کر کیا بیٹھتی ہے؟" غریب شاکرہ عجیب دوراہے پر تھی۔ وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کُدکڑے بھی نہیں لگا سکتی تھی اور نوجوان لڑکیاں اُسے پوچھتی بھی نہیں تھیں۔ محلّے کی کنواریاں بھی اُس کی بہنوں ہی کے ساتھ جا کر بیٹھتیں اُٹھتیں، یہاں تک کہ اس کی ہم عمر لڑکیاں بھی اُسی مجلس کو پسند کرتیں، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اسی محفل کی دلدادہ تھی۔ ہاں شاکرہ کی ایک دو ہم سن لڑکیاں جب اُس بزم سے نکالی جاتیں تو پھر شاکرہ کے ساتھ باتیں کرنے آ جاتیں۔ مگر یہ سب بھی تو ویسی ہی بھولی بھالی تھیں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے بہرحال شاکرہ کا جذبۂ جستجو تشنہ ہی رہا۔ اُس کے دل میں نئے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ مگر وہ ماحول کی ناہمدردی کے سبب سوکھ کر فنا ہو جاتے تھے۔ اس کے جی میں صدہا سوالات پیدا ہوتے اور اس کا جواب بس اس طرح ملتا "کنواری لڑکیوں کو یہ نہیں بولنا چاہئے۔ وہ نہیں کہنا چاہئے۔ ٹپ ٹپ باتوں میں دخل دینا بُرا ہے۔ بال یوں نہ سنوارو۔ نظریں یوں نہ اُٹھاؤ۔ اس طرح چلنا معیوب ہے، اس طرح ہنسنا بے شرمی ہے۔ ایسے کپڑے نہ پہنو۔ یہ مت کھاؤ۔ وہاں مت بیٹھو۔ اُدھر نہیں جاؤ۔" شاکرہ سوچتی "آخر وہ کیا کرے۔" بس اسی طرح سوچتے رہنے سے اُس کی زندگی ہی محض سوچ ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے من کی کُٹیا کے اندر تنہا، ایک عالمِ خیال میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

جب شاکرہ چودہ سال کی ہوئی تو ایک ہی ساتھ اس کی دو کنواری بہنوں کی شادیاں

رچائی گئیں۔ اُن دنوں خالہ بی، تو مستقلاً شادی کے گھر ہی میں آکر رہ گئی تھیں۔ ان کے
حاضر و ناظر ہوئے بغیر کوئی کاج بھلا کیسے انجام پا سکتا تھا۔ مہمان بی بیاں بھی آئی تھیں۔ لہٰذا شاکرہ
پر سخت پردے کے احکام نافذ کر دیئے گئے تھے۔ دُلہنوں کے مانجا بیٹھنے والے کمروں میں بھی
اسے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اوّل تو رشتہ دار بی بیاں وہاں دُلہنوں کو دیکھنے آتی رہتی
تھیں، پھر دُلہنوں کی سکھیاں رنگین محفل جمائے بیٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ برات کے دن
قریب آتے گئے اور رنگ رلیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر طرف گھما گھمی اور کام کاج کے ساتھ
بے کام کے بھی کام ہوتے رہتے تھے۔ راتوں کو محلے کی نوجوان لڑکیاں آجاتیں تو شاکرہ کا دل
خوب بہلتا۔ مگر دن کو وہ تنہائی اور قید سے اُکتائی اُکتائی رہتی۔ گھر میں ہر سو چہل پہل مگر اُس
کے لیئے گھر بیابان۔ اُن دنوں شاکرہ پر کچھ راز منکشف ہوئے، کنوار پنے اور جوانی کے راز۔
شادی کے گھر میں عمر رسیدہ عورتیں بھی ماضی کی رنگینیاں بیان کر کے کچھ دیر کے لیے سرشار ہو لیتی
ہیں، اور نئی شادی شدہ لڑکیاں کنواریوں کو چھیڑ چھیڑ کر راہ و رسم منزل سے آگاہ کر جاتی ہیں۔
شاکرہ پر بھی رنگین انکشافات ہوئے، مگر غیر واضح طور پر۔ اس کے تخیّل کو اور مہمیز لگ گئی۔ وہ
دن بھر کوٹھری میں پڑی نئی باتوں کو سوچتی رہتی۔ وہ علم اور لاعلمی کی بھول بھلیاں میں اُلجھتی رہتی۔
اُس کا جذبۂ تجسس اسے بے قرار رکھتا اور سوچتے سوچتے وہ تھک کر چڑچڑی ہو جاتی۔ اُس کا اپنا
جسم اس کے لیئے باعث حیرت تھا اور روح کی گہرائیاں اُس سے زیادہ حیرت فزا۔ خون کی روانی
اور مبہم تمناؤں کی موجیں کبھی اُسے خواب آگیں رنگین جزیروں میں لے جاتیں اور کبھی سرشار
حقیقتوں کی طرف مائل کر دیتیں۔ وہ تخیّل کے طیارے پر پرواز کرتی، تمناؤں اور حسرتوں کی کشتی
پر ڈگمگاتی اور گاہ تصوّر کے بُت خانے تعمیر کر کے اپنے نوجوان بیدار ہوتے ہوئے حواس کو انجان
تجربوں سے ولولہ خیز لذت کے حصول کا موقع دیتی۔ اس کے دل و دماغ اور ذہن و روح ایک
علیحدہ دُنیا بناتے اور بگاڑتے رہتے تھے۔ رات آتی تو شادی کی فضا سمند ناز پر اک اور
تازیانے کا کام کر جاتی۔ شاکرہ رات رات بھر جاگتی رہتی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی اور اُٹھ اُٹھ
کر صراحی سے پانی پیتی تھی۔

آخر کار وہ دن کی نشتر بدست تنہائیوں سے گھبرا اُٹھی تھی۔ اُس نے ایک روز ناصر

کی منت وسماجت کی کہ وہ اُسے بھائی جان کی کچھ کتابیں پڑھنے کو لادے۔ ناصر رشتے کا ایک غریب لڑکا تھا، جو ملازم نما طالب العلم کی طرح شاکرہ کے گھر رہتا تھا۔ بے وقوف، خوف زدہ، سمٹا سمٹایا سا بارہ سال کا کم رو لڑکا، چھوٹے چھوٹے برابر برابر ترشے ہوئے بال، اونچی موری کا تنگ پاجامہ، تحریر دار میلی سی قمیص، پُرانی سلیپریں، جھکی ہوئی گردن اور مسکین سے تیور۔ یہ اُس کی خصوصیات تھیں۔ شاکرہ ہمیشہ سے ناصر سے نفرت کرتی رہی تھی۔ مگر اَب ضرورت کے وقت وہ اس کی خوشامد کرنے پر مجبور تھی، کیونکہ بھائی جان کی میز پر یا الماری میں سے کتابیں اور پرچے نکال لانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ناصر اس کی امداد پر راضی ہو گیا۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے اور شاکرہ اس دَور سے ایک نئے جاگے ہوئے احساس کے ساتھ نکلی، ادھوری واقفیت اور ایک رنگین ابہام کی آرزو انگیزی لے کر۔ مگر وہ تکمیل کے لئے کُرھتی ہی رہی اور نوجوان زندگی کے قدم آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے جدید ممکنات اور نئے مطالبات کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔

بہنوں کی شادی ہو جانے کے بعد اب وہ بھی اپنی نو رسیدہ برتری کے دھونس شاکرہ پر جمانے لگیں وہ شادی شدہ ہو گئی تھیں اور یہ نیا اعزاز و افتخار انھیں اُکساتا رہتا تھا۔ وہ خالہ بی، اماں جان اور آپا جان سے بھی زیادہ اس کے کنوارپنے کی داروغہ بن گئی تھیں۔ شاکرہ کا تخیل آباد تھا، مگر اس کی دُنیا ویران تھی۔ اُسے تنہائی، بیگانگی، اور کس مپرسی کا تلخ احساس ہوتا رہتا تھا۔ وہ اپنا غصہ گھر کی نوکرانیوں پر اُتارتی۔ ذری ذری بات پر بگڑ جاتی۔ ناک بھوں چڑھاتی اور اکثر لڑ بھی پڑتی۔ بیلن چوکی سے اتنی دُور کیوں ہے، گھڑوں میں نہانے کا پانی دیر سے کیوں بھرا گیا، صابن دانی کدھر ہٹا دی گئی، بیسن کیا ہوا۔ بس اتنی اتنی سی بات اُس کے مزاج کو برہم کر دینے کے لئے کافی ہوتی اور اس کے نتیجے میں اُسے اکثر سخت سُست سُننا پڑتا۔ نئی شادی شدہ بہنیں بول اُٹھتیں۔ "ہے کیسی بدمزاج، بدزبان، دماغ ہر وقت عرش پر رہتا ہے، دیکھتی ہیں اماں جان شاکرہ کی بددماغیاں؟ کنواری لڑکی اور ایسی بیباک، شوخ چشم!"

شاکرہ دل میں کہتی "اونہہ، کل کو خود بھی تو کنواریاں تھیں، اور بدمزاجی میں گھر بھر میں مشہور، اور اب تو دماغ ملتے ہی نہیں، چلی ہیں مجھ پر دھونس جمانے۔" گھر کی نوکرانیاں بھی شاکرہ سے مُنہ پھلائے

رہتی تھیں، شادی شدہ بہنیں اگر ڈانٹتی تھیں تو پیسے اور کپڑے بھی دیتی تھیں، اور شاکرہ محض ایک کنواری لڑکی تھی۔ بس ایک بے چارہ ناصر تھا جو شاکرہ کی نرم و گرم سُن لیتا تھا۔ اور ہر حال میں شاکرہ سے مانوس اور اس کا طرف دار رہتا تھا۔ مگر اس کی ہستی ہی کیا۔ ایک ہیچ سا غریب لڑکا۔ بہر حال شاکرہ رفتہ رفتہ ناصر کو اپنا بہی خواہ سمجھنے لگی۔ شاکرہ نے ایک بلّی اور چند خرگوش پال رکھے تھے۔ ان کی دیکھ بھال بھی ناصر کے سپرد تھی۔ بلّی اور خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں دن بہ دن زیادہ اہمیت حاصل کرتے لگے۔ خرگوش سب سے زیادہ۔ کیوں کہ وہ کھلنڈرے تھے اور چونچال۔ اس کے بعد بلّی کہ وہ اس کے ساتھ مل کر خُر خُر سوتی تھی۔ اور پھر ناصر۔ کبھی کبھی شاکرہ چاہتی تھی کہ ناصر بھی شوخ چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا۔ مگر وہ تو ایک بے وقوف سا، مضمحل، کم گو لڑکا تھا۔ کاش اس کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے! جیسے خرگوش کی سُرخ یا بلّی کی ہوشیار چمکتی ہوئی آنکھوں میں تھے۔ خرگوش، بلّی اور ناصر کے علاوہ بڑی آپا کا دو سالہ بچّہ بھی شاکرہ کی توجہ کا ایک نقطہ تھی۔ وہ اسے گود میں لے کر خوب پیار کرتی، اس کے بوسے لیتی اور اسے خوب زور سے اپنی آغوش میں بھینچتی۔ اسے اس عمل سے بڑی تسکین ہوتی۔ بچّہ کو آغوش میں چمٹائے چمٹائے وہ تیزی سے دوڑ جاتی اور پھر بچّے کو ہوا میں اُچھالتی۔ کبھی یک بیک اس کا جی چاہتا کہ ناصر اس کی گود سے آکر بچّے کو لے لے۔ وہ ذرا شرما جاتی اور پھر بچّے کو زور سے سینے سے چمٹا کر بھینچتی اور چٹاخ چٹاخ اس کے بوسے لینے لگتی۔ اس نے دو تین بار ناصر کو بلا کر بچّے کو اسے دیا بھی۔ مگر ناصر تو ڈرا ڈرا، سہما سہما سا آکر حکم کی تعمیل کر جاتا اور بس۔

تو وہاں سائبان میں شاکرہ کی اماں جان اور خالہ بی بیٹھی ہوئی مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ بیٹھی بیٹھی اُٹھ کھڑی ہوئی اپنی کوٹھری سے نکل کر یونہی سارے گھر میں گشت کر آئی۔ بڑی آپا سسرال چلی گئی تھیں۔ نئی شادی شدہ بہنوں میں سے ایک اپنے میاں کو خط لکھ رہی تھیں۔ ان کے کمرے میں جو شاکرہ جا نکلی تو انھوں نے ناز و فخر و شرم کی آمیزش کے ساتھ چیں بر جبیں ہو کر اسے ایک ہلکی سی جھڑکی دی اور جھٹ سے خط کو چھپا لیا۔ دوسری بہن غسل کے تہیے میں اِدھر اُدھر چڑچڑ کرتی پھر رہی تھیں۔ شاکرہ ان سے بچتی ہوئی پھر اپنی کوٹھری میں

واپس آگئی۔ اور آ کر دھب سے پلنگ پر بیزاری کے ساتھ پڑ رہی۔ تھوڑی دیر پڑی رہنے کے بعد وہ اُٹھی اور آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھنے لگی۔ اس نے ہزار زاویئے سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُسے اپنے پر کچھ اعتماد ہوا۔ وہ اچھی خاصی صورت رکھتی ہے۔ اس کی سہیلیاں بھی تو یہی کہتی ہیں۔ اس نے پھر اپنے جوڑے کو کھول کر آئینہ میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے کھلے ہوئے جوڑے کو سنوارنے لگی۔ اسے اپنی سیدھی مانگ اور لپی ہوئی پٹی دیکھ کر غصہ آگیا۔ تنویر و پروین کیسی خوب صورت کج مانگ نکالتی ہیں۔ اور وہ ہلکی ہلکی خم بہ خم ایک طرف کو جھکی ہوئی حسین سی پٹی۔ اس نے آئینہ میں اپنا چہرہ پھر غور سے دیکھا۔ ایسی بدوضع مانگ اور ایسی فرسودہ انداز کی پٹی نے اس کی شکل کو کیسا غارت کیا ہے۔ وہ تو سچ مچ بدصورت ہی دکھتی ہے۔ اندر سے ایک آواز اُٹھی "نہیں نہیں تو حسین ہے لیکن اس پرانے فیشن نے تجھے بدنما کر دیا ہے" شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ ساری پابندیوں کی زنجیریں توڑ کر رکھ دے، پھر ایک اور خواہش اُبھری، کوئی آ کر اسے دیکھتا اور اسے پُرزور طریقے پر یقین دلاتا "شاکرہ تم بے حد حسین ہو" مگر زنجیریں شکستنی نہ تھیں اور کوئی اس کے حُسن کی ستائش کرنے والا بھی نہ تھا۔ وہ ناامیدی اور بے اعتمادی کی چوٹ کھا کر رونے لگی۔ اس نے آئینہ جھٹک کر ہٹا دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح سسکیاں بھرتی رہی۔

"ناصر! ناصر! ادھر آ ناصر۔ ذرا بازار سے پان لا دے!"

یہ اُس کی ماں پکار رہی تھی۔ شاکرہ اُٹھ بیٹھی اور بستر کے نیچے سے ایک مُڑا ہوا پرچہ نکال کر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔ ناصر ادھر سے گذرا۔ شاکرہ نے اشارے سے اُسے اپنی کوٹھری میں بلایا۔ اب ناصر تیرہ سال کا ہو گیا تھا۔ اُس سے ملنے میں تھوڑی سی پابندی لگا دی گئی تھی یعنی دونوں تنہائی میں ایک جگہ نہ پائے جائیں، بس اتنا، ورنہ ناصر تو ایک بُدھو قسم کا کوتاہ قد سا لڑکا تھا۔ ناصر اِدھر اُدھر دیکھتا، ڈرتا ہوا شاکرہ کی کوٹھری میں آیا۔ شاکرہ نے کہا۔ "ناصر! واپسی میں بھائی جان کی الماری میں سے کوئی اچھی سی کتاب لیتے آنا، طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔"

ناصر "اچھا" کہتا ہوا چلا گیا۔ شاکرہ اپنے بال سنوارنے لگی۔

شاکرہ نے پروین وتنویر کی طرح بال سجائے مگر پن کے بغیر وہ جمتے نہ تھے۔ بڑی کوشش سے کچھ بات بنی۔ وہ دیر تک طرح طرح سے آئینہ میں اپنی نئی سجاوٹ کو دیکھتی رہی۔ اس کی کوٹھڑی کی طرف کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ اس نے ڈر کر جھٹ ٹیڑھی مانگ کو مٹا دیا۔ مگر وہ یونہی سی آواز تھی۔ کوئی آ نہیں رہا تھا۔ اُس نے بالوں کو پھر جدید فیشن سے بنایا اور خود کو آئینہ میں دیکھ کر بہت مسرور ہوئی۔ وہ اُٹھی اور اُٹھ کر اس نے قلم دان سے قلم نکالا، الٹی جانب سے دوات میں ڈبو کر پیشانی کے وسط میں سیاہ بندی لگائی، اور آئینہ کے سامنے جھوم سی گئی۔ اچانک اُس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ وہ زیر لب مسکرا اُٹھی، اس نے دوسرے قلم کو سُرخ دوات میں ڈبویا اور اسے اپنے متبسم لبوں پر مل لیا۔ اس کے لب انار کی کلی کی طرح لہک اُٹھے۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں مچلنے لگیں، اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے سرمستی کے پھول برسنے لگے۔ وہ اپنی شبیہہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اُس کا دل چاہا کہ کاش یہ آئینہ ایک بولتا ہوا جادو کا آئینہ ہوتا، اس کے حُسن کی تعریفیں کرتا اور شاکرہ ایک وجد کے عالم میں اُسے پیار کر لیتی، اپنے سینے سے لگا لیتی اور اُس سے بہت ڈھیر سی اچھی اچھی باتیں کرتی رہتی۔

"شاکرہ باجی! شاکرہ باجی! — فرحت بھائی اپنے پرچے تلاش کر رہے ہیں۔ جلد لائیے نا — جلد! پرچے!"

ناصر کی گھبرائی اور گھُٹی ہوئی آواز نے شاکرہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ شرما گئی مگر اُسے غیر متوقع خوشی بھی حاصل ہوئی، ناصر نے اُس کا جلوۂ تازہ دیکھا ہے، وہ مبہوت ہو جائے گا۔ "اُف شاکرہ باجی اتنی حسین ہیں!" اور شاید شعلۂ حسن اس کے ٹھنڈے، منجمد سے دل اور مرجھائی ہوئی آنکھوں میں زندگی، رواں دواں زندگی کے چراغ جلا دے۔

"کتاب لائے ناصر؟" شاکرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! — فرحت بھائی۔ پرچے! باجی پرچے!" ناصر نے بوکھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں دیتی پرچے، تم کتاب نہیں لائے" شاکرہ نے پرچے نکالتے ہوئے شرارت

سے ناصر کو دیکھا اور بیساختہ ہنس دی۔

"باجی! خدا کے لیئے!"

"لے لو نا اگر ہمت ہے! تم کتاب کیوں نہیں لائے؟"

ناصر پرچے لینے کے لیئے آگے بڑھا۔ شاکرہ نے پرچوں کو پیچھے ہٹا لیا۔ ناصر پرچوں پر جھپٹا۔ شاکرہ نے انھیں اپنے گریبان میں دبا لیا۔ "میں نہیں دوں گی، میں نہیں دوں گی! تو جانوں۔" شاکرہ نے ہنستے ہوئے ناصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھبرایا ہوا ناصر جلد پرچے حاصل کرنا چاہتا تھا، ورنہ فرحت بھائی اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔ شاکرہ کھلکھلا کر ہنسی اور ناصر کے ہاتھ کو اُس نے پرچوں سمیت اپنے قریب تر چمٹا لیا۔ پرچے کشاکش میں نیچے گر پڑے۔ مگر ناصر کا ہاتھ ہنوز گرفت میں تھا (اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ خرگوش کے چھوٹے بچوں کو مس کر رہا ہے)۔

"شاکرہ! — شاکرہ! یہاں آؤ!"

شاکرہ اپنی اماں جان کی آواز سن کر سیدھے سائبان کی طرف بھاگی۔ پھر اُسے اپنی ہیئت کا خیال آگیا۔ کوٹھڑی میں واپس آکر اُس نے اپنے کو درست کیا۔ تب اماں جان کے پاس گئی۔

"کیوں کیا کر رہی تھیں؟ کنواری لڑکیاں بھی بھلا اس طرح ہنستی ہیں۔"

میں 'راہ نجات' پڑھ رہی تھی اماں جان۔ خرگوش کے بچے میز پر چڑھنے کی کوشش میں گر گر پڑتے تھے۔ مجھے ہنسی آگئی۔"

"بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے۔ کنواری لڑکیوں کو شرم و حیا چاہیئے۔ اچھا ذرا کی ذرا خالہ بی کے لیئے فرنی تو نکال لو۔ کیوڑا اور پستے کی ہوائیاں دے دینا۔ دو انڈے بھی تل لینا۔ نعمت خانہ میں حلوا ہے وہ بھی لیتی آنا۔ جاؤ سلیقے سے ناشتہ کا سامان کرو — جلد — ہاں جاؤ!"

"جی اچھا اماں جان!" کہتی ہوئی شاکرہ باورچی خانہ کو نہایت ہی مؤدبانہ طور پر چل دی۔

خالہ بی کی آواز آئی ـــــ

"بہن، ماشاء اللہ تمھاری لڑکیاں البتہ باحیا باتمیز ہیں۔"

ـــــــــ ٭ ـــــــــ

"منظر وپس منظر"

۱۹۶۲ء

شادی کے تحفے

اس کا مجھ سے پردہ تو نہیں تھا۔ مگر میرے اور ثروت کے درمیان حجاب حائل تھا، گہرا حجاب۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس بات نے شرم میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ جیسے جھاڑیوں کے درمیان ہرن چھپ جائے اور پھر نمودار ہو، اسی طرح وہ سائبان میں چلتی پھرتی ہوئی، پایوں کی آڑ میں مجھے دیکھ کر روپوش ہو جاتی تھی اور کبھی دوڑ کر مچلتی ہوئی چوٹی کے ساتھ در و دیوار کی اوٹ میں غائب ہو جاتی۔ مَیں نے اسے بال سنوارتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے سیاہ گہرے بال بڑے پیارے تھے۔ گھنے اور شاداب جنگل کی طرح سکون آفریں۔ وہ اپنی کوٹھری کی چوکھٹ پر اندر کی جانب رُخ کئے نادان سی کھڑی ہو جاتی۔ اس کے آبشار نما بال اس کی پوری گردن اور بھری بھری پیٹھ پر اس طرح چھا جاتے، جیسے سنگ مرمر پر کائی جم گئی ہو۔ ثروت جانتی بھی تھی کہ مَیں کہیں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں، تو بھی وہ انجان بنی ہوئی دیر تک اپنی زلفوں کو اپنی نازک کمر کی طرح مچلنا اور بل کھانا سکھاتی رہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یک بیک پیچھے مُڑ کر دیکھتی، میری اس کی آنکھیں چار ہوتیں اور وہ شرماتی ہوئی، مُسکراہٹ کی کلیاں کھلاتی ہوئی ساون کی ہوا کی طرح لہرا کر روانہ ہو جاتی۔

ایک روز مَیں گھر کی لائبریری میں بیٹھا ہوا دل بہلانے کو اردو رسالے اور کتابیں اُلٹ پلٹ رہا تھا، محض دل بہلانے اور پریشانیوں سے دو گھڑی کے لئے نجات حاصل کرنے کو۔ مَیں دو سال سے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا۔ میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے اور اب بیکار رہنا میرے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ باپ اور سسر کی عنایتوں پر جیتے رہنا، دوسروں

کے نزدیک اگر باعثِ ننگ نہ بھی ہو تو بھی میری روح کے لیئے سوہان ضرور تھا۔ پھر باپ اور سسر بے چارے بھی کیا۔ وہ لوگ اپنے انتہائی خلوص کے باوجود بھی میری پوری مدد نہیں کر سکتے تھے، آج کل شرافت نبھانا بھی بہت کٹھن کام ہے۔ کالج کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کے بعد والد صاحب میں بھی اب اتنا دم کہاں تھا کہ وہ میری بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرتے رہتے۔ اور میرے سسر صاحب کو ابھی کئی اور لڑکیاں بیاہنی تھیں۔ غرض میں غمِ روزگار کی گتھیاں سلجھانی چاہ رہا تھا اور الجھنیں اور زیادہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ رسالوں اور کتابوں کے اوراق میں بے معنی طور پر اس طرح الٹ رہا تھا، جیسے خزاں کی ہوا باغ میں آم کے پتے ادھر اُدھر اُڑاتی پھر رہی ہو۔ میں دل ہی زندگی کا نشتر اور بیروزگاری کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ میرے جذبات کے دھارے بیزاری اور دشمنی کی موت سے ملے ہوئے تھے۔ میں اسی حال میں تھا کہ میں نے سائبان میں اُبلتی ہوئی شیریں زندگی کے قہقہے سنے۔ چند لڑکیاں گھنگھرو کی طرح کی ایک دوسرے سے اُلجھی ہوئی نغمہ آفریں تھیں۔ کچھ پیاری جھڑکیاں تھیں، کچھ فخر آمیز منت سماجت، کچھ حسین مسکراہٹیں، اور کچھ ایسی ادائیں جن میں رقص، نغمہ اور تصویر کا جمال ملا جلا پایا جاتا تھا۔

"دولہا بھائی ...... یہ ہے ثروت ...... آپ ہی دوڑ کر آجایئے نا ...... اری ثروت! تو نخرے کیوں کرتی ہے!" یہ نزہت کی آواز تھی۔

"اوں اوں ...... مجھے چھوڑ دو ...... میں بگڑ جاؤں گی۔" ثروت نے نخرے کیئے۔

"چل بھی بگڑنے والی آئی ہے! دولہا بھائی کو کتنی دیر سے اپنی کوٹھری سے اور یہاں آکر باتیں بناتی ہے۔" ثریا نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تو چڑ کیوں رہی ہوگی دولہا بھائی کو۔ واہ میں کیوں تکوں! ...... میں دولہا بھائی سے پردہ تھوڑا ہی کرتی ہوں۔" ثروت منمنائی۔

"تو پھر سیدھی ہو کر چلتی کیوں نہیں دولہا بھائی کے سامنے۔" ثریا بولی۔

"تو مجھے چھوڑ دے۔ میری چوٹی جو ہاں گئیں۔" ثروت نے ناز کیا۔

"لے چھوڑ دیا، اب آ! لائبریری میں دولہا بھائی بیٹھے ہیں ...... دولہا بھائی بھی تو عجیب اُلّو ہیں۔ دوڑ کر آ کیوں نہیں جاتے۔" نزہت اور ثریا نے ثروت کو چھوڑتے ہوئے ایک

ساتھ کہا۔ دوسری لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں..... ٹھیک اسی موقعہ پر میں لائبریری سے سائبان میں آ نکلا۔

"لو میں آگیا۔" میں نے کہا۔

چھپاک سے ثروت لڑکیوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگی۔ یہ گئی وہ گئی۔ مگر جاتے جاتے ایک دفعہ مُڑ کر پیچھے دیکھ ہی لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ لالہ گوں ہو رہا تھا۔ اس کا آنچل ناہموار تھا اور اس کی موٹی سی چوٹی آبرواں کے پلو میں الجھ کر کیچلی دار سیاہ ناگن کی طرح بل کھا گئی تھی۔ لڑکیاں عقد ثریا سے کہکشاں بن گئیں اور میں ایک شہاب ثاقب کی طرح ثروت کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ نہ معلوم میرے احساس کی تلخی اور بے کیفی یک بیک دور کیسے ہو گئی۔ ہم لوگوں نے ثروت کو اس کی کوٹھری میں پکڑ پایا اور اس کے بعد ثریا نے اسے فریب دہی کی خوب خوب سزا دی دیں۔ ثروت کو سزا ہوئی ہو یا نہیں۔ مگر مجھے تو دوڑ دھوپ کی فوری جزا مل گئی۔ میں نے ثروت کو جی بھر کے دیکھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بعد سے حجاب کُہرے کی طرح غائب ہو گیا اور اب ثروت مہرِ درخشاں کی طرح میرے سامنے آیا کرتی تھی۔

ثروت دن میں کئی بار میرے پاس آ کر بیٹھا کرتی اور کبھی میں خود اس کی کوٹھری میں جا نکلتا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اور میں اس سے کافی ہل مل گیا تھا۔ ثروت دیر دیر تک باتیں کرتی رہتی۔ معمولی معمولی سی باتیں، بیکار بیکار سی باتیں، مگر ان باتوں میں بڑا رس ہوتا، ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ادنیٰ سی باتیں بہت ہی ضروری ہیں۔ اُس کی آنکھیں بہت زیادہ خوب صورت نہ تھیں، مگر بڑی زندہ اور گویا آنکھیں تھیں۔ اُن میں گلابی گلابی نازک ڈورے رگ گُل کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ ان آنکھوں میں سکون پرور گہرائی تھی۔ میں اپنا درد و غم اس وسیلے ساگر میں غرق کر دیتا تھا مگر راکشش کی طرح اگر ایک غم کا سر کاٹ بھی لیا جائے تو اُس کے سینکڑوں شاخسانے نکل آتے ہیں۔ میں جب ثروت سے علیحدہ ہو جاتا تو غمِ روزگار کے ہزاروں آرے دل پر چلنے لگتے۔ لہٰذا میں کوشش کرتا کہ اکثر ثروت سے باتیں کروں اور اس کی تسکین بخش آنکھوں کے سایہ میں زندگی گذار دوں۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ثروت بھی مُجھ سے باتیں کر کے خوش ہوتی ہے۔ اُس کی حسین آنکھیں گفتگو کے وقت چمکنے لگتیں اور گلابی ڈوریاں سُرخ ہو

جاتیں۔ اثنائے گفتگو میں وہ یک بیک شرما بھی جاتی۔ اُس کے اچانک اظہارِ حیا میں ایک خاص
دل فریبی تھی۔

میری بیوی پردین بہت اچھی دلہن تھی۔ میں اسے بے حد چاہتا تھا اور وہ بھی مجھ سے
والہانہ محبت کرتی تھی۔ ہم لوگ اچھی اچھی باتیں بھی کرتے تھے اور بہت سے امور میں باہم مل کر
دلچسپی لیتے تھے مگر جب سے میری پریشانیوں کی سرحد نا امیدیوں سے جا ملی تھی، میں اپنی بیوی
سے آنکھیں چرانے لگا تھا۔ میں اس کے پاس یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ناکامیاب جیا ناہوں۔ اُس
کے قرب سے میرے وقار کو ٹھیس لگتی تھی۔ میں ناکارہ ہوں اور اپنی بیوی کی کفالت نہیں کر سکتا۔
یہ خیال مجھے ستانے لگتا تھا۔ میری بیوی میری اس سریع الحسی کو اپنی نسائی جبلت سے محسوس
کرتی تھی اور غمگسارانہ اندر ہی اندر گھلتی رہتی تھی۔ میں جب خوش نظر آتا تو وہ میری کمیاب خوشی
کا خیر مقدم کرتی۔ میں ایک دو سال سے اپنے سسرال میں تھا اور سسرال کے رشتہ داروں سے
کافی واقف ہوگیا تھا۔ اب کوئی انوکھا نہیں رہا تھا۔ سالے، سالیاں، سرہجیں سبھی روزانہ کی
چیزوں کی طرح پھیکی ہو چلی تھیں اور میری موجودہ مایوسانہ حالت میں تو کسی بات میں بھی مزہ
نہیں ملتا تھا۔ سیرِ دریا، شکار، صحبتِ احباب، نازنینانِ حرم کی چھیڑ چھاڑ، سب بے مزہ تھیں۔
لے دے کر اچھوتی ہوئی کتب بینی اور ادھوری مضمون نگاری رہ گئی تھی، میرا زیادہ وقت
لائبریری میں گذرتا تھا یا بستر پر۔

ثروت کو میں نے پہلے پہل دیکھا تھا۔ میں نے جانا کہ اس کا نیا پن شاید میرے لئے
سامانِ کشش ہے۔ ممکن ہے یہی ہو۔ مگر مزید تجزیۂ حالات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ثروت میں کچھ
ایسی باتیں بھی تھیں جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ مثلاً اس کی سادگی اور یک گونہ دیہاتی پن۔ ان
کے علاوہ چند اور ایسی معمولی خوبیاں جن کا اگر میں تذکرہ کروں تو آپ ہنس دیں گے کہ یہ باتیں
بھی سامانِ کشش ہوتی ہیں۔ مگر اکثر یہی ناقابلِ بیان چھوٹی چھوٹی باتیں ہی دل موہ لینے والی ہوتی
ہیں۔ ثروت حسین نہیں تھی لیکن اُس کی اداؤں میں انھیں چھوٹے چھوٹے، سادہ مگر چبھنے ہوئے
نشتروں کی ارزانی تھی۔

ثروت کی شادی کو اب گنے ہوئے چند دن رہ گئے تھے۔ مہمان آنے شروع ہو گئے

تھے۔ گھر میں زندگی اور شادمانی دوڑ گئی تھی۔ میں کہ زیادہ تر اپنا وقت الگ تھلگ ہی گذارا
کرتا تھا، اب حجرے سے باہر نکل آیا تھا۔ عام زن پسپیوں کی کشش سے نہیں بلکہ ثروت کی
جادو نگاہیوں کے اثر کے ماتحت ہم لوگوں کے درمیان ایک بہت ہی لطیف یگانگی کا احساس
تھا۔ آپ کہیں گے جنسیات۔ جی ہاں جنسیات مگر جنسی اپیل کی بہت سی سطحیں ہوتی ہیں۔ دنیا میں
کون سا جذبہ، کون سی خواہش ایسی ہے جس کا نفسیاتی تجزیہ آپ کو جنسیات تک نہ پہنچا دے۔
میں جیٹھ کے جھلسے ہوئے پودے کی طرح تھا۔ بارش کا ایک ننھا سا قطرہ بھی میرے لئے امرت
سے کم نہ تھا۔ عورت زندگی کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ اگر عورت کی فردوس بہ کنار نگاہوں
کے ایک گوشے میں بھی زندگی کی لڑائی سے تھکے ہوئے مرد کو تھوڑی سی جگہ مل جائے تو وہ اس
کے لئے نعمت سرمدی ہے۔ عورت کی صرف ایک نظرِ التفات، ایک ہلکی سی یگانگی، ایک حقیر سی توجہ
بھی کمھلائی زندگی کے لئے سامانِ شگفتگی ہے۔ مگر زندگی کے اتھاہ ساگر میں عورت کی مسکراہٹ بھی سورج
کی کرنوں کی طرح سطح سے تھوڑی ہی نیچے جا سکتی ہے۔ اس کے بعد تاریکیاں اور ایک سنجیدہ گہرائی۔
ثروت میرے لئے بہار کی ہوا کی طرح گذر جانے والی ایک لطیف و نازک لہر تھی جس نے
میرے احساسات کو گدگدایا اور بس، مگر دوسری لڑکیوں نے اس سے زیادہ کچھ محسوس کیا۔ میں
ان کے تخیل کو کیا کروں ـــ!

"ثروت بہت خوب صورت ہے دولہا بھائی؟" ایک دفعہ ایک لڑکی نے خاص
تیور سے دریافت کیا۔

ایک صاحب نے طنز سے فرمایا ـــ "نئی سالی کے سامنے پرانے لوگوں کو کون پوچھتا ہے"
میں ان سوالوں کا جواب کچھ اس طرح دیتا ـــ

"آپ لوگ شادی کے ہنگاموں میں الجھی ہوئی ہیں۔ بتایئے باتیں کس سے کروں ـــ
الٹی بات! آپ لوگوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے یا میں نے؟ ...."

میں نے لڑکیوں کو آپس میں بھی چہ میگوئیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری بیوی کو اس
چھیڑ چھاڑ میں بہت لطف آتا تھا۔ ایک دفعہ وہ کہنے لگی۔

"آپ کی سب سالیاں اور سرہجیں آپ سے بگڑی ہوئی ہیں۔ ثروت پر فقرے کسے

جاتے ہیں...... " میں ہنس دیتا۔

ثروت بھی اپنی بڑی بہن سے اکثر میری ہی باتیں کرتی۔ آج دولہا بھائی سے یہ باتیں ہوئیں۔ آج انھوں نے یہ کہا، آج یہ ہوا وہ ہوا۔

"تو دولہا بھائی کے لئے پاگل ہو رہی ہے...... " ریحانہ ٹالتی ہوئی مسکرا کر کہتی۔

"نہیں دولہا بھائی بہت اچھے ہیں آپا۔ آپ تو ان سے ناحق پردہ کرتی ہیں۔ وہ بڑے ملنسار ہیں۔ اندر بھر باتیں کتنی بناتی جانتے ہیں"......

"سو فتح ہو پھر اپنے دولہا بھائی کے پاس۔ مجھے کام کرنے دے۔ ابھی درجنوں شلوکے پر گوٹ ٹانکنے کو پڑے ہیں۔ اور اس ہفتہ میں تیری برات آ رہی ہے۔" ریحانہ آپا ثروت کو جھوٹ کے غصے کے ساتھ جواب دیتیں۔

ثروت کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ اب اس سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا۔ پھر بھی شام کو جب لڑکیاں اور مہمان بی بیاں دوسری انگنائی میں گیت گانے میں مشغول ہو جاتیں تو ثروت اپنی بڑی بہن کے لڑکے کو بھیج کر مجھے مردانہ سے پختہ آنگن میں بلوا بھیجتی اور کہتی کہ ہر شخص مشغول ہے، اکیلے طبیعت نہیں لگتی، باتیں کیجیے۔

ثروت کی شادی کے دن بہت ہی قریب آ گئے۔ ایک روز میری بیوی نے رکتے رکتے کہا۔ "سبھی رشتے دار عورتیں مانجا دے رہی ہیں۔ میں تو خیر اپنی ہی کوئی نئی ساری اور دوسرے کپڑے دے دوں گی...... مگر مردعزیز بھی تو ثروت کو شادی کے تحفے دیں گے......" اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور میرے سامنے تاریکیوں کے حلقے مگر مچھ کے کھلے ہوئے جبڑے کی طرح نظر آنے لگے...

میں فوراً اپنی بیوی کے پاس سے اٹھ کر چلا آیا۔ اور اس روز سارا دن چڑچڑا رہا۔ دو تین بار لوگوں سے معمولی معمولی باتوں کے لئے الجھ پڑا۔ خارجی حالت کے کھردرے پن سے زیادہ میری داخلی کیفیت متلاطم ہو رہی تھی۔ عین نخلستان کے اندر دم لیتے ہوئے میں نے بادِ سموم کی ایک تیز لپیٹ محسوس کی۔

اب ثروت کا خیال بھی میرے لئے محرومیوں اور ناکامیوں کا اشارہ تھا۔ اُف! بیسویں صدی کا نوجوان کتنی تمنائیں، کتنے ارمان اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اُن میں سے اکثر آرزوئیں

گھُٹ گھُٹ کر دم توڑتی جاتی ہیں اور جو پوری بھی ہوتی ہیں وہ کچلا کچلا کر اور مسلا مسلا کر پوری ہوتی ہیں۔ میں دن بھر ایک وحشی بن جانے کی خواہش میں گھُلتا، کھولتا، پگھلتا اور منجمد ہوتا رہا۔ مَیں سوچتا تھا کہ اگر جائز تمناؤں کے گرد بھی زنجیروں پڑی ہوئی ہیں، اگر معصوم خواہشوں کی گردن میں بھاری بھاری سلیں ہوں تو پھر دنیا کسی ستارہ تخریب سے ٹکرا کیوں نہیں جاتی۔ زلزلہ صرف بہار اور کوئٹہ میں کیوں آتا ہے، سارے عالم میں یک بیک زلزلہ کیوں نہیں آجاتا۔"

شام کو ثروت کا بلاوا آیا۔ مَیں نہیں گیا۔ اُس نے کئی بار بلوا بھیجا۔ مَیں نے ہر بار انکار کیا۔ رات کو مجھے نیند بہت دیر میں آئی اور جب آئی بھی تو خیالات کو بہت بھیانک روپ دیتی ہوئی آئی۔ دوسرے دن میرے سر میں درد تھا اور دل و روح میں اُس سے زیادہ۔ دن کو ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد والد صاحب کا کارڈ ملا جس میں انھوں نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا تھا۔ اب میری نا اُمیدی مکمل ہو گئی اور شادی کے تختہ کا خیال ہزاروں آرزوؤں کے ساتھ مدفون ہو گیا۔ دوپہر اور سہ پہر کو مَیں علم کے ستاروں کا تصویری البم دیکھتا رہا۔ ایک ایک ستارے کی نوک پلک کا بہت ہی گہرا جائزہ لیا اور آج ایک ایسے صاحب سے اُس کے متعلق تبادلۂ خیال کیا جن کو مَیں کبھی مُنہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس شام کو مَیں غیر معمولی طور پر خوش و خرم اور ہنسوڑ تھا۔ یہاں تک کہ میں نے بذلہ سنجی کے علاوہ سوقیانہ مذاق کو روا ہی نہیں رکھا بلکہ اُس کی بہتات کر دی۔

سرِ شام ثروت نے کہلا بھیجا کہ آج بھی نہیں آیئے گا؟ آسمان پر تارے جھلکے، اور زنان خانہ سے گیتوں کی جھنکار اُٹھی۔ مَیں ثروت سے ملنے چلا۔ اب وہ کوٹھری میں مایوں بیٹھی تھی۔ مستقل طور پر مَیں کوٹھری میں داخل ہوا اور ذرا جھجکا۔ ثروت کے پہلو سے پیوند ایک نئی کمسن سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

"آیئے دولہا بھائی! یہ میری عمیری بہن فرحت ہے۔ آپ کو دیکھنے کو دیر سے بیٹھی ہے۔" ثروت نے مجھے جھجکتا دیکھ کر کہا۔

"بہت خوب! مَیں حاضر ہوں۔ دیکھئے فرحت صاحبہ مجھے!" مَیں نے مسکراتے ہوئے ذرا شوخی کی اور فرحت سے قریب پلنگ پر بیٹھ رہا۔ فرحت ثروت کے دوسرے پہلو کی طرف

جا کر چمٹ گئی۔

"کیوں دولہا بھائی! کل تو آپ بہت خفا تھے۔ فرحت کل ہی آئی ہے اور کل ہی سے آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہے" ثروت نے اپنی مدھ بھری آنکھوں کا رس میری آنکھوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"فرحت مجھے کیا جانیں؟" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"اور میں جو جانتی ہوں آپ کو!" ثروت نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ فتنہ آپ کا پھیلایا ہوا ہے؟" میں نے احساس پندار کے ساتھ کہا۔

"آپ لوگ ابھی سے مجھے بھلا رہے ہیں؟ کل آپ کو کتنی دفعہ بلایا تھا۔ آپ نے ہر بار مایوس کیا......" ثروت کی آنکھوں کے سمندر میں موتی چمکنے لگے۔ شادی کے دنوں میں ایک ہندستانی لڑکی موم کی طرح پگھلی رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں اگر میکے کی محبت میں ہر وقت ساون بھادوں کا سماں نہ بھی پیش کریں تو ان کی لامحدود وسعتوں میں بن برسے ہوئے بادل ہر گھڑی مچلتے ضرور رہتے ہیں۔

"ثروت تم رونے لگیں! کل میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ اس لئے نہ آیا۔" میں نے ثروت کو چُپ کراتے ہوئے کہا۔ ثروت کچھ دیر تک روتی رہی......

"تو میں چلا ثروت! میں باتیں کرنے آیا ہوں اور تم رو رہی ہو......؟" میں نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے جھوٹ موٹ کی دھمکی دی۔ ثروت نے آنسو پونچھ ڈالے اور چُپ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بہت سی دل چسپ باتیں کیں اور خوب خوب ہنسی رہی۔

ثروت ڈھیلے ڈھالے جوگیا رنگ کے کپڑے میں ملبوس شفق کی دیوی معلوم ہو رہی تھی، اور اس کا کاہیدہ چہرہ شفق بہ کنار ہلال کی نزاکتوں کا آئینہ دار تھا۔ اس کے کھلے ہوئے بال کی لٹیں اس کے سینہ و شانہ پر اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے افق رنگین پر سرمئی بادل کے ٹکڑے ایک خوابناک فضا پیدا کر رہے ہوں۔ وہ اُبٹنے کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ کُسم اور بیلے کے پھول کی مہک کے ساتھ زعفران کی خوشبو مشام جان کو معطر کر رہی تھی۔

"تم انار کلی کو شرما رہی ہو ثروت!" میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بھی میں انار کلی بنا دوں۔" یہ کہتے ہوئے ثروت نے بہت سا اُبٹنا میرے چہرے پر مل دیا۔ اس کی آنکھوں میں جرأت طلب شرارت مچل رہی تھی۔ میں دعوتِ نگاہ کو قبول کر کے بدلا لینا ہی چاہتا تھا کہ ایک چھپاکے نے مجھے بے وقوف سا بنا دیا تھا۔ فرحت نے مجھ پر رنگ کی بے پناہ بوچھار کی تھی۔ میں شرابور ہو گیا اور کچھ اس ناگفتہ بہ انداز میں کہ فوراً ہی مردانے کی طرف بھاگا۔

دوسرے روز ثروت کی برات آگئی۔ گھر باہر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف لباس و زینت کی نمائش ہو رہی تھی۔ زنان خانے میں دن کو ہر سُو قوسِ قزح کے رنگوں اور رطائے سانہ اداؤں کی دل فریبیاں ناز فرما رہی تھیں۔ نوجوان تیتریاں گھڑی گھڑی لباس تبدیل کر کے اپنی ہوا باندھ رہی تھیں۔ رات آتے ہی گھر کا گھر سلمیٰ ستارہ کی زرکار ساریوں سے رو کش کہکشاں بن گیا۔ ہر نوخیز پھلجھڑی تھی، ہر جوان لڑکی چھٹتا ہوا انار، اور ہر عورت ہتابی۔ میں اس رنگ و نور کی جلوہ سامانی کے دیکھنے میں محو تھا کہ ایک گوشہ میں میری بیوی سُست اور مضمحل کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ پایہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اب یہ جلوے میرے لئے جلوۂ طور نہ تھے بلکہ آتشِ نمرود تھے۔ میری بیوی صبح سے اُسی ایک لباس میں تھی۔ کاسنی رنگ کی کامدانی کی ایک پرانی ساڑی۔ اس کی گرگابی بھی بہت ہی مفلوک الحال تھی۔ اس کی ہمجولیاں کپڑے پر کپڑے بدل رہی تھیں۔ اور یہ پرانی کتاب کی جلد کی طرح بے رونق معلوم ہو رہی تھی۔

اُف! میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور فوراً گھر کے ایک دور افتادہ گوشے میں جا کر کھُری پلنگ پر لیٹ رہا۔ یہ بڑی پُر رونق رات تھی۔ مگر میں کسی تقریب میں شریک نہ ہوا اور رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں ایک روح فرسا بے احساسی کے عالم میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن پر ایک سرد تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دل ایک خاموش اذیت، ایک افسردہ درد محسوس کر رہا تھا۔

صُبح ہوئی۔ آج ثروت رخصت ہونے والی تھی۔ دس بجے تک مرد عزیز اپنے تحائف

کے ساتھ اُس سے ملنے زنان خانہ میں گئے، مَیں نہ گیا۔ میرے پاس کیا تھا؟ غم، وحشت، اور احساس ناداری کا تحفہ!

ثروت رخصت ہوگئی اور پانچویں دن سُنا کہ واپس بھی آگئی۔ یہ پانچ دن کس طرح بیتے ہیں، مَیں نہیں بتا سکتا۔ ثروت سے چھوٹنے کا غم؟ جی نہیں، مَیں تو یہ چاہتا تھا کہ ثروت واپس ہی نہ آئے۔ مَیں اُس سے آنکھیں چار کرنی ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر ثروت آئی۔

شاید ثروت نے سسرال سے واپس آتے کے ساتھ ہی مجھے بلا بھیجا تھا۔ مگر مَیں ایک ہفتہ تک اُس سے نہیں ملا۔ خدا جانے کیونکر مَیں خود بہ خود ایک مرتبہ ملنے چلا گیا۔ وہ اپنے عروسی کمرے میں چیزوں کی درستگی میں مشغول تھی۔

"اللہ! آپ آخر آ گئے ملنے مجھ بد نصیب سے دولہا بھائی!" ثروت نے شکوہ سنجانہ مسرت کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔

"خدا نہ کرے تم بد نصیب ہو؟ بد نصیب تو مَیں ہوں ثروت!" مَیں نے جواب دیا۔

"آپ کیوں خفا ہیں مجھ سے دولہا بھائی؟ آپ مجھے رخصت کرنے بھی نہیں آئے تھے۔ مَیں مجمع میں آپ کی آواز کی منتظر تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ مگر جی چاہتا تھا کہ آنکھیں کھول کر دیکھوں کہ آپ ہیں یا نہیں۔" ثروت نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"کوئی وجہ نہیں۔ یونہی مَیں نہیں آیا۔ یونہی ثروت ــــ مجھے خود معلوم نہیں مَیں کیوں نہیں آیا......" مَیں چاہتا تھا کہ اس بارے میں باتیں نہ ہوں۔

"سُناؤ شادی کا تجربہ کیسا رہا۔ نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی، اچھے لوگ تھے؟" مَیں نے موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ سے اچھے نہیں!" اُس نے ایک پُر معنی حجاب کے ساتھ جواب دیا۔

"آیئے دولہا بھائی آپ کو چیزیں دکھلاؤں۔ میرے مصرف کی چیزیں سب میرے ساتھ واپس چلی آئی ہیں۔ دولہا بھائی غیر جگہ عزیزوں کی دی ہوئی چیزیں بھی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ ہر تحفہ مجھے عزیزوں کی یاد دلا رہا تھا۔ مگر مَیں اکثر دیکھ دیکھ کر روتی تھی...... آپ مجھے بے وقوف کہیں گے، ہے نا؟ مَیں آپ کو ہر وقت یاد کرتی تھی۔ آپ مجھے یاد کرتے تھے۔"

ثروت آج اتنی بہت سی باتیں کر رہی تھی اور میری زبان پر مہر سی لگی ہوئی تھی۔ "بولتے کیوں نہیں آپ؟ یہ دیکھئے! یہ سنگار بکس احمد بھائی نے دیا ہے۔ یہ ہے ان کا نام لکھا ہوا، اچھا سا ہے نا؟" میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بکس سے دوسری چیزیں نکالنے لگی۔

"دیکھئے اس بکس میں سلائی کا سٹ ہے اور اس میں کروشیا اور کشیدہ کاری کے کام کا سامان۔ اور یہ دیکھئے یہ کشیدہ کاری کی مشین ہے...... دولہا بھائی! سب نے اپنا اپنا نام چھوٹے چھوٹے کارڈ پر لکھ کر لٹکا دیا ہے...... یہ ایرنگ رہی دولہا بھائی! یہ محمود بھائی کی دی ہوئی ہے...... اور یہ دیکھئے! اُف میں تھک گئی! کتنی ساری چیزیں ہیں...... وہ تو بکس کی تہہ میں ہے...... ایرنگ ہے نا بہت پیاری سی؟...... میں آپ کو ایک اور بہت ہی اچھی سی چیز دکھلاتی ہوں......" ثروت اپنا ایک بکس اُلٹ پلٹ رہی تھی اور میں اپنے تخیل کے تاریک خلا میں ارمانوں کی لاشوں کو دانت نکالے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تحفہ! تحفہ!...... زندگی کے ہاتھ میں موت کا تحفہ...... سرمایہ کے ہاتھ میں بیکاری اور ناداری کا تحفہ، سماج کے ہاتھ میں فخر بیجا کا تحفہ، ملّایانہ مذہب کے ہاتھ میں غلط تسکین کا تحفہ...... تحفہ! تحفہ! محبت کے ہاتھ میں نفرت کا تحفہ...... "یہ دیکھئے مل گیا دولہا بھائی، کتنا قیمتی نکلس ہے، ہے نا؟ مجھے لوگ کتنا چاہتے ہیں؟" ثروت کی آنکھوں میں مسرت اور غرور کی چمک تھی۔ میں اس وقت ثروت کی آنکھوں سے نفرت کر رہا تھا۔ ان کی چمک خنجر کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ اور ان کے سُرخ ڈورے خنجر کے پھل پر جما ہوا خون۔

"کیوں دولہا بھائی آپ کی کیا حالت ہے؟" ثروت نے چونک کر کہا۔ "کچھ......" میری زبان نہ کھل سکی۔ دل میں شدید درد و کرب کا احساس ہوا۔ سینہ کا آتش فشاں آنکھوں کے شگاف سے پگھلے ہوئے لاوے کی طرح آنسو بن کر اُمڈ آیا تھا۔ میں اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کو ثروت کی نظروں سے بچا کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ دروازے پہنچ کر میرے آنسو اُبل آئے اور چوکھٹ کی خاک میں چند قطرہ ہائے اشک مدفون ہو گئے۔

یہ تھے میرے تحفے۔ انھیں بھی میں ثروت کے سامنے پیش نہ کر سکا۔

شکور دادا

"نیم شبوئے نثر توا تو چہ گفتی رے ا نیم شبے نثر توا ...."

شکور دادا اپنی مخصوص بذلہ سنجانہ ترنگ میں نہ جانے کس فارسی منتر اور گونجی زبان میں گنگناتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کرامت بابو کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے آتے ہی کرامت بابو سے مذاق کیا۔ ان کے لڑکے اور ان کے بھتیجوں سے مذاق کیا اور اسی انداز میں انھوں نے براہموں اور دوسرے ملازموں سے بھی کچھ چھیڑ اور چہل کی۔ "کیا بات ہے کرامت ناتی کی! ہیں ہیں ہیں۔ واہ منور پوتا! کچھ پڑھو لکھو ہو یا پٹنہ میں خالی باپ دادا کا نام اونچا کردہو؟... ...بابو گھوگھن سنگھ، منیجر بابو کرامت حسین کردو سب کو لیپ پوت کے برابر، میرا بیٹا کھیت کو نقدی کردیونا آخر...... اچھا لیہو ملگذاری ...... ہیں ہیں ہیں ...... ہیں۔ کا کرے ہے رے چندوا ...... خوب جڑا جڑا کے پی جائے ...... اور اسی بخشے خدا، خدا بخش، بابو کرامت حسین، رئیس و زمیندار کے نئے جوڑا کپڑا پر ہاتھ مارے؟ ......" ایک حملۂ رندانہ میں سب کو نوازتے اور مسوڑھوں تک دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے شکور دادا بنگلے کے اس سرے سے اُس سرے تک گذر گئے۔ لڑکوں نے شکور دادا کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا......

"دادا تاش کھیلیے گا؟ کالی ناگن، آیئے دادا تاش کھیلیے! ......"

"ہاں شکور دادا تاش! چائے بھی پیجیے گا؟ چندوا چائے بناؤ دادا کے لئے ....!"

شکور دادا کو دیکھ کر سبھوں کے چہروں پر بشاشت سی کھیل گئی اور دادا سائبان میں ٹہل ٹہل کر بائیں تلہتھ میں داہنے انگوٹھے سے کھینی مل رہے تھے۔

شکور دادا پچاس سال سے اونچی عمر کے درمیانہ قد شخص تھے ، سُرخ گندمی رنگ ، سفید سی چھوٹی ڈاڑھی جس میں چند سیاہ بال ماضی کی دُھندلی دُھندلی سی یاد کی طرح نمایاں ہونے کے لئے لرز رہے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دادا کے چہرے پر مٹے مٹے چیچک کے داغ بھی ہوں ۔ اُن کے کان بہت پھیلے ہوئے اور بڑے سے تھے ، جن کے اندر بالوں کے چھدرے چھدرے گچھے اُگے ہوئے تھے ۔ بلند پیشانی ، اُڑے اُڑے سے سر کے بال اور سر کے وسط میں ایک چوکور سا حصّہ اُسترے سے بالکل گُھٹا ہوا ۔ شکور دادا خود کہتے تھے کہ یہ تجربے کی برآمد کے لئے ہے ۔ سر کے حقیقی محاذ پر دوپلی ہمیشہ چپکی رہتی تھی ۔ دادا اکثر تحریر دار کُرتا پہنا کرتے اور دھوتی باندھتے تھے ۔ پاؤں میں چمرودھ دہقانی جوتا ، جس کا مصرف پاؤں کو آرام دینا نہیں ، بلکہ بستی پر رُعب ڈالنا ہوتا ۔ شکور دادا کو گاؤں کے اکثر لوگ دادا کہتے تھے ۔ اور ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے سے مذاق ، دل لگی کر لیا کرتے تھے ۔ فرقِ مراتب کے لحاظ سے وہ کسی کو مزاحیہ طور پر پوتا کہہ دیتے ، کسی کو ناتی کہکر پکارتے اور اپنے ہم سِنوں کی بیویوں سے بھی غائبانہ تفریح فرمایا کرتے تھے ۔ دادا کے مذاق و تفریح میں کوئی تنوع نہیں پایا جاتا تھا ۔ وہ ہر شخص سے قریباً ایک ہی طرح کا بندھا ٹِکا مذاق اکثر فرمایا کرتے تھے ۔ دادا کو فارسی اشعار غلط سلط پڑھنے کا خاصا شوق تھا اور ہندی دوہے وہ بلا تکلف الاپتے تھے مگر درمیانے سُر میں ۔ شکور دادا ، سُنا جاتا ہے کہ اپنی جوانی کے دنوں میں بہت ہی رنگین مزاج بانکے تھے ۔ آدھی کے ململ کا کُرتہ ، تختیا پار کی شفاف اُجلی دھوتی اور رابرٹ شو پہن کر وہ گلبدن لونڈی سے اظہارِ تمنا فرمانے مسماۃ کریمن کے گھر جایا کرتے تھے ۔ شہر جا کر گلبدن اور اس کی مالکہ مسماۃ کریمن کے لئے آبِ رواں کے تھان ، گردن بوندے ، چھینٹ ، بلبل ٹین وغیرہ ، سندری سہاگ تیل ، کنگھی ، آئینہ اور ایک بڑے سے دونے میں گلاب جامن لایا کرتے تھے ۔ مگر وہ جب کی بات ہے جب آتش جوان تھا ۔ اب تو صرف شکور دادا آنکھوں میں باضابطہ سُرمہ لگاتے ، بھولی بسری غزلوں کے ٹوٹے پھوٹے اشعار کبھی کبھار گاتے اور حویلیوں کی آڑ میں اور جوان لونڈیوں سے فحش مذاق کر کے ماضی کو زندہ کرنے کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے ۔ دادا نے اپنی پُرکار اور مشغول جوانی کے اختتامی حاشیہ کو ایک عدد

نوجوان گھر والی سے بچالیا تھا جس نے دادا کا ساتھ شباب کی سرحد گذر جانے کے بعد بڑھاپے کی اقلیم میں بھی دیا۔ دادی بڑی ہی خاشعار بیوی اور نہایت ہی سلیقہ مند، کفایت پسند اہلِ خانہ تھیں، ان کی برکت سے شکور دادا کے گھر میں فارغ البالی پیدا ہوگئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دادا کی فطرت میں کفایت شعاری اور ترقی کی خواہش نے گھر کر لیا تھا۔ صحبت کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔

شکور دادا کی جوانی کی رنگینی بڑھاپے کی خوش دلی کی صورت میں اب تک قائم تھی وہ ہر مجلس میں نیم مسخری اور نیم سنجیدگی کا لبادہ پہن کر شرکت کرتے اور سبھوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ وہ ارادتاً بے وقوف بنتے۔ اس میں انھیں لطف آتا تھا۔ ان کی سیاست میں مقبول پذیر بننے کا یہ ایک کامیاب طریقہ تھا۔ مگر وہ نرا احمق اور محض سوڑھن بننا پسند نہ کرتے تھے، اس طرح ان کے جذبہ تفوق کو صدمہ پہنچتا۔ لہذا وہ لوگوں پر خوب خوب جملہ بازیاں کرتے تھے، پھبتیاں کستے اور مزے مزے کی چٹکیاں بھی لیتے تھے۔ ہاں ان کی ہوشیاری اور دور بینی اس امر سے صاف ظاہر ہوتی تھی کہ وہ بستی کے رئیسوں کا مذاق کم اڑاتے تھے اور ان کے فقروں کو کامیاب بنانے کی خاطر خود ہی بے وقوف بن جاتے تھے۔ دادا کا مذاق یا ان کی بولی کسی شخص کے لئے بھی کبھی تیکھی نہ ہوتی۔ ان کی باتیں اتنی جانچ تول کے ہوتی تھیں کہ طنز کی شکل میں بھی وہ ناگوار نہ ہونے پاتی تھیں۔ اس روک تھام اور کتر بیونت کا نتیجہ تھا کہ ان کی بذلہ سنجی میں پیچ اور روانگی کبھی پیدا نہ ہوئی۔ کبھی کبھی تو ان کی ظرافت اکتا دینے والی بھی ہو جاتی تھی، مگر چونکہ گاؤں میں اونچے اور درمیانی طبقہ والوں کے پاس وقت فاضل رہتا ہے اور تفریحات و دلچسپ مشاغل کم، لہذا ایسے ماحول میں تھوڑی سی زندہ دلی کے آثار بھی بہت ہوتے ہیں۔ غرض بستی میں شکور دادا کی ذات بسا غنیمت تھی۔ دادا کی سُننا اور ان کو سُنانا دیہات کی ساکت فضا میں ایک خوش گوار تموج پیدا کر دیتا تھا۔ دادا کی بھونڈی قلقاریاں ان کی پیر نابالغ کی سی حرکتیں صرف دیہاتیوں کے لئے نہیں بلکہ کالج کے ان لڑکوں کے لئے بھی پسندیدہ ہوتی تھیں جو لمبی تعطیل گذارنے اپنے گاؤں کو آیا کرتے تھے۔

شکور دادا سویرے سویرے بابو کرامت حسین کے بنگلے پر آیا کرتے تھے۔ پوجا کی چھٹیوں

میں کرامت بابو کے لڑکے اور بھتیجے شہر سے گھر آئے ہوئے تھے - دادا کو دیکھ کر سبھوں نے اظہار پذیرائی کی - دادا کو بھی اپنی اہمیت وافادیت کا ایک خوش گوار سا احساس ہوا، ان کی باچھیں کھل گئیں - تاش کھیلنے کی دعوت کو انھوں نے ہنستے ہوئے نہایت ہوشیارانہ چاشنی دار انداز میں رد کیا - دادا کی یہ چال محض لڑکوں کے شوق کو بھڑکانے کے لئے تھی - تھوڑی سی منت سماجت کے بعد شکور دادا تاش کھیلنے پر راضی ہو گئے - اب بحث یہ آن پڑی کہ دادا کہتے تھے کہ کورٹ پیس کھیلیں گے اور لڑکے اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے - ان کی تو یہ خواہش تھی کہ "کالی ناگن" چلے - دادا پر کالا پان کی بیگم لادنے میں مزہ کتنا آتا تھا - دادا اڑ گئے -
"نہیں ! بھائی نہیں ! تم سب بے ایمان ہو - کورٹ پیس یا گیم ، میں ہم اکیلے نہیں رہیں گے .... خوب سمجھتے ہیں ہم ، ہیں ہیں ہیں ، ہا ہا ہا ، کھا کھا کھا " دادا نے تمباکو کے مارے ہوئے گندے دانتوں اور پھولے پھولے مسوڑھوں کو ان کی انتہائی سرحدوں تک نمایاں کرتے ہوئے ایک معاملہ سنج قہقہہ بلند کیا - یہ سب دادا کی ہوٹ تھی - لڑکوں کے متوقع لطف میں اضافہ ہو رہا تھا ، جب دادا مان جائیں گے اور ان کے سامنے لال پان کے نمبروں کا ڈھیر ہو گا اور سب پر طرہ کالی ناگن ، تو دادا کیسا کیسا بگڑیں گے - یہ تصور کر کے لڑکے مستقبل کی خوشی کے خیال ہی سے بے چین سے ہو گئے اور دادا کی بہت بہت سی خوشامدیں ہوئیں - انھیں کئی پیالیاں چائے کی پلائی گئیں - لب دوز ، لب سوز ، خوب شیریں ، بھینس کے گھریلو دودھ کی موٹی بالائی ڈال کر ، شکور دادا بڑے ہوشیار تھے ، چائے پی پلا کر وہ راضی ہوئے ، جیسے وہ بڑا ایثار کر رہے ہوں ، اور جو چلی ہے تاش کی بازی تو پھر شکور دادا بل ہی تو گئے ، ایسا منہمک ہوئے وہ کہ لڑکوں نے سمجھا کہ دادا بڑے زبردست مدمقابل ہیں اور ان کو ہرانے میں ہیجان و ولولہ زیادہ ہو گا -
شکور دادا خوب چوکس تھے - بات بات پر وہ ٹوکتے ، اعتراض و احتجاج کرتے اور درمیان میں اٹھ جانے کی دھمکی بھی دیتے جاتے تھے - لال پان کے نمبر تو خیر ، سیاہ پان کی بیگم آتے ہی دادا نے زبردست احتجاج کیا - لڑکوں نے بھی اودھم مچائی اور پھر کھیل شروع ہو گیا - کرامت بابو فرش پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے ، یہ ہنگامہ اور بچوں کی خوشی دیکھ کر ان کا دل بھی خوش ہو رہا تھا - سائبان کے ایک گوشے میں پیتل کا بڑا سماور خوش آئند شائیں شائیں سے فضا کو آباد

کر رہا تھا۔ چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ چائے کا دَور چل رہا تھا، جب شکور دادا دوسری بار بھی ہارے تو انھوں نے اپنے قبلۂ مقصود بابو کرامت حسین کو مخاطب کر کے خندہ آفریں واویلا بپا کیا "دیکھو ہو بابو...... بول نہ رہے ناتی۔ خالی اخبار پڑھو ہو۔ ارے ناتی۔ لڑکن سب سیٹنگ کر کے میرے پر کالی ناگن لادیں ہیں۔ ہم نہیں کھیلیں گے اب۔ نا بھائی اب نہیں......"

"ارے کیا ہوا شکور میاں؟ ہار رہے ہو تو لڑکوں پر الزام رکھتے ہو۔" کرامت بابو نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"ہوں ناتی۔ ہم ہار رہے ہیں۔ ارے لڑکن سب بڑا بدمعاش ہے سب" شکور دادا نے قلقاریاں مارتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے اِدھر آکے بیٹھو، دُم کٹا کے بچھڑوں میں کیا ملتے ہو!"

"چھوڑے اِی سب جان تب نے جی! جب سنو، شکور دادا، شکور دادا۔ اچھا لڑکن سب کا بہلا وا ہی سہی...... نیم شبے شر قوا تو چہ گفتی توجہ گفتی رے۔ نیم شبے......"

شکور دادا نے بڑی بشاشت سے گانا شروع کیا۔ لڑکوں نے تاش پھینٹ کر بانٹ دیا اور بازی پھر چلنے لگی۔ گرما گرم، آخر میں گیم شکور دادا پر ہی ختم ہوا اور خوب ہُڑ مچی۔ دادا بہت ناچے کودے اور لڑکے ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ بابو کرامت بھی خندہ ریز ہوئے۔ اس دل نشیں تمہید کے بعد شکور دادا نے بابو کرامت سے ربیع کے کسی گوئڑھے کھیت کے اپنے نام سے بندوبست کئے جانے کی ظرافت آمیز سنجیدگی کے ساتھ درخواست کی۔ دادا کی یہ بذلہ سنجانہ ہوشیاری رائیگاں نہیں گئی۔ آسن میں ربیع کے کھیتوں کا بندوبست ہوتا ہے۔ دادا اپنے رسوخ سے فائدہ اُٹھا کر مالکان سے اچھے اچھے کھیت بندوبست لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بیں دھان کے کھیتوں کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ اپنے نام سے کھیت لینے کے بعد شکور دادا اور زیادہ شرح پر انھیں ان رعیتوں کے نام بندوبست کر دیا کرتے تھے جن کی پہنچ گاؤں کے بھگوانوں تک مشکل تھی۔ یہ نارسا و نادار کسان دادا کے منجیرے تھے۔ دادا ان سے صرف کڑی شرح پر کھیت ہی نہیں لگاتے تھے بلکہ وہ ان فاقہ مستوں کو ڈیوڑھے اور دوائے پر بیج بھی مہیا کر دیتے تھے۔ ان کی وصولی کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ یہ ہنسا ہنسا کر کام چلانے کے اصول کے قائل اور

اس پر عامل تھے۔ دادا گاؤں کے چوپال پر چارکرسی کے کھلنڈروں اور تھکے تھکائے کسانوں کے ساتھ دُو دُو ہاتھ چکیسی بھی کھیل لیا کرتے تھے۔ کلکتہ سے ناکام واپس آئے ہوئے یا فضول خرچی سیکھ کر آنے والے لونڈوں کے ساتھ تاش کی بازیاں بھی کسی بنیے کی دُکان کے سامنے جم جاتی تھیں۔ ان منڈلیوں میں بھی شکور دادا کی ہنسی، دل لگی، چھیڑ چھاڑ اور بھونڈی مگر غیر دل آزار پھبتیاں اس طرح چلتی رہتی تھیں جیسے کسی بھڑ بھونجے کی دُکان میں مکئی کا لاوا چٹک چٹک کر کھل رہا ہو۔ اس حلقہ میں دادا اپنی بذلہ سنجی کا حربہ بہت ہی کامیاب ہوشیاری کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ شکور دادا کی ذات ہر سبھا کے لئے شوبھا تھی۔ دادا دلوں کو نرم کر کے انھیں سیّال بنا دیتے تھے۔ اسی بہاؤ میں ان کے روپے وصول ہو جاتے، جیسے ٹین کے کنستر کا گھی دھوپ میں برما کر آسانی سے باہر نکال لیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مٹیجروں کے طبقہ کی عورتوں کے دل بھی اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے روپوں کے بٹوے بھی دادا کے قبضے میں رہیں۔ کسی کو وہ بھوجی کہتے، کسی کو بیٹی، کوئی ان کی بہو تھی کوئی ان کی بہن، غرض شکور دادا کے لگائے ہوئے بیج کا سُود اور کھیت کا لگان عموماً وصول ہو جایا کرتے تھے۔ جو کڑے اسامی ہوتے، اکھڑ، فسادی، نامہذب اور جن کا دل دادا کی چاپلوسی اور بھونڈے پن سے پگھلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ دادا ان کی خبر کسی بلاواسطہ جارحانہ کارروائی سے کبھی نہیں لیتے تھے۔ یہ ان کی سیاست کی تکنیک کے خلاف تھا اور یہ تکنیک دادا کی سیرت کی اک نفسی خصوصیت سے پیدا ہوئی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ ذرا جرأت کو جھگڑالو پن سمجھتے تھے۔ مرنجان مرنج، نرم طبیعت کے آدمی تھے۔ ہنستا ہنسانا، تُو تُو مَیں مَیں سے کہیں زیادہ شریفانہ اور مہذب فعل ہے۔ گاؤں کے بعض لوگ شکور دادا کو بودا بھی سمجھتے تھے۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ لیکن شکور دادا نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ مروّت کے قائل نہیں تھے اور نامہذب لڑاکوں کو تسخیر کرنے کا عمل بھی جانتے تھے۔ گاؤں کے رئیسوں کے ساتھ تاش کی بازیاں ہار ہار کر دادا ان کے اثر و اقتدار کو جیت لیتے تھے۔ یہ تھا ان کا اسمِ اعظم۔ کھیت بھی سستے لگان پر ملیں اور وصولی میں بھی سہولت ہو۔ دادا کا بگلوں پر بے وقوف بنناان کی نری عقل مندی تھی، وہ ہر وقت بہ کارِ خویش ہوشیار رہتے تھے۔

شکور دادا کو امیر بننے کا شوق تھا اور کسے نہیں ہوتا۔ شاید یہ ان کی فضول خرچ زنانہ

جوانی کا ردِ عمل تھا یا ان کی شریکِ حیات کی عناں گیری کہ وہ اس عام شوق کی تکمیل ایک خاص فنی مہارت کے ساتھ کرنے کے عادی ہو گئے تھے ۔ کہتے ہیں ۔ بوند بوند تالاب بھرتا ہے ۔ دادا نے سوائے اور ڈیوڑھے پر لگائے ہوئے دھان ، گیہوں ، بونٹ وغیرہ کے چار سیر ، پانچ سیر سودے سے کاروبار کی ابتدا کی تھی اور اس کے بعد درمیانے شخص کی حیثیت سے انھوں نے کھیت زمینداروں سے لگان پر لینا اور اضافہ کے ساتھ ٹٹ پونجیے رعیتوں کو دینا شروع کیا تھا ۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر شکور دادا خوش حال ہوتے جا رہے تھے ۔ بابو کرامت گاہ بہ گاہ دادا کو کہتے ۔ "شکور میاں امیر ہوتے جا رہے ہیں ۔ ہے نہ شکور میاں ؟ " دادا جواب دیتے " نہیں بابو ...... آپ لوگ کی دعا سے خدا رزق کا سامان کر دیتا ہے ۔ " مگر واقعی خود شکور دادا کو اپنی ترقی کا احساس تھا ، اس احساس کا عملی اظہار غریب ہمسایوں کے ساتھ ہوتا ، کبھی تو انکسار میں لپٹے ہوئے فخر کے ساتھ اور کبھی پرنالے کے پانی کے نکاس ، بکری یا دوسرے مویشی کی وغیرہ کے سلسلے میں ۔ اس نظام میں امیر اور صاحبِ مقدرت ہونے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کمزوروں کی حق تلفی کر کے اپنے زور کو آزمایا جائے ۔ دادا نے جس اصولِ اقتصاد کے ہوشیارانہ استعمال سے شاہراہِ امارت پر پہلا قدم اٹھایا تھا اُسی کے فلسفہ ...... نے ان کی دراز دستیوں کی حمایت بھی کی اور وہ آغازِ دولت کی مجرمانہ لذت بخشیوں سے مسرور رہتے ۔ جب اقتدار مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر خلقت میں تابِ مقابلہ نہیں رہتی مگر ابھی تو شکور دادا کی اُٹھان شروع ہی ہوئی تھی ، کبھی کبھار دادا کی بڑی ہوشیاری کے باوجود بعض کرتل افراد اپنے حقوق کی حفاظت میں اُن سے اُلجھ جاتے اور وہ عدم تشدد کے مضحکہ خیز استعمال پر مجبور ہو جاتے تھے ۔ ایسے موقعوں پر دادا گھر کے اندر گویا اعتکاف میں بیٹھے رہتے تھے ۔ بستی والوں کے لئے ایسے واقعات بھی باعثِ تفریح ہوتے ۔ جب دادا خلوت گزینی ترک کر کے باہر نکل آتے تو لوگ ان سے چٹکیاں لیتے ۔ خصوصاً بابو کرامت ، محمد ذہین اور بابو نصرت حسین کا برادر حمید ۔ ذہین شرفائے قریہ میں سب سے زیادہ آزاد و ظریف شخص تھا ۔ دادا ذہین سے درپردہ بہت جلتے تھے ۔ حمید گاؤں کے ناخواندوں میں اہم ترین جھگڑا باز تھا ۔ دادا اس سے بھی کتراتے تھے ۔ یہ لوگ دادا کے رازہائے درونِ پردہ کو منظرِ عام پر لے آیا کرتے تھے اور وہ انتے گہرے اور تیکھے مذاق کو مصلحتاً ناپسند کرتے

بھتے۔ دادا ایسے نازک موقعوں پر کبھی تو اپنے خندۂ دنداں نما کی بارش سے طنز کی نشتریت کو ہلکا کر لیا کرتے اور گاہ ایک گہری خاموشی کی قبر میں ستر بلاؤں کو دفن کر دیتے تھے۔

شکور دادا گاؤں کی بھلی بری زندگی کے لیئے بہت ہی ضروری چیز تھے۔ آئے دن بستی میں ان کی حرکت و روانی کا احساس ہوتا رہتا تھا، تقریبات کے موقعوں پر تو ان کی ہستی ایک دیو ار قہقہہ ہوتی تھی۔ ان کے کینے کے لئے دادا کی شخصیت ایک مختار مطلق ڈکٹیٹر کی تھی بھتیجیاں بھانجیاں بھی تھیں، اس حلقے میں ان کی آمریت مسلم تھی۔ کیا مجال جو کوئی ان کی باتوں اور ان کے فیصلوں میں دخل دے۔ گھر کا بٹوارہ، کھیتوں کی تقسیم، لوگوں کا کھانا، پینا، آنا جانا، سب باتیں ان کی مرضی کے مطابق ہوتی تھیں۔ بھائی اور بہنوئی اللہ کے یہاں سدھار چکے تھے۔ شکور دادا ان کے یتیم بچوں کی دیکھ بھال خوب اچھی طرح کرتے تھے۔ لڑکے بڑے بھی ہو گئے، لڑکیاں بھی سیانی ہو گیئں۔ دادا نے ان کی شادیاں امیر بننے کے جذبے اور اپنی نجی سیاست کے اتحت مناسب جگہوں میں کیں۔ دادا کے بھتیجے سال کے کچھ حصے میں کلکتہ میں ہگلی کے بوٹوں پر کام کیا کرتے تھے اور کچھ حصوں میں گھر کی کھیتی آسنبھالتے تھے۔ مگر دادا کا ایک بھانجا بڑا ہوشیار نکلا۔ اس نے مستری کا کام سیکھ لیا تھا اور دوڑ دھوپ کے بعد ایسٹ انڈین ریلوے میں پلیٹر ہو گیا تھا۔ یوں تو شکور دادا اپنے عزیزوں کو ایک آنکھ سے دیکھنے کی بڑی کوشش اور اونچے دعوے فرمایا کرتے تھے۔ مگر کیا کریں۔ روپیوں کی کھنک میں کچھ فطری دلچسپی وہ جاذبیت ہے۔ رشید پلیٹر میں دادا کو بھلائیاں نظر آنے لگیں اور دوسروں میں برائیاں۔ رفتہ رفتہ رشید دادا کا چہیتا بن گیا اور دوسرے عزیزوں کی آنکھ میں کھٹکنے لگا۔ کچھ زیر لب شکوے شکایتیں بھی ہوئیں مگر گھر کے کرتا کے سامنے کسے دم مارنے کی جرأت تھی۔ رشید پلیٹر کے مربی بننے کے احساس سے شکور دادا کو دن بہ دن اپنی ذات نہایت اہم معلوم ہونے لگی۔

رشید نے دادا کے ذریعہ گاؤں میں کھیت خریدنے شروع کیے۔ دادا یہ چاہتے تھے کہ رشید اپنے ددھیال ہی نہ بسے بلکہ ان ہی کے سایۂ عاطفت میں پھلے پھولے۔ دادا نے اپنے خاص سلوک سے رشید پلیٹر کو اس بات پر راضی کر لیا۔ گاؤں میں بانس کی زمینیں بھی خریدی گئیں۔ شکور دادا بڑے اونچے ارادے رکھتے تھے۔ وہ اب جا کر صحیح طور پر محسوس کرنے لگے کہ امارت و دولت ان

کے قدم جلد چومنے والی ہے۔ رشید ان کے خواب کی تعبیر تھا۔ دادا زریں مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے، کھیت، ملکیت، دولت، اقتدار اور شکور میاں سے یک لخت شکور بابو۔ اس تصور میں ڈوب کر گاہ دادا سے ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتیں جو مضحکہ انگیز ہوتیں۔ وہ مستقبل کو اتنا حقیقی سمجھ لیتے کہ حال کی حیثیت ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور ایک شیخ چلی کی طرح آئندہ آنے والے خیالی دنوں کے من مانے اقتدار کو برتنے بھی لگتے۔ حقیقت اور خواب کی ٹکر کے ساتھ دادا کبھی گاؤں کے لوگوں سے متصادم ہو جاتے۔ اس تصادم کو دادا کا بوڑھا پن اور پر لطف بنا دیتا۔ شکور دادا اپنا نجی کاروبار بھی کرتے رہے۔ انھیں دھن تھی کہ تالاب چاروں طرف سے بھرے مگر اُن کے معیار کے مطابق ان کے بھیتے ذرا ناکارے تھے۔ بہرحال دادا کو اطمینان تھا کہ رشید ہزاروں ہزار روپئے کما کر ڈھیر لگا دے گا اور پھر۔؟ اس تصور ہی سے دادا کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ اس شیریں خیال کو اس طرح دماغ میں اُلٹتے پلٹتے جیسے کوئی بچہ لائم جوس یا چاکلیٹ کھا رہا ہو۔ رشید اور رشید کا مستقبل ہی دادا کا دین و ایمان اور امید و آرزو تھی۔ یہ ان کی ساری حیات تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پختہ ہوتا گیا۔ آخر دنوں میں تو یہ ہو گیا کہ اس تصور و تمنا اور دادا میں کوئی دوئی باقی نہ رہی۔ جوانی میں شکور دادا کے گھبدن سے عشق کا شہرہ تھا اور بڑھاپے میں رشید اور رشید کی متوقع دولت کے اسی تانا بانا کے چرچے تھے جو دادا نے ہر طرف پھیلا رکھا تھا۔

شکور دادا رشید کو بلیٹر سمجھ رہے تھے جو انجنیئر کے عین ماتحت ہوتا ہے۔ یہ میاں رشید کی جادوٹ تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ رشید ایک معمولی سنتری تھا، جو ریلوے لائنوں کی دیکھ بھال کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ مگر دادا کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ وہ نائب انجنیئر ہے۔ جب رشید گاؤں میں زمین خریدنے کے لئے دادا کو کچھ زیادہ روپے نہ دے سکا تو دادا کچھ خفا اور کچھ مشکوک ہوئے۔ لیکن رشید نے یہ پٹی پڑھائی کہ اس نے اپنا مشاہرہ کچھ کم کر دایا ہے۔ مشاہرہ سے ایک بڑی رقم پروویڈنٹ فنڈ میں کٹ رہی ہے۔ اس رقم کا اونچی شرح سے سود ملے گا اور جب نوکری ختم ہو گی تو پچیس ہزار روپے یکمشت ملیں گے۔ دادا نے یہ بات وحی کی طرح سچی سمجھی۔ تمنا کیسے کیسے گل کھلاتی ہے اور تمیز و تنقید کی قوت کو پیا کے

اُن ہونے خیالات کو ناقابلِ شناخت بہروپ بھرنا سکھا دیتی ہے۔ اب شکور دادا صرف پروویڈنٹ فنڈ ہو کر رہ گئے تھے۔

"سنو بابو، رشید والبھی پگلا ہے۔ آج کی آدھی روٹی کل کی سوچی سے اچھی۔ پر ابھی ٹنٹ نہ پرابھیٹ کی دُم .... ہیں ہیں ہیں .... نوکری جب ختم ہوگی تو پچیس ہزار روپیہ ملے گا۔" دادا لوگوں سے کہتے پھرتے۔ اور ذرا رازدارانہ انداز میں آہستہ آہستہ لہجے سے اس گفتگو میں اضافہ یوں فرماتے۔ "اچھا ہے مگر۔ ایک تختہ میں کھیت خرید لے گا۔ بڑا رقبہ نظر کے سامنے۔ ایک مرتبہ بس۔ ٹکڑا پرزہ ٹھیک نہیں ...... ہے نا بابو...... ؟"

بعض لوگ تو دادا کی ہاں میں ہاں ملاتے اور بعض ان کو اُنہ آگے بڑھا کر باتیں سناتے، ان سے چٹکیاں لینے لگتے۔ خاص کر ذہین اور حمید براہل۔

"تو ہاں شکور بابو۔ چوماس بیچو کی بھیٹ، گویا یا انگلش والی جگر یار ہے۔ اُونہہ، شکور بابو کا بڑا رعاب رہے گا......" حمید مسکراتے ہوئے کہتا۔ شکور دادا کچھ پھول جاتے اور انکسار سے کہتے۔ "ارے بھائی غریب آدمی کا لیں گے۔ پھر گویا یا انگلش بک تھوڑے رہا ہے۔"

ذہین بن کر کہتا۔ "نہیں دادا جیتے تو ملکی، مگر جب تک رشید کو پروویڈنٹ فنڈ ملے گا، دادا جنت میں جاگیر خرید چکے ہوں گے۔"

شکور دادا اکھڑ جاتے۔ وہ موت کے نام سے بہت ڈرتے تھے۔ مرنے سے ڈرنا فطری بات ہے مگر دادا کا خوف کچھ انوکھا تھا۔ کوئی اگر صرف اتنا کہتا "اب شکور میاں بوڑھے ہو گئے" تو بھی دادا اس سے بے حد بیزار ہو جاتے۔ بغیر امیر ہوئے مرجانا۔ معاذ اللہ! عاقبت ہی خراب ہو گئی گویا۔ دادا زندگی کے شدت سے حریص تھے اور اس حرصِ شدید کا سبب وہ آرزو تھی جو ابھی پوری نہ ہوئی تھی، رشید کا پروویڈنٹ فنڈ، اور پھر گاؤں میں ملکیت اور اقتدار۔

تو ہاں شکور دادا صرف پروویڈنٹ فنڈ ہو کر رہ گئے۔ لوگوں نے عام طور پر اب ان کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ بابو کرامت حسین کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے لڑکے اور بھتیجے اپنے اپنے دھندے میں لگ کر شہر کے باشی ہو گئے۔ شکور دادا کی بیٹھک اُجڑ گئی۔ دیہات کے دوسرے پروردگاروں میں بابو کرامت کی سی سیر چشمی و مروت کہاں۔ دادا کی رسائی دوسرے

بنگلوں تک اتنی نہ تھی اور اب اُن کی خودداری اتنی ضرور پروَرش پا چکی تھی کہ دربارداری دادا سے بن نہ آتی تھی۔ آخر وہ رشید بلڈیئر کے ماموں تھے، وہ رشید جسے پچیس ہزار روپے پروویڈنٹ فنڈ کے جلد ہی ملنے والے تھے۔ دادا ہنوز ہنسنے ہنسانے تھے۔ لیکن اب وہ مضحکہ خیزی کے تیر چلانے سے زیادہ خود ہی اس کا نشانہ بنتے تھے۔ مگر دادا نے پروویڈنٹ فنڈ کے تذکرے بند نہ کیے۔ بعض لوگوں کے تمسخر کو وہ حسد پر محمول کرتے اور اس احتمال میں صداقت کا کافی حصہ تھا بھی۔

شکور دادا کی عمر اب لوگوں کے خیال میں ساٹھ سے بالا اور اُن کے خیال میں ساٹھ سے بہت اِسی طرف تھی۔ دادا کچھ بیمار رہنے لگے۔ جب یہ بیماری طول کھینچنے لگی تو وہ شہر گئے۔ ڈاکٹروں نے جگر میں پتھری تجویز کی۔ علاج معالجے، پرہیز اور دادی کی دردمندانہ تیمارداری سے دادا سنبھل گئے۔ لیکن اس بیماری نے دادا کی خوش باشیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ وہ ایک حد تک خانہ نشین ہو گئے۔ اُن پر موت کا مبہم سا خوف طاری رہنے لگا۔ وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتے کہ عزرائیل دبے پاؤں آ رہا ہے۔ وہ شدت اور قوت کے ساتھ اس خیال کو جھٹک دیتے لیکن جب بھی جگر میں درد اٹھتا یہ منحوس خیال بدروحوں کی طرح منڈلانے لگتا۔ دادا پر خوف کی جھرجھری آ جاتی اور وہ دادی سے دعا یا اثارہ کا عرق طلب کرتے۔ وہ اس دنیا کو پکڑے رہنا چاہتے تھے اور جیسے بچہ ماں کی گود سے جب گرتا ہوا محسوس کرتا ہے تو اپنے پنجوں سے کپڑے یا جسم کے کسی حصہ کو پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح دادا کو جب بھی آغوشِ حیات سے کھسل جانے کا احساس ہوتا تو وہ سہارے کی تلاش کرتے۔ دوا، غذا یا دادی کی ذات سے ایسے ہی سہارے تھے۔ دادا کی تمنا ظاہر ہے، صرف ایک تھی اور اِس وحدت میں کثرت کے نت نئے جلوے تھے۔ کاش رشید ان کے جیتے جی نوکری کا دور ختم کر کے پچیس ہزار روپے پروویڈنٹ فنڈ لے کر گاؤں آئے۔ دادا اُس وقت تک زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی پوری طاقت اور ارادے سے موت اور فنا سے جنگ کر رہے تھے۔ جینے کی زبردست خواہش نے انھیں ایک گونہ یقین دلا دیا کہ وہ زندہ رہیں گے، ضرور زندہ رہیں گے۔ لیکن اس یقین کی چٹان کے نیچے تقدیر کے تاریک بطن سے شک اور خوف کے ہلکے ہلکے جھٹکے پیدا ہو کر زندگی کو متزلزل کرتے رہتے تھے، "کون جانے میں رشید کو پچیس ہزار روپے ملنے سے پہلے ہی مر جاؤں۔" دادا حیات

کے ایسے المناک انجام سے ڈر رہے تھے۔

مگر شکور دادا زندہ رہے۔ جگر میں درد اُٹھتا رہا اور خوف و امید کے درمیان رشید کو پروویڈنٹ فنڈ ملنے کا زمانہ قریب آتا گیا۔ آخر رشید اپنی ملازمت کا ٹرم ختم کر کے گاؤں آ گیا۔ بس اب صرف خط و کتابت کی دیر تھی۔ چھنا چھن پچیس ہزار روپے اسے جلد از جلد ملنے ہی والے تھے۔ دادا گوشِ تخیل سے ان روپیوں کی جھنکار سُن رہے تھے۔ خوف مٹ چکا تھا اور امید گلبدن کی طرح مسکراتی ہوئی دادا سے ہم آغوش ہو رہی تھی۔ دادا نئے سرے سے جوان ہو گئے۔ وہی اُمنگ، وہی چہل، وہی اگلی سی بذلہ سنجی، وہی پہلی سی ہنسی دل لگی ایک پھانتا زہ کی طرح کھل کھلا اُٹھی تھی۔ شکور دادا خلوت گزینی ترک کر کے اب پھر بستی کی رونق بن گئے تھے۔ اُن کی زندگی کی مرکزی آرزو پوری ہو کر حقیقت بننے والی تھی۔ صبحِ بہار کی سی ایک رنگین حقیقت، ان کی بیماری، ان کے جگر کا درد اس مسرت و انبساط کی گلابی شفق میں غرق ہو کر غیر محسوس ہو گیا تھا۔ بستی والے بھی اب دادا کا مذاق نہیں اُڑاتے۔ پچیس ہزار روپیوں کی زریں حقیقت اس قدر قریب آ گئی تھی کہ اہلِ قریہ مرعوب و مبہوت ہو کر رہ گئے۔ دادا اتنا خوش تھے کہ اب وہ پروویڈنٹ فنڈ کے متعلق کچھ نہیں بولتے تھے۔ یہ چیز اتنی واضح ہو چکی تھی اور اتنی انبساط آگیں تھی کہ خاموشی گفتگو سے زیادہ مُظہرِ خیال و جذبات تھی۔

شکور دادا کی زندگی کے سارے لمحات پروویڈنٹ فنڈ کے روپیوں کی سوچ یا اُس کے خواب میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔ وہ اپنے من میں بیسیوں پروگرام بناتے۔ مستقبل کے متعلق بیداری میں خواب دیکھتے اور اپنی حیاتِ تازہ کا اُفق وسیع تر ہوتے ہوئے پاتے تھے۔ انتہائی مسرت میں گاہ ایک مُبہم سا خوف دادا پر خفیف سا لرزہ طاری کر دیتا۔ ایسے وقت میں گھر سے باہر نکل جاتے اور گاؤں والوں کے درمیان بذلہ سنجیوں میں دل بہلانے لگتے تھے۔

رشید بلیسٹر کی بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ بستی کی بیٹھکوں پر اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا اور وہ بھی خوب دو دن کی لیتا رہتا تھا۔ آخر کار رشید کو پروویڈنٹ فنڈ مل گیا۔ اُس نے ہیڈ آفس جا کر روپیوں کے کاغذات رزرو بنک کے نام حاصل کیے اور ایک گہری خاموشی میں لپٹا ہوا گھر واپس آیا۔ رشید کو کتنے روپے ملے تھے، یہ ایک راز تھا مگر شہرت پچیس

ہزار روپوں کی رہی۔ رشید نے کاغذات اپنے قبضے میں رکھے اور روپوں کی اصل تعداد کے متعلق اس نے شکور دادا کو بھی خبر نہ کی۔ دادا نے مختلف طریقوں سے بات پوچھنی بھی چاہی لیکن رشید ٹال گیا۔ دادا کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اُن کی آمریت پر یہ پہلا حملہ تھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔ دھیرے دھیرے رشید نے انتظامات بھی اپنے ہاتھ میں لینے شروع کئے۔ اور دادا کی سرپرستی محض نام کی رہ گئی۔ دادا کے قدموں کے نیچے زمین ہی تو نکل گئی۔ پھر درد جگر کا ان پر شدید حملہ ہوا۔ دادا کے دوسرے عزیز ان کی رشید کی پاسداری کے سبب اُن سے بیزار تھے ہی۔ اب شکور دادا اپنے خاندان میں بھی بیگانہ سے تھے۔ انھوں نے بستی والوں سے یہ حالت باضابطہ طور پر چھپائی مگر فضا کی تبدیلی موسم کے انقلاب کی غمازی کر ہی دیتی ہے۔ آہستہ مگر یقینی طور پر گاؤں میں دادا کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور اس نسبت سے دادا بھی رفتہ رفتہ خانہ نشیں ہو گئے۔ ان کی اپنی پونجی بھی علاج پر صرف ہو رہی تھی اور دادا کو خوف تھا کہ یہ کہیں مسلسل بے دریغ خرچ سے نبڑ نہ جائے۔ ہر چند کہ اب زندگی اپنی معنویت کھو چکی تھی تاہم دادا محض زندگی کے لئے اور جینا چاہتے تھے۔ وہ کوڑی کوڑی جمع کیا ہوا سرمایہ علاج پر گویا آنکھ موند کر صرف کر رہے تھے۔ ان کے با اقتدار امیر بننے کی آرزو تشنۂ تکمیل ہی رہی۔ علاج و معالجہ پر روپے خرچ کرنا دادا کے لئے سوہان روح تھا، مگر اب جینے، محض جینے کے لئے اپنی آرزوؤں سے انتقام لے رہے تھے۔ دولت اور حیات کا اجتماع اُن کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ پھر جب سب سے بڑی تمنا نے انھیں دھوکا دیا تھا تو وہ بھی تمناؤں کو فریب دینا چاہتے تھے۔ تمنا کو فریب دینا ایک اور فریب تازہ میں گرفتار ہونا ہے۔ دادا اسی میں دانستہ طور پر گرفتار ہو رہے تھے۔ "بلا سے رشید اپنے سے انتظام کرے، میرے کون بال بچہ ہے۔ میری چیز بھی تو اُسی کی ہو گی۔ مگر جلدی سے کھیت ہتھیار خرید لے۔ میری موت و حیات کا کوئی ٹھکانہ ہے اب۔" دادا کی بس ایک خواہش تھی۔ وہ رشید کو فروغ پاتا ہوا دیکھ لینا چاہتے تھے۔ برسوں کی پالی ہوئی تمنا سے دست کش ہو جانا بہت دوبھر ہوتا ہے۔

رشید کھیت خریدنے میں نہ جانے کیوں ٹال مٹول کرتا رہا۔ اس کے پروویڈنٹ فنڈ کے روپے افسانہ ہی افسانہ رہے، وہ کبھی حقیقت نہ بن پائے۔ ابتدا میں تھوڑے بہت کھیت رشید

نے خریدے بھی۔ لیکن وہ اتنے نہ تھے کہ گاؤں والوں کو مرعوب کر دیتے اور رشید رئیس قریہ قرار پاتا۔ ہندستان کے گاؤں میں گرتے ہوئے چھوٹے زمینداروں اور مٹتے ہوئے فاقہ کش سے کاشت کاروں کی کمی نہیں۔ رشید اگر چاہتا تو بہت ڈھیر سے کھیت خرید سکتا تھا۔ لیکن وہ تو ہر بار یہ کہہ کر ٹال جاتا کہ یہ کھیت اچھے نہیں یا بہت مہنگے ہیں۔ سب باتوں کی ایک حد ہوتی ہے۔ کھیت بکتے اور خریدے جا رہے تھے۔ لیکن رشید اپنی چھپی ہوئی مفروضہ دولت کو گرہ میں باندھے ہی رہا۔ گاؤں کا شک اس وقت انتہا کو پہنچ گیا جب بابو جواد کے بہترین کھیت بک گئے، اور رشید میاں چُپ سادھے ہی رہ گئے۔ شکور دادا کو بھی شک ہونا شروع ہوا اور رشید کے نہ کھلنے کے سبب یہ شک خلجان کی حد تک پہنچ گیا۔ دادا نے رشید کو نصیحتیں کیں، اُس پر بگڑے، اُس کی منت سماجت کی۔ لیکن رشید یہ جواب دے کر جان چھڑا لیتا کہ "لیا نہ جا گا۔ مڑ بڑی کاہے کی! بنک میں سود ملتا رہا ہے" دادا کہتے بنک کا حساب دکھاؤ تو گم سُم ہو جاتا یا اور کوئی بات بنا دیتا۔ شکور دادا کی تشویش بڑھتی رہی اور جب جواد بابو کا تختہ کھیت بک گیا تو دادا کے دل پر سانپ لوٹ گیا اور انھیں رشید کی دولت کی طرف سے مایوسی سی ہونے لگی۔ دادا کا ایک آخری سہارا بھی اُن کے ہاتھوں سے چھوٹا جاتا تھا۔ رشید صرف رشید میاں ہی رہا، اُن کے جیتے جی رشید بابو نہ ہو سکا اور کبھی تو شکور دادا کو یہ شک ہوتا کہ رشید نے اپنا سارا روپیہ اپنی نوکری پر ہی عیاشی میں پھونک دیا اور اب اس کے پلے چند بگھے کھیت خریدنے کے بعد کچھ نہیں رہا۔ یہ شک دادا کا خون جونک کی طرح چوس رہا تھا اور رشید کی رازدارانہ بیگانگی اُن کی روح تک کو گھلا رہی تھی۔

شکور دادا اپنی بیماری سے، علاج کے باوجود، دن بہ دن نڈھال ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گویا نذرِ فراش ہی ہو گئے تھے۔ طاقت آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی۔ وہ زندگی اور مسائل زندگی سے پھر ایک بار دلچسپی لینی چاہتے تھے۔ لیکن لے نہ پاتے تھے۔ ایک روز وہ لکڑی ٹیک کر گھر سے باہر نکل آئے۔ لیکن تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ اُن کا سر چکرانے لگا اور وہ گھر واپس آ گئے۔ دادا پلنگ پر لیٹے رہتے اور دادی سرہانے بیٹھی ان کے سر میں تیل ڈالتیں یا پائنتی میں بیٹھ کر پاؤں دباتیں، خاموش، اُداس، مغموم، متفکر، شکور دادا بھی بیشتر چپ ہی لیٹے رہتے۔

ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور نگاہیں بیٹھی ہوئے اور آنے والے دنوں کی معدوم و مُبہم فضاؤں میں سرگرداں معلوم ہوتیں ۔ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح جو طے کرتے کئے ہوئے راستے کو تکتا ہے اور آگے کی تاریک غیر متعین منزل کی طرف دیکھ کر بے آس ہو جاتا ہے ۔ شکور دادا اپنے ماضی و مستقبل کے متعلق سوچتے رہتے تھے ۔

ایک روز خبر ملی کہ رشید توحید میاں اور جگو مہتوں کے کھیت کے کھیت خرید رہا ہے ۔ دادا نے رشید کو بلوا بھیجا اور اُسے اُس کے متعلق بہت سے مشورے دیئے ۔ اس روز شام کو شکور دادا پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھے اور دودھ کی فرنی کا ناشتہ کیا ۔ انڈوں کو ڈاکٹر نے منع کیا تھا ۔ آج دادا کا جی چاہا کہ ذرا سا بد پرہیزی کی جائے ۔ زندگی کا ایک ہلکا سا جوش بھی خطروں کا مقابلہ کرنے پر اُکساتا رہتا ہے ۔ اُنھوں نے انڈے بھی کھائے ڈاکٹر کے حکم کی نافرمانی میں ایک لذت حاصل ہوئی ، جیسے گلبدن کے گنہگارانہ پیار میں سرور تھا ۔ کھا پی کر دادا نے چراغِ سحری کی طرح لہک کر گانا شروع کیا ۔

"نیم شبے شر تو اُو چہ گفتی چہ رے ؟ نیم شبو ئے ...... " لیکن گانے سے دادا بہت جلد تھک گئے ۔ بہر کیف رات کو بھی دادا آرام سے سوئے ۔ پر نہ جانے کیوں دادی اس روز شام سے ہی بہت زیادہ مغموم ہو گئیں اور ان کی رات بیقراری میں گذری ۔ عورتوں کو المناک مستقبل کا قبل سے احساس ہو جاتا ہے ۔ دادی شاید اپنے دوربین وجدان سے تاریک مستقبل کے پردے ہٹا کر کچھ دیکھ رہی تھیں ۔

رشید نے کھیت نہیں خریدے بلکہ صرف جگو مہتوں کے کھیت سودہ بھر نالیئے ۔ توحید میاں کی خود کاشتہ زمین ہنواری سنگھ نے خرید لی ۔ شکور دادا پھر مایوسی کے کنوئیں میں گر گئے ۔ اب دادی نے بھی دادا کو مجبور کرنا شروع کیا ۔ وہ ذہین ہیں اپنے کھیت دادی کے نام منتقل کر دیں ۔ دادی ڈرتی تھیں کہ مبادا دادا کے آنکھ موندتے ہی اعزا اُنھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال نہ پھینکیں ۔ شکور دادا کے کوئی اولاد نہ تھی ، انھیں دادی کی خواہش پوری کرنی پڑی ۔ کھیتوں کا دادی کے نام سے منتقل ہونا تھا کہ دادا کے خاندان والے اُن سے اور بیگانہ سے ہو گئے ۔ رشید دادا سے بہت دور ہٹ گیا ، اُن کا چہیتا رشید اُن کے ارمانوں کا مرکز رشید ،

اس کے انداز اور برتاؤ سے کیسی غیریت ٹپکتی تھی!

شکور دادا کے لئے ماضی اب ایک بند کتاب تھا اور مستقبل ایک چُنا ہوا دروازہ۔ کبھی کبھی وہ اس بند کتاب کو کھول کر حسرت سے پڑھ لیتے تھے مگر وہ بند دروازہ؟ اُسی سنگین دروازے سے ٹکرا کر اُن کی تمنائیں سر پھوڑ چکی تھیں۔ یہ ساری وسیع کائنات، یہ پھیلی ہوئی زندگی سُکڑ کر کتنی محدود ہو گئی تھی۔ دادا اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ وہ آرزوؤں سے اُبلتی ہوئی آبادی میں تنہا، محض تنہا، بے آس، پُر شکستہ و مضمحل تھے۔ اور اس ویرانی و تنہائی کا احساس روز بہ روز تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ زمانہ ان کے گلے پر اپنی کُند چھُری تیز کر رہا تھا۔ گاؤں کی رونق، بذلہ سنج اور ہنس مکھ شکور دادا پر ہر وقت سکتہ طاری رہتا تھا۔ اُنھیں بابو کرامت یاد آتے اور اُن کا جگر کی خرابی سے انتقال۔ پھر اُنھیں اپنے دوسرے ہم سن یاد آتے جو راہیِ عدم ہو چکے تھے۔ دادا گذری ہوئی صحبتوں کو یاد کر کے ٹوٹی ہوئی اُمید کی طرح ایک کمزور سی ٹھنڈی سانس بھرتے اور تکیہ میں سر غرق کر کے پڑ جاتے۔ اُنھیں موت کے قدموں کی چاپ بہت قریب سُنائی دیتی۔ اِن دنوں دادی بھی اُنھیں غیر غیر سی معلوم ہوتی تھیں۔ زندگی کا بقیہ سفر اُنھیں اکیلے ہی طے کرنا تھا۔

چند مہینوں کے بعد دادا کے جگر کا درد بے حد بڑھ گیا۔ جگر میں زخم ہو گیا تھا۔ ایک مہینہ تک حالت بہت تشویش ناک رہی۔ پھر وہ شام آگئی جو زندگی کی آخری شام ہوتی ہے۔ آدھی رات تک شکور دادا بے چینی سے کروٹیں لیتے رہے۔ سب اعزّہ جمع تھے۔ دادی خاموش غمناکی میں ڈوبی ہوئی آنسو بہا رہی تھیں۔ دادا نے آہستہ آواز سے رشید کو یاد کیا۔ رشید اُن کے نزدیک بُلایا گیا۔ دادا نے اپنی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ساری حسرتیں مجتمع کر کے نہایت پُرسوز گلوگیر لہجے میں رشید سے دریافت کیا —

"بیٹا! اب بھی بتادے کہ فورے پر دیکھی ..... ٹنٹ ..... فنڈ ..... میں کتنا روپیہ ملا تھا ...... بیٹا! کھیت ...."

ان آخری الفاظ کے بعد وہ کچھ بول نہ پائے۔ مگر اُن کی آنکھیں ملتجی تھیں — رشید نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا —

"ماسٹوں! اب اللہ اللہ کرو۔ اللہ اللہ!

آدھی رات کی تاریکی میں تشکور دادا کی روح حلول کر گئی۔ نہ جانے کس گھڑی اُن کا دم نکلا۔ اُن کی دردناک آنکھیں ہنوز ملتجی تھیں۔

"کلیاں اور کانٹے"

کلیاں اور کانٹے

وہ تعداد میں نو تھیں، گوری، سانولی، گوارا اور ناگوار، بعض ان میں دل کش کہی جا سکتی تھیں۔ مگر خوب صورت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریوں میں ملبوس طیور صبح کے جھرمٹ کے ساتھ باکس اور ڈورینڈا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح اٹھ کر ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھیں۔ درجہ اول کے کوارٹر صحت گاہ کے عام وارڈوں سے قریباً تین فرلانگ پورب جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں، ہر پندرھویں روز۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے، دوم و سوم۔ درجہ اول کے کوارٹر تو خاصے بنگلے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ اسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دو کوٹھڑیاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے اور ایک تیماردار کے لئے۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سا لانبا چوڑا کمرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے نبض و لہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو سل و دق کے جراثیم کے چند اور شکار آ جاتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوئم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر، اسپتال اور قبرستان ہر جگہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان، گوروں کا قبرستان، شرفاء کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ہر شہر، ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔

صحت گاہ اسی کرہ پر قائم تھی اور اسی کے بھلے بُرے قانون کی پابند۔

ہم ان دنوں دس تھے ۔صحت گاہ کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ میں۔ یہاں سے نرسز کوارٹر سامنے نظر آتا تھا۔ لوہے کے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی اقامت گاہ کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی مزدورنوں کے ترسے ہوئے بچے پرستانی دُکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں۔ اُن میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے کی پارٹیوں اور پکنکوں میں ہم لوگوں کا ساتھ رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہیں سے متعلق ہوتا تھا۔ اُن کی تعریف، اُن کی بُرائیاں، اُن کے ناز، اُن کی سازشیں، اُن کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تھک کر شیدِ عقیدت طرازی پر اُتر آئے تھے۔ ہمارے گرسنہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ ہمیں مصالحہ دار چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد اس وارڈ میں ایک سال گزار چکے تھے۔ اور چند ایسے بھی تھے جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ اُمیدی و نااُمیدی کے تین سال۔ ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو نووارد تھے۔ یہ نو گرفتار سہمے سہمے، سنجیدہ، اٹل، متردّد، بے بس اور مُلتجی سے نظر آتے تھے۔ چند ہفتوں میں یہ جھجک عموماً دور ہو جاتی تھی۔ اور نئے بہت جلد پُرانے بن جاتے تھے۔ لیکن ایک دو پُرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی اور گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہر کیف موت اور بیماری کے درمیان بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوش گوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے، ہنستے تھے، جگت بازیاں ہوتی تھیں، قہقہے لگتے تھے۔ نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی۔ اصلی اور نقلی آہیں کھینچی جاتی تھیں، سرگوشیاں ہوتی تھیں اور رازداریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا، ایک مذہب، ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنج۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی، پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کم از کم ایسا نظر آتا تھا۔ ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک

اپنی دنیا لب تا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا۔ نیند اور گفتگو ممنوع۔ زندہ لاش کی طرح پڑے رہئے۔ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجئے اور کچھ مت سوچئے۔ فکر و تردد ایسے مریض کے لئے مُہلک ہے۔

"سوچا مت کیجئے۔ اچھے! ہاں!......ں!"

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں۔ مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے۔ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کی سوچ، موت کی سوچ، سل کی سوچ، دق کی سوچ، آرزوئں کی لاش ماضی کا ماتم، مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم! محسوس، ٹھوس، نیاں، متحرک، خود نگر، خوب صورت اور حقیقی جسم کا اچانک سرد اور بحس ہو جانا! احساس و ادراک چھٹپٹانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا لامعلوم، تاریک، بے پایاں، لامکاں، بیزماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا، سوچنے والے دماغ دھڑکتے ہوئے دل، تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ ناقابل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے الم ناک سانحہ ہے۔ ہم صحت گاہ کی خاموشیوں میں پھیلتے ہوئے لمحات کو، مرکتی، گھٹتی، ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قمیضوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی کو پکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کی ٹیک مل جائے۔ ہم گاہ ٹماٹر کے دام اور پیٹی کوٹ کے حاشیئے کو تخیل سے چھو کر درد زندگی کی اذیتوں سے پناہ لیتے تھے۔ اور کبھی بے خواب راتوں کی نیند کا کاجل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھاتے ہوئے پھول کی طرح پپوٹے نڈھال ہونے لگتے۔ تو ــــ

"اوہ......رے......رے! بڑے صاحب سے کہہ دوں گی۔ یہ تو سونے لگے ہیں۔"

کی آواز سنائی دیتی اور گاہے گاہے گال یا پیشانی پر ایک آشناسی چپت۔ یہ نجات دہندہ

آواز سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

"میں آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب، سوتا کون ہے؟ آئیے آپ بھی سو جائیے"

یہ جواب ملتا اور پھر کبھی تسکین نہ ردِ عمل۔

وہ روز طلوعِ آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گھنگھرو بولنے لگتے تھے۔ ہم چونکتا ہو کر اس طرف دیکھتے۔ صحت گاہ کی ویرانیوں میں یہ روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید ساریاں سبز جھاڑیوں سے نکلتیں، جیسے بیلے کے پھول کو نرھی کے اخضریں پردے سے نکلتے ہیں۔ بگلوں کا پرا قریب تر ہو جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پھلجھڑی چھوٹتی اور دو پھول ہم لوگوں کے وارڈ میں آ گرتے۔ ہم دسوں مریض اُنھیں اپنے دامنِ نظارہ میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی ڈیوٹی درجۂ اول کے کوارٹر سے اس وارڈ میں بدلتی تو عموماً یہی ہوتا کہ بجا یا بے جا طور پر کردہ و ناکردہ غلطیوں پر ہم لوگوں کی سرزنش یوں کی جاتی۔

"میں اِے وارڈ میں ہی بھلی تھی۔ کیسے اچھے مریض ہیں اِے وارڈ کے! ابھی، اس وارڈ کے مریض نوجوان کھا جاتے ہیں۔"

"کیسے اچھے ہیں اِے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں بیچارے، اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کرواتے ہیں، جیسے میں ان کی لگائی ہوں......" اور کبھی زیادہ ولدوز:

"گھر میں کرتے ہوں بہ ٹھاٹھ و شان دکھلانے آئے ہیں! اِے وارڈ میں نواب صاحب اپنا منھ تک میلا نہیں کرتے۔"

ہم دسوں مریض مختلف زاویوں سے درجہ اول کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سُرخ اینٹیں طنزیہ ہنستی ہنستی نظر آتیں۔ معمر نواب صاحب کی موٹر، اُن کا جوان لڑکا منصف صاحب، وھنراج جی کے بھائی کی توند اور شہوتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، صوبے کے صدر ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا، چالاک و فتنہ کار نور نظر، بیمار و تیمار دار، غرض درجہ اول کی ساری مخلوق سل کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتی، جو ہمارے پھیپھڑوں کو کھلنی

کر رہی ہے ۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر پھینک دینا چاہتے تھے ، بھو کدانی کے کار بولک ایسڈ میں فنا ہونے کے لئے ۔

اُس روز سیلینے کے لگا ؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کئی ، نرس ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کی بھڑاس اور چھپے ہوئے جنسی ارمان نکال لیتے تھے ۔

ہمارے دلوں میں چور تھا اور اُن کے دلوں میں بھی ۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ ضرور تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اکساتی رہتی تھی ۔ اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لئے تیار رہتی تھیں ۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے ۔ ماضی کے نہاں خانے میں سینکڑوں مریض ، بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے ۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گزرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گوندھتے ہوئے ہمیں بھی پروتا چلا جاتا تھا ۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے ۔ لیکن اجتماع کا تنوع ، ہمدردی اور رونق تھی ، اِسے وارڈ کے علاوہ اَپر سی وارڈ اور لوئر سی وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی ۔ یہ اَپر اور لوئر ، محض زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا ۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے ۔ دونوں ہی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے ۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے ۔ لیکن ہمارے وارڈ کا ایکا ساری صحت گاہ میں مشہور تھا ۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحدہ ہی تھے ۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے نازک سے لڑکے کا بڈ تھا ۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں " اے پی " دی جاتی تھی ۔ یہ صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا ۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سل کے پنجوں سے چھینا تھا ۔ اُسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی ۔ پھر بھی وہ وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا ۔ وہ نرسوں کا کھلونا تھا " ننھا گوپال " گوپال پندرھویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا ۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا ۔ بہت ہی موٹا تازہ ، تین من اس کا وزن تھا ، پر بیچارہ غریب ساڑھے تین سال صحت گاہ میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے ہی چلا گیا ۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے ۔ اس کے بڈ پر ایک مارواڑی ہی آیا ۔ یہ اتنا دُبلا تھا کہ ہم لوگ اسے گنتی رام

کا بھوت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو جیا بٹین کے جنون میں صرف ایک سیر ٹماٹر دن بھر میں کھایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مرمر کے بیچے تھے۔ شاید ان کی صورت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چوتھا میں خود تھا۔ صحت گاہ میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرتیں نکالنے والا۔ میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی حاذق کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ، ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویر بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا رہتا ہے۔ "اب کالا کوئی نہیں رہے گا۔" نقی حسین تھا اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ، چونچال، بیباک اور ہنس مکھ۔ اس کی آمد سے لوئر سی وارڈ کا پلّہ گراں ہو گیا تھا۔ پہلے اپر سی وارڈ میں گوشش نرسوں کا مرکز ثقل تھا۔ مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے لوئر سی میں چلی آتی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے کھانے کی میز کے گرد بڑی دل نواز فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ چہل سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت بھاتے تھے۔ وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک داڑھی رکھتے اور نقلیں کرتے تھے۔ دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکہ لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیئر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر عبیر کی سرخ بندی نرسوں کے لئے سرچشمۂ تفریح تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بے وقوف بن کر اور چیلے سہہ کر اپنا حق جما لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا۔ مگر ایک کی فطرت میں ایمائی طنز زیادہ تھا اور دوسرے میں واقعیت نمایاں۔

نقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصر جی تھے۔ گورا رنگ جس پر سرخی کی چھوٹ تھی۔ مصر جی بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر بالکل کنوارے تھے، اچھوت کنیا کی طرح۔ اور مصر جی کو ایک پھیپھڑے میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ مصر جی کہنہ مریض تھے۔ "اے پی" کا کورس ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو "فرینک نرد" کی جراحت کے ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصر جی میڈیکل کالج کے طالب العلم رہ چکے تھے۔

نوبی صاحب ایک اڑتالیس سال کے دیسی عیسائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھنٹوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے

تختے کی طرح چت لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں، کسی قسم کے آثارِ حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ "زیرِ قدمت ہزار جان است"۔ اصولاً وہ اپنے سل زدہ پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیانِ حیات تھی۔ ہر وقت، ہر روز، ہر سال یونہی زندگی گذارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ صحت گاہ میں انھیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوگی۔ موٹا، گول مٹول سا، گردن ندارد۔ یہ لڑکا غلام ربانی بھی پربھو بابو کا مرید تھا۔ کم سخن، کم آمیز، مگر بسیار خور و بسیار خواب۔ اسے ہم لوگ "مرغ" کہتے تھے۔ اور پربھو بابو کو "پطرس ولی"۔ "مرغ" وضو کے علاوہ غسل بھی کرتا تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ تھے، ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ سے تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "پطرس ولی" بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرن اور ایشری کی آواز سنتے ہی "مرغ" بھی بانگ دینے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جانِ سینا ٹوریم تھیں۔ ایشری بیس سال کی، صندلی رنگ، دراز قد، چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چلتی تھی جیسے اسپ تازی "قدم چلتا ہے"۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق" قسم کا خم۔ ایشری ملنسار، دل نواز، اور مجسم سپردگی تھی۔ وہ نسیم خوش خرام کی مثال آزاد و ہمہ گیر تھی۔ ایشری کیتھرن کو کٹو بوا کہتی تھی۔ کیتھرن پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی۔ سانولا رنگ جراحاتِ جگر پر نمک ریز، اس کے پھیلے اور گداز کولھے، اس کی گول کمر، اس کی مثالی ہندی چال، مست ہاتھی کی طرح۔ وہ یوں افقِ نظر میں داخل ہوتی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولھوں کے محور پر بالائی جسم جھوم سا جاتا تھا۔ جیسے پھل دار شاخ موٹے تنے پر لچک سی جائے۔ پھر اس کے کولھے بیش و بیش ڈگمگا کے متانت سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ داہنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے پلو میں تناؤ پیدا

کرتی اور چھوڑ دیتی تھی۔ آنچل کی لپیٹن میں اُس کے سینے اُبھر آتے تھے اور پلّو لہرانے لگتا تھا۔ کیتھرن
ملوانتین سی رہتی تھی۔ مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحر کار بن جاتی تھی اور پھر سنجیدہ۔ بجلی کا چنچل
پن اور امنڈتے ہوئے کالے موج در موج بادل کی گمبھیرتا، یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں
کر کے قاتل تر بناتی تھیں۔ اس کی فطرت میں بحرالکاہل کی گہرائی تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا مارتھا اور فیبی۔ مارتھا مردانہ وار لانبی
چھپی سی عورت تھی۔ ہنسوڑ اور بے جھجک فیبی اس کے زیر حکومت تھی۔ نرس کوارٹر کے ایک ہی کمرے
میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے۔ "فیبی تو فلاں مریض سے گھل مل کر کیوں
ملی؟ فلاں نے تجھ سے چھیڑ کیوں کی؟" اس جوڑے کے نصف بہتر "فیبی" پر ہر وقت پہرہ تھا۔
مارتھا ہاں منحرجی سے خوش تھی۔ شرمیلے اچھوت کنیا سے منحرجی۔

ایک جوڑا دو چچازاد بہنوں کا تھا، سلوی اور فلورنس۔ دونوں گوری گوری، گدراز
گدراز مائل بہ فربہی عورتیں تھیں، مگر لڑکیاں کہے جانے پر مُصر۔ سلوی اخلاقاً یا ضرورتاً لڑکی کہی اور
سمجھی جاسکتی تھی، لیکن فلورنس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت
سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی۔

میگی اور رولاری کالی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں، خوش اخلاق، کرم فرما،
ہر دل عزیز، ایثار پسند۔ میگی ادھیڑ عمر کی تھی اور رولاری جوان۔ اُن کے 'چھوٹا ناگپوری' سیلونی
کی سنگینی ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے محاذ
سے نظریں پھسل کر صدریں ٹھوس سہارے کے بل پر تھم جاتی تھیں۔

نویں تھی ڈولی۔ وہ سراپا ڈولی تھی۔ چھوٹا سا کھلونا۔ شریر آنکھیں مٹکانے اور چپکی چپکی
کرنے والی گڑیا۔ گہرا سانولا رنگ، اونچا سا قد، پاجی آنکھیں، کھلنڈری بے باک، لڑ پڑنے والی
اور لڑ کر ہنس دینے والی، یہ سب سے کم عمر تھی۔ اٹھارہ اُنیس سال کی ہوگی۔ کبھی تو یہ بدصورت
دکھتی تھی اور کبھی گوارا حد تک بھولی۔

'صحت گاہ' ایک ویرانے میں تھی۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا، اور
سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ صحت گاہ کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی، الگ تھلگ،

دو ڈاکٹر، ایک کمپاؤنڈر، ایک ڈریسر، ایک ایکسرے بابو، دو کلرک، نو نرسیں، ایک میٹرن، اور ایک سسٹر، آٹھ وارڈ بوائے، چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سِل و دق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمارداروں کے، وارڈوں کے چاروں طرف باغ، جنگل اور سُرخ سُرخ 'مورم' کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پُرشور، پہاڑی ندیاں تھیں، جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کی طرح خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی ایکسرے کے لئے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی صبح سے غمگین اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اُس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا، کہنے لگی:

"بڑا بنتا ہے۔ ایکسرے کرنے کے بہانے 'ڈارک روم' میں خود جو چاہے کرگزرے اور دوسروں سے جلتا ہے۔"

ڈولی نے غصے کی بدحیالی میں یہ جملے ادا کئے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر رومان رہتا ہے، نہ کشش۔ وہ کہہ چلی۔

"نرسیں اگر دیسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔"

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبۂ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تُلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو "ڈے آف" ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین کی ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں۔ مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس کا بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اُٹھائے ہوئے واپس آتیں۔ بلکہ سنیما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چنگاریاں اور سُلگ اُٹھتیں۔

کوارٹر میں دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی ٹھیٹھ حقیقتوں اور اور مطالبوں پر جانب دارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ خواہش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں، ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں، طعنہ و طنز، چھیڑ چھاڑ اور کبھی جھوم کے گیت:

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیّاں :: سر دتا کاہے بھول آئے پیارے نندویا

اور غزلیں ۔ ع

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیمانہ

مستیاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی، ہر نرس کی کئی کئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوئی۔ جوانی، عورت، بیوی اور ماں ہمیشہ اُن میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور اَن جانے روپ بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے ناآسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انھیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا جہاں لطافت مٹی نہ تھی، روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہو گی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لئے اپنے لب و رخسار ارزاں کر دیئے اور یہ مسلول سل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل و دماغ میں ہضم کر جاتے تھے۔ "مثبت" مریض کھنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دیویاں، بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کر یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیات کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی۔ ٹی۔ بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی بے حقیقت ہو جاتی تھی۔ جیسے مُلّا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے "اسپیوٹم فلاسک" میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مترحی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

"بھائی! تم بی۔ بی اور نفے۔ بی (فیلبی) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو، میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں"

مَیں نے کہا تھا "میگی بھی تو ہم قافیہ ہے۔ اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے" بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انھیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آگئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید اور ہولی سب تہوار منایا کرتے تھے اور یوں اور مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر لیا کرتے تھے۔ نقی کو صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا، اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آگیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور نقی بہت قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں "سارس کا جوڑا" کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ

کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مسکرا جاتا ہے گا۔ ہے وہاں پر رمی یا کیرم کھیلنے کے لئے بلا لئے جاتے تھے۔
مسز شنکر اور مسز اکرام نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلوا بھی بھیجا۔ مگر ہم لوگوں نے تاب مقابلہ
نہ پاکر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامہ کھیلتے تھے تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے
جنس لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جاتیں تھیں۔ کرسمس کے موقعہ پر بھی ہم لوگوں نے ڈرامہ کھیلا۔ نرسوں
نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان برپا کرتا ہوا آیا۔

فقی لورسی وارڈ میں سب سے خوب صورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اُس کی شوخ
حسین آنکھیں چشمہ شیریں کی طرح تھیں۔ صنف نازک کے لئے دل کی پیاس بجھانے کا نہایت
ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی، مگر
ایشری کی جرأتوں کے سامنے بقیہ سب حقیقی زین کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس
طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی۔ ہر درخت پر چڑھ کر پھل کترنے
والی۔ مگر چوری چوری یہ لے اور وہ بھاگ۔

ایشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ
جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو
نہیں چاہتی تھی۔ مگر فقی نے اُسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی
مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایشری
نے ان کا دل بھی نہیں توڑا اور دل دہی کے لئے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔
"مجھ سے کسی کا گھٹنا دیکھا نہیں جاتا فقی اور ایک تم ہو"
ایشری نے میرے سامنے ایک بار جھوترے کے سائے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔
کیتھرن ایشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی فتوحات
پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت پارسا ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب و حجاب کا اتنا
گوشہ وہ چنگیوں سے ارادتاً ضرور اُٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مائگی ارمان انگیز طور پر
ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرن نے بھی فقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر فقی اس کی آہستہ خرامی اور رازدارانہ انداز

کی فطرت تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بے باک ایسٹری کی ذات میں اس کو وہ ثاپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا، جب میں سینا ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر ہی میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ ایسٹری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی۔ مگر کیتھرن نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا "ڈارلنگ" اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرن نے مجھ سے شکوے کئے۔ "آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھابھی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے ......" کیتھرن نے اپنی سنجیدہ شیریں لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی تھم تھم کر ابلنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نوخیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی پھرتی تھیں۔ اسی روز بڑے صاحب نے بھی رقابت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا "نغمۂ شب" گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لئے تیار رہیں۔ وہ سب کی سب وردی برطرف کئے حسین و آرزو خیز ساریوں میں لپٹی جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقص مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایسٹری طوفان و سیلاب تھی۔ کیتھرن نے اپنی فطرت کا نقاب الٹ دیا تھا۔ وہ بھی کرسمس ایو پر بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک سپرد گی نہ تھا۔ نوتری سی وارڈ میں کہربائی لہر دوڑ گئی۔ معمر وکیل صاحب (جنھیں ہم لوگ "پیر مغاں" کہتے تھے) سے لے کر غلام ربانی تک، لوگ تلاطم محسوسات میں ڈانوا ڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اٹھتے نہ تھے۔ لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اُف اسی وارڈ کے ممکنات اور مواقع کتنے محدود تھے! ہمارے دل میں اپنی جبیں اڑائے وارڈ کی خلوتیں، انفرادی

شان میں آسودہ کھٹک رہی تھیں۔

"نرسیں بڑے صاحب کے یہاں "کرسمس ٹری" بنانے جارہی ہیں۔ جاگتے رہنا۔ ہاں!"
ایک لوچدار آواز فضا میں لہرا کر دلوں میں اتر گئی۔

اوہ ...... رے ...... ے! نہیں کیسے جاگیں گے۔ بوائم بھی تو جان کے منتی ہو۔
بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی انھیں۔ ذرا منتھری کو تو دیکھو ......"

ایک رہزن تمکین ہوش نے دکھتی ہوئی رگ چھو لی۔ پھر بلوۂ برق فنا قسم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور رفیقی کو چھیڑتی ہوئی سب نرسیں یوں چلی گئیں جیسے آتشبازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک بہ یک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارہواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ بائیس کو وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا اپھٹ گیا تھا۔ ہم دسوں کی نظریں خالی بیڈ پر جا کر ہم آغوش ہوئیں، خاموش ماتم کی حالت میں۔ پر بیتی آپ بیتی بنی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب ہمدردانہ انداز میں چپ چپ سے رہے۔ ہم اس اندوہ بلا سے پناہ چاہ رہے تھے اور اتفاقاً ہم سارے جہاں کی خوشیوں کو چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ "پیر مغاں" مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہاں سے اُنھوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر شب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے جسم کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دیئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے میں بھی بلند آواز سے گفتگو کی۔ بے ہنسی کی ہنسی ہنسے اور نرسوں کا نئے پہلو اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ہم میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین "نغمۂ شب" اچانک طور پر لوئیسی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز ہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے اُلجھے ہوئے بال درست کر لیے۔ نرسیں

ہارمونیم پر کرسمس کیرول گاتی چہلیں کرتی، لڑکھڑاتی چلی آرہی تھیں۔ وہ آگئیں، چیت کی سنکتی ہوئی ہواؤں کی طرح، شباب کی اُمنگوں کی مثال، کچھ دیر کے لیے نغمے رُک گئے، خندۂ بے باک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی، ولولہ بداماں خاموشی کا ترنم زندہ سکوت کی ابدی لے آغوشِ وجود میں تھرتھرا رہی تھی۔ اس کے قبل کہ کوئی بڑھ کر بجلی کا بٹن دبائے بہت سی حسرتیں پوری ہوگئیں۔ بہت سی آرزوئیں جوان ہوئیں۔ کتنے ارمان پیدا ہوئے اور اُن گنت ناکردہ گناہ 'حسرت کی داد' لینے کے لئے دردناک مضحکہ کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود جراتِ رندانہ پر تُلا ہوا تھا۔ باہر سطح مرتفع پر چلنے والی تیز ہوائیں سرد، بوڑھے، خاموش، گہرے نیلے آسمان کے سائے میں الھڑ دوشیزاؤں کی طرح لغزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں مائل اختلاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے لپک سے روشنی جلادی تو میں نے دیکھا کہ ڈولی اور نقی کے درمیان ایک سکنڈ میں تھوڑی سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی تماشے بنے اور بکھرے۔ نغمے پھر بلند ہوئے۔ ہارمونیم الیشری بجا رہی تھی اور سالوی نے 'فادر کرسمس' کا سوانگ بھرا تھا۔ سُرخ پیجامہ، سرخ عبا، نیلی اونچی مخروطی ٹوپی اور سفید لانبی داڑھی۔ ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ "پیر مغاں" نے بڑھ کر 'فادر کرسمس' سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص اور نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھومر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچتے ناچتے ان کے شانوں پر ذرا آسودگی حاصل کر لینا، موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ "پیر مغاں" نے الیشری کے گلے سے بندھا ہوا ہارمونیم اُتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن پڑ جانے کی مضرت بھولی نہ تھی۔ معتمر وکیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائی اور رات کی پریاں مجسم غزل الغزلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلووں کے خیر مقدم میں عرضِ نغمہ اور گدازیِ رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجاب اُٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے بعد روز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں صحت گاہ کی زمین میں زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوڑھے کرسمس نے سینا ٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر معجزانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے۔ جس میں اسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔

ہم لوگوں نے "پیر مغاں" کی شادی تفریحاً فادر کرسمس، سے کر دی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر مدر کرسمس، تھی۔ "پیر مغاں" اسے "میری گھر میں" کے اصول سے "میری وارڈ میں" کہنے لگے۔ اینتھری باضابطہ طور پر میری 'سالی' بن گئی۔ اور کیتھرن نقی کی بھابی تھی۔ اس نوع کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے۔ مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ پر سندباد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح صحت گاہ کے صحرائی جزیرے میں بیٹھے، سنسار سے الگ تھلگ، انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لئے، بُری بھلی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لاانتہا حسرت تعمیر بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لئے 'ڈے آف' میں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں۔ مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی و دل آویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی پہلے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انھیں حریری رومالوں اور عطر و سینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رواں ہے۔ جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتی ہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رومال اور سینٹ تناسخ کے چکر میں پڑ کر بیسنی روٹی اور پوڈنگ بن گئے۔ استمرار حیات کے لئے روزمرہ کی واقفیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا "نقی بھائی! وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی ...... تب بھائی انور ہم پھر جا کر اسکول میں نام لکھوا سکیں گے نہ؟" اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہہ چلتا۔

"مگر یو منگ، اور بیبنی روٹی اور کٹو بوا کے گیت، طبیعت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے، ہے نہ؟ پھر ہم سِل کے مریضوں سے کون کھُل مِل کرے گا۔ سانپ سے کون کھیلے گا۔ الیٹری بھابی اور کٹو بوا کا پریم کہاں ملے گا؟" نادان اور ریڈ ارمان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لوئرسی وارڈ میں تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چوکھا تھا۔ پربھو بابو اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے وارڈوں سے ہم سب لوگوں سے زیادہ رقابت کرتے تھے۔ وہ سِل و دِق کے ہلاہل میں نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر سمیت کو گوارا بنانے کے لئے بے چین تھے۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ یسوع مسیح کی محبت، برج اور کیرم کے کھیل، نرسوں کا لوچ، جو بھی زخم پر مرہم کا پھاہا رکھ دے، جس سے بھی غم غلط ہو جائے۔ ایک روز گوپال برہم برہم سا ٹہل کر واپس آیا۔ اب اُسے چند فرلانگ چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اُسے امید تھی کہ رفتہ رفتہ اُسے بھائی حاذق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نقی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی۔ اس بک بک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھا۔ اور ہم لوگ سننے کے لئے۔ مگر قہرِ مریض بر جانِ مریض۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب اُلجھن میں گزارا۔ ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اُٹھ کر میرے اور نقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اُٹھ بیٹھے: "کٹو بوا آبزرویشن وارڈ میں مہندر بابو سے ......" گوپال رُک گیا۔ اس کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا: "مہندر بابو نے کٹو کے گال میں ......" اب کے اُس نے بوا نہیں کہا "..... انور بھائی کیتھرن سے مت بولئے۔" گوپال بہت خفا تھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی، کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف، وہ سیدھے میرے پاس آئی۔

"انور بابو! مجھے ٹائی باندھنے نہیں آتی۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے۔ میں آپ

سے ہی تو ملاقی کاناٹ بند ہو اؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی، جھکی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرن نے بھی کا دخیر کرتے وقت غالباً گوپال کو دیکھ لیا تھا۔ یہ جملے آزمائشی تھے۔ جن کے اندر احساسِ لغزش نے مشتبہ پذیرائی کو امید افزا بنانے کے لئے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کردی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اُٹھائے پڑھنے لگا۔ کیتھرن چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر راز کو وہ شرمندۂ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چُپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی۔

"کٹو بوا کا آج ڈے آف ہے۔ وہ شہر نہیں گئیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے مُنہ لپیٹے رو رہی ہیں۔"

ان دنوں ایشری بھی اے وارڈ کے منصف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی۔ میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرن اور ایشری، ان دنوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزہ چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہلِ وارڈ کو بھی مطلع کر دیا۔ پرتھو بابو اور "پیرِ مغاں" نے صاد کیا۔ طے یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرن سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف ایشری سے۔ دوسرے مریض حسبِ سابق میل جول جاری رکھیں۔ ورنہ نرسیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی۔

یہ چُپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے 'اسٹور روم' سے نقی عجیب سی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے علیحدہ لے جا کر کہنے لگا۔ "سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے۔ مگر سیلاب کو سیلاب بھی کہیں روک پاتا ہے۔ چلو کشیدگی ہو چکی۔"

ایشری کی شخصیت کی طوفان وشی نقی کی شعلہ مزاجی کو نگھا جھل گئی۔ میں نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا۔ "منصف بھی کیا یاد کرے گا۔"

میں نے جواب دیا ۔۔۔ "مگر تم ایشری کو اپنا تو نہ سکے۔"

"تو کیا تم نے چُپ رہ کر کیتھرن کو اپنا لیا؟" وہ تنک کر بولا۔ اور پھر کامیابی کی ہنسی

ہنسنے لگا۔ میں نے واقعیت کا ٹھوس پن اور جذبات پروری کی نامرادی کا زہر محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ کرسمس نے ہم لوگوں کی توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ اور توقعات کا قیام محض نامرادی میں بس بھر دیتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ نقی حقیقت پسند تھا اور میں ذرا شالی بلندیوں پر اُڑ کر غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی۔

دو تین روز کے بعد میں اور نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیر جاتے تھے۔ بادِ شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطف پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق ہمدردانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کیف بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔

اچانک خوش گوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

"پاگلوں کو دیکھو۔" کیتھرن کی لوچدار آواز عین عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے۔ چاند سے پریم ہو رہا ہے؟" یہ ایسٹری کی شوخ بولی ٹھولی تھی۔

میں نے کہا "آؤ ایسٹری! تم سے پریم کریں!"

"واہ! میں کیوں آؤں؟ اوہ ...... رے ...... رے! دیکھو نا، کتو لوا تمھیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرن میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں 'کولکیلسیم' کا انجکشن دیا ہے۔ یہی! کتنا پھول گیا ہے۔ بہت بے درد ہے انور بابو ......" اس نے مترحم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا ...... میں بیگانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی۔

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لئے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہو۔

اور ہمارا اپنا کون بیٹھا ہوا ہے؟ نھنی تو یتیم ہے نا اور مَیں...... میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جائے ٹی بی، مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرن کے لنگس بہت کمزور ہیں...... اسی لئے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل نھنی کوارٹر! فوراً اسپنگ دے اسے......"

وہ ایشری سے مخاطب ہو کر اُٹھنے لگی۔ نفی نے بڑھ کر کیتھرن کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"جس ڈالی پر مَیں گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آئی تھی وہ ڈالی اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میری پوچھ کرے۔"

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرستش نے سکوت کی مہر توڑ دی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ مَیں نے گوپال والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرن نے ایشری سے کہا۔

"سنتی ہے نھنی؟ مَیں مہندر کے حلق میں "منڈلس پینٹ" لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا انور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ مَیں تو اسی وقت ڈر گئی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانیں۔"

ایشری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اتنا جانتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ بادِ شمال ان کے جانے کے بعد ذرا دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز "پیرِ مغاں" صحت گاہ سے چل دیئے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انھیں پریکٹس کی اجازت بھی دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیرِ مغاں" بھی ہنستے ہوئے "اپنی وارڈ میں" سے رخصت ہوئے۔ مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے۔ تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ کتنے درد آگیں اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گذارے تھے۔

بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غم گسار۔ ہفتوں وارڈ سُونا سُونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "پیر مغاں" منتخب کیا اور صحت گاہ اپنے زخم و مرہم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سینا ٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے، مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ ہائے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں! پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سیر کی انھیں اجازت تو تھی۔ لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ صحت گاہ میں صرف ایک ہی رکشا تھا۔ وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پرشکستگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ انجان مستقبل کا خوف بھی انھیں رُلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔

ہم لوگ اسٹیشن تک انھیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس ولاری رہ رہ کر روئے دیتی ہے، وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے سبھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سینا ٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچک دار حالت ہے۔ کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے سل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے اور اب ہمارے پھیپھڑے اُن کیڑوں کو کھا رہے تھے۔ محاذ کا رُخ کب پلٹ جائے۔ یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لیے متواتر کے ساتھ تمثیل و اداکاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرن اور رایشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور ان دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اُجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا ر نو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرن سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھانا چاہتی تھی۔

"انور بابو، تیرہ سال کے سن سے مَیں مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ مَیں نادان تھی۔ مَیں نادان تھی۔ مَیں نے چمک، دمک کی طرف رُخ کیا۔ بہت برا ہوا انور بابو۔" کیتھرن نے ایک بار کہا۔

"آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے۔" مَیں بولا۔

"تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں۔ دوسروں کے لیئے اچھی بنو۔ پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں۔ عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو۔ سب کچھ، اور داسی عزت بھی نہ دیں۔" کیتھرن بیزاری سے کہہ اُٹھی۔

"سب تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"کون؟ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے اور مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں۔ انور بابو جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ شادی کر لوں گی۔ کر لوں؟" کیتھرن ہنسنے لگی۔

"ضرور کر لیجیئے!"

"کرادونا؟" اُسے کرادیجیئے کہنا تھا۔ اُس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے اُسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس 'کرادونا' کی بے تکلفی میں 'یوں ہوتا تو کیا ہوتا' کی حسرت پوشیدہ تھی۔

"ہم سِل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔" مَیں نے یہ پھُس سا جواب دیا۔

"تم نرسوں کو نہیں سمجھے انور بابو۔" اب کے بھی 'تم' تھا۔

کیتھرن بڑی غمگین نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پیچ پیچ وخاردار راستوں کی طرح سامنے آگئیں۔

کیتھرن اس نوع کی درد آشنا بات چیت کی پیاسی تھی۔ لیکن الیشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو الیشری اُکتا جاتی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی۔ حال اس کے

لیے سب کچھ تھا - اپنی شادکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نعی نے ایک بار الیشری سے کہا۔

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں ؟"

الیشری نے جواب دیا۔

"کتنے مردوں سے شادی کروں ؟ سب ہی تو شکنجے میں جکڑ کر اپنی من مانی مُرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں ؟"

نرس سلومی کو تجسس اور ادھر کی بات اُدھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرن کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سنائے اور حال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرن نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر، گھوش، وہ ہڈیوں کی ٹی - بی والا ذی فراش مریض ہر یشچندر ا سبھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک، کمپاؤنڈر، ایکسرے بابو یہ سبھی اس کے گھائل رہ چکے تھے۔ پردہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت کا لڑکا تھا نا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کیتھرن نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دیئے تھے، اور کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور الیشری کا تو یہ عالم تھا کہ نعی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اُونی سوئیٹر، چائے کا طشت، گرم پائجامے، مفلر وغیرہ تحفے نعی کو دیئے تھے۔ ایک بار وہ نعی کا سوٹ بنوانے پر مُصر تھی مگر نعی نے انکار کر دیا۔ الیشری کئی دنوں تک روٹھی رہی۔ اس نے تُنکا تُنکا کہا۔ "آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے ؟"

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اڑتیس سالہ میگی اور سین گپتا! سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا، بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے سینیٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی اُلفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مُربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اُسے اپنا سہارا، اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ الیشری نے بتایا کہ جب

نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرۂ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی حیثیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں رد کیا، جیسے ماں بیمار بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایشری اور منگی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایشری مُردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زندہ ساریاں، اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اُسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نقی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ منگو گھریلو چکّی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سینا ٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکسرے اسکرین بھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا تھا کہ منگی اور نرس سوشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یہ نئی نرس سوشیلا، سلومی کی جگہ پر بلائی گئی تھی۔ کیونکہ سلومی نوکری سے استعفا دے کر ایک موٹر ڈرائیور سے شادی کرنے دلّی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسری صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی۔ لیکن مسلسل گھر پرانے گِنے لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اونچے خاندان کے لوگ، بڑے لوگ۔ خلقت تو بائیل کی بددعا کی شکار رہتی ہے۔ "تیرے لئے اس زمین پر لعنتیں ہیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم و اندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ تپتے چہرے کے پسینے میں تر اور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔"

سلومی چلی گئی۔ اب وہ پھر نوکی تو تھیں۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے۔ مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تھے۔ تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے ایسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہئے۔ سوشیلا کے اظہارِ خلوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی۔ بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پٹا کرتے تھے، چپت کھاتے تھے۔ کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اُٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے۔ ورنہ وہ شہیدِ ناز ہو ہی چکے تھے۔ یہ حسنِ زنگار ترک ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق ردِّ بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر وہ خود ہی سینا ٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر سی وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو مسکراتے ہوئے

رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرک پر جمی رہی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انھیں لگاؤ تھا وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور منصر جی بھی۔ مگر منصر جی یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہے۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے۔ نرسوں سے مل مل کر روئے بھی، مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سینا ٹوریم کا ڈاکٹر نسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر سی وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ ذی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلنے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دل چسپی ضامن حیات ہے۔ ارادۂ زیست بقا کا سب سے زبردست سامان ہے۔ بددل اکتائے ہوئے فکرمند مریض اپنی قبر کھودتے ہیں۔

اپر سی وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی۔ لیکن ان میں حیات کی اُمنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادۂ بقا فکرمندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس حسین کرہ کے نیرنگِ حیات نہ اُن کی نیکیوں کو اُکساتے تھے اور نہ بدیوں کو۔ ان کے لئے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مرجائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک ذہنی لاشئے ہو جاتا ہے۔ زندگی کا پرتو تک کہاں!

وارڈ میں جو نئے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اُٹھا رہے تھے۔ مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے۔ ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ تقی، مَیں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور رمار واڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر اُلجھ پڑتے تھے۔ آج مارتھا سے لڑائی ہوئی۔ کل فیبی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آتی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں، یا جنھیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں۔ ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری صحت گاہ میں

ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں الیشری کو کسی سے رقابت نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی کرے بس وہ اتنا کہتی "چپ کرو" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سیناٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جُبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا اربعہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئرسی وارڈ اوّل آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی کو مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کی بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہیئے۔ کبھی انسان غم مناکر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں۔ اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد ہنسوڑ اور چونچال ہو گئی تھی۔ جُبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجب حال تھا۔ ہنسی ہنسی میں وہ ناگفتنی باتوں کا تذکرہ کر ڈالتی تھی۔ اب کے اُس نے اپنے گھر کی کرسچن کالونی کے قریب مویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات تک کا تذکرہ کرتی اور ہنسی پڑتی تھی۔

ٹھیک جُبلی کے روز دس بجے دن کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلو کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی، لانبے لانبے بال، اور درشت ناک، چھوٹی آنکھیں اور بیزار و باغی جذبات سے تلملایا ہوا چہرہ، لانبا قد، دوہرا بدن مگر بیماری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اُسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سارے سیناٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی، ریڈیو بجا، کھیل کود ہوا، نرسوں نے گانے گائے۔ غرض بڑی تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی اچانک علالت کے سبب ڈولی کی نائٹ ڈیوٹی ہو گئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنی جی بہلا کر وارڈ واپس آئے تو پہلو کے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب لوگ افسردہ ہو گئے۔ مگر ڈولی اُدھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تُلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی حرتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جاں فشار خون فشانیوں کے عادی بھی ہو گئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کر کے کسی نے مجھے جگایا۔ مَیں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مَیں کچی نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی، وہ بے قرار سی معلوم ہوئی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دیئے۔ میری نیند غائب ہو گئی۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ مَیں نے یک بہ یک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی ایک سیاہ آندھی تھی۔ روح تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے پلنگ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انھوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کروٹیں لینی شروع کیں۔ لوہے کا اسپرنگ دار بیڈ ردِّ بلا کے لیے طلسم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سیناٹوریم میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ کھور کوا۔ اے وارڈ کے چوبے جی نے ڈولی کا سارا راز ہر دو دہ کر دیا۔ برہمن تھے تا بس پی کر بھی آنند ہی ہوئے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کراہت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دم پکڑ کر اُسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کو ہوتی ہے۔ مگر ڈسے جانے کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سہا دیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی نیتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے چوبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں۔ اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے لڑنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت اُنھیں انتقام کے لیے اُکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈولی سے سخت لڑائی ہو گئی۔ اس نے ایک نئے مریض خان صاحب کو بس اتنا کہا تھا "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ مَیں حلق میں پینٹ لگانے کے لیے کب سے کھڑی ہوں۔" خان بگڑ گیا تھا۔ مَیں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی۔ اور بڑھی تو اتنی کہ مَیں نے ڈولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ مَیں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ سلسلۂ کلام قطعی بند۔ الیشری اور کیتھرن نے بات کو سلجھانا چاہا۔ لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سیناٹوریم میں ہو گئے تھے اور نعیؔ کو ایک سال سے کچھ زیادہ۔ ہم دونوں

اُگنا گئے۔ مگر گرمیاں در پیش تھیں اور اس موسم میں سینا ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملے کا ارادہ کیا۔ کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ مجھی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینی ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے ذی فراش رہنے کے بعد اُسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا اور گاہے معمولی سی بات پر ہنسنے لگتا۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پرواہ تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرسشِ دوستانہ کے تحت آتیں۔ اس کا کوئی ماموں برما سے روپیہ بھیجتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی یا نہیں، یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالی دیتا تھا۔ کہتا۔ "اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا۔ اور اب مسلسل خوف، جینے کی مصیبت، گرنے کا ڈر، سل کے مریض کا علاج سینا ٹوریم سے جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا، ہونہہ! آرام! استراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوا اور مکان! اور کچھ فکر نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری کے پہلے ہمارے پیٹ بھر ہی تو رہے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا سماج اور حکومت کا فرض ہے کہ بیماروں کا علاج کرانا۔۔۔" اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا۔ "جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا کیوں گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے اور نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس، فورڈ کے پاس، برلا کے پاس، جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقت ور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر نوعِ انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر فرد کو ہلاک کر دیا جائے۔"

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ وہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا، بچوں کی طرح۔ اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ حیات کی

آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا۔

"اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔"

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس دلآری اور کیتھرن کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ دلآری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے لٹائے۔ ہم لوگوں نے بھی بہترا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی اُبکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا۔ مگر اس روز جب کیتھرن نے اُسے آکر اپنے خاص انداز سے کہا "کرن بابو!" تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرن کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے اِن دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور رفیق اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلوانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جریانِ خون کے دورے کے وقت وہ بالکل لاہو ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اُٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک سنتا یا کیتھرن کی مان لیتا۔ کیتھرن نے مجھ سے دوپہر کو آکر کہا۔ "انور بابو! میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی، پاگل ہے بالکل۔ آپ کا خیال کچھ کرتا ہے۔ ریسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجیے گا۔" مجھے اسی وقت کرن سے بجلی کے کوندے کی طرح کی رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرن کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہرحال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرن نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرن کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرن کرن کے لیے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اے۔ بی۔ ڈی، ہارس سیرم، کیلشیم، ایٹمین، مورفیا، اور کونگورڈ کے انجکشن دیئے۔ مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت

نازک ہوگئی۔ میں اور نیتی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بہ یک جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے رقیق غذا کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی رقت اور لجاجت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے مُنہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اُس کے مُنھ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بہ یک جیسے کسی نے اس روشنائی کو جاذب سے اُٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کالا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہ سے چُھپانے کے لئے فوراً اپنے بیسیوں سے کرن کے لئے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلایا۔ وہ بے پایاں ممنونیت کی نظر سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں "تم خدا سے بہتر ہو۔"

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سبھوں کو حیرت ہوئی اور کیتھرن کو حیرت کے ساتھ ناقابلِ بیان نوعیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتۂ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرن پر فقرے کسنے لگا۔ وہ قسمیں کھاتی اور صرف کہتی۔ "وہ پاگل ہے، بیچارہ کرن!" اس بیچارہ سے مجھے چڑ تھی مگر حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی نادان مگر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھوٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرن سے، مجھ سے، اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا۔ پر جیلی کو یاد کر کے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا "وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی۔ تمھاری خالص محبت تھی، حیوانی، بے عقل، آزاد، مہیب مگر پیاری اور اندھی محبت۔ پر میں تمھیں اس محبت کے طفیل میں بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرن۔" اس نفرت کے باوجود کیتھرن کرن کو چاہتی رہی۔ وہ اس کے لئے کُڑھتی رہی۔ کہتی۔ "ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوئے ہیں۔"

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرن کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی مجنونانہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچی تھی، یا اس کی بے پناہ پر شوخ ذہنی قوت کے سبب۔ وہ اب بھی میرے پاس آ آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے

متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کر پائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح تلملاتا رہا۔

گرمیوں میں سِل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں۔ لیکن کچھ ایسی قوتیں بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جا سکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی سنشش و پنج کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر چھائے جاتے ہیں۔ اِے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کسے ہٹایا جاتا؟ وہاں والوں کی رگوں میں بھی تو خون تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر موقع ملنے پر ان بیش قیمت ہستیوں کو اِے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، نقی اور جونیر وکیل صاحب کو بہ یک قلم ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی، بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے۔ مگر جون کے مہینے میں سینا ٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حِس میرے دوسرے احساسات پر غالب آگئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا۔ وہ پہلے بہت خوش ہوا۔ پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ رونے لگا۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ گیا" انور بھائی تم بھی چلو نہ۔ گھر جائیں ہم انور بھائی؟ وہاں اے۔ پی کون دے گا؟ جاڑے میں جاتے یہاں سے، ساڑھے تین برس اِسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بڑ پر ہو گئے" گوپال نے اپنے خاص گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں اُمڈ آئیں۔ "پھر ہم سب لوگ، نقی بھائی، آپ، پیر میاں، منصر جی، بھائی حاذق، پر بھو بابو۔ انور بھائی، ہم پانچوں آدمی، چلیے شہر کے کنارے کرایہ کا مکان لے کر رہیں۔" اُس نے اِس پروگرام کی دِقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سیناٹوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کے نوع در نوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔ جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے

پانی کا سوتا رس رہا ہو۔

نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سُنا۔ ایسٹری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے روز جا رہے تھے۔ ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ دُکھ، درد، امید و ناامیدی، خوشی اور موت، رفاقت اور غم گُساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں وعدے وعید ہوئے۔ کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ نوٹ سی وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے۔ مگر اس ناقابل بیان مسرت کے ساتھ شکستِ رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینا ٹوریم کی رفاقت بھی میدانِ جنگ کی رفاقت سے کم نہیں، کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جُل کر مقابلہ کیا تھا! کتنی ناامیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی! کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا! مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں، تاریک صُبحیں، دلداریاں، غم گُساریاں، ہمدردیاں سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی، وقتی ہی سہی، فتح کے احساس سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ، زمانہ ہر دانے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکّی میں پیس لیتا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایسٹری نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایسٹری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی۔ جیسے نقی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہوں، جسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لئے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو، وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انھیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اُس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بے باک خلوص کے ساتھ کہا۔

"اگر مجھے خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جا رہے ہو تو مَیں دُعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ مَیں تمھیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی"۔

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور مَیں رہ گیا۔ نو مریض اور تھے۔ پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں لگ رہا تھا، بیزار، اُکتایا ہوا، اور کچھ

خائف، تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر، کیتھرن نے میری بڑی دلدہی کی۔
لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یہ محسوس کرتا تھا کہ میں دنیا میں یکہ و تنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آسکتا۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ آنی جانی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک۔ ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھتے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گذر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے سراسر فریب۔
مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرن نے دو دن کے لئے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب کسی دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ سچ ہے کوئی جھنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ وصالِ داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریب احساس ہے۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرن کو صاف کہہ دیا۔ "دھوکا دینے سے کیا فائدہ۔ آپ کرن کو چاہتی ہیں چاہیے۔" وہ بگڑ گئی۔

"چاہتی تو ہوں مگر .... اور آپ کتنے تنگ نظر، سنگدل، بدظن اور نااعتبار ہیں؟"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھے کہے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا۔ مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ ستم میری خودی کا دم گھونٹے رہا تھا۔ میں تلملا گیا۔ کیتھرن نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کھچی چیزیں نکالیں اور انھیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انھیں کیتھرن کے ہاتھ میں دینا چاہا پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر بھنّاتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں ان کے سامنے پٹک دیں اور لوٹ آیا۔ کیتھرن بپھر گئی اور میں نے واپس ہوتے ہوئے یہ جملے سنے۔

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ کس پہ ناز کرتے ہیں۔ مغرور آدمی! میں کسی کی بیاہتا نہیں ہوں۔ بڑے آئے کہیں کے ......!"

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں۔ کوئی تسکین نہیں۔

کرن کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صُبح کو میرے مُنھ سے خون آ گیا۔ مَیں بستر پر لیٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دُنیا، یہ کرہ سارے سامان حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح سَن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور مَیں خلا، تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپے جا رہی ہیں اور مَیں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور یاس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بُنا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا۔ اور اب ایک نئی آندھی آشیانۂ حیات کو نوچ نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ مَیں نے کتنی باتوں کو بُھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہارِ تازہ کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پھر فریب تمنا دے رہا تھا، اور یکایک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی۔ ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت!

زندگی کی نیرنگی ناامیدیوں میں بھی امید کے بُت تراش لیتی ہے۔ یہ کیفیت گذر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا "شاید کیترن یوں واپس آ جائے۔ شاید یہ روایتی خون ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے" مجھے مسرت ہوئی۔ مَیں نے زہر سے امرت بنا لیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے۔ وہ ہر آن اپنے کو بچانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے۔ خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذتِ آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی بار بستر کر دیا گیا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے۔ ٹی بی کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوئے سوئے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پرانے زخم میں فائبروس ہو چکا ہے، ننھے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آ گیا ہے۔ یہ گذر جانے والا دور ہے۔ گھبراؤ مت!" نرسوں نے بھی عیادت کی، جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر مَیں عجیب حالت میں تھا۔

گزشتہ سال جو میرے مُنھ سے ایک ماہ تک خون آ آ رہا تھا تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لئے روحانی مابعد الطبیعاتی عالم کی طرف رُخ کیا تھا۔ اب کے میرا دل بنجر تھا، بالکل بنجر۔ مگر بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے حواسی عشرت کی طلب ہوئی۔ مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے۔ لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ جسم اور دنیا کی شدید جریصانہ محبت پیدا کر دی۔ جو چیزیں چھوٹ جانے والی ہوں اُن سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے۔ پائدار اشیاء تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، وزنی، اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر و ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ عورت ہے، مادہ کا نقطہ کمال، جسم کے حسنِ تعمیر کا عروج جمیل۔ اس لئے مادی سہاروں میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔

مَیں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تو دل میں ایک ہوک اُٹھتی تھی اور حیات کا ذرہ ذرہ جنس لطیف کو ڈھونڈتا تھا۔ مجھے اُٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر جذبۂ دل ایسی حرکتوں پر اُکساتا تھا جو سامانِ بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگتی۔ مَیں سوچتا کہ نرا گاؤدی ہوں۔ بدن کی رومانیت مجسّم اور حقیقتِ مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں میں اُلجھے رہنا، بے بسی، بے کلی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے نفی اور اس کی قوتِ اقدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی و ناکارکردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا المناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ مَیں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انھیں چھونا، سُننا، دیکھنا، سونگھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔ عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو ہمارے سارے حواس کو بہ یک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے مُنھ سے خون آتا، مَیں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ، اپنی انگلیاں بہت عزیز معلوم ہوتیں۔ مَیں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار مَیں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہ تھا۔ مَیں تے جو امید قائم کی تھی کہ کیفیتِ

اس حال میں تو ضرور مجھ سے من ہی جائے گی، ٹوٹ گئی۔ کیتھرن بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک نہ دریافت کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرن کتنی خود دار و خود بیں تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈورلی، جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی، وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری علالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ میں چُپ چاپ رہا، خفگی سے نہیں شرمندگی سے۔ اس وقت وہ چارٹ دیکھ کر چلی گئی۔ پھر وہ برابر آتی رہی۔ مجھے وارڈ کی بیگانگی سے وحشت ہوتی تھی۔ لہذا مجھے معائنہ کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو ڈورلی مزاج پرسی کے لئے آئی۔ میں انتہائی ندامت میں گڑ گیا اور ہیجان جذبات نے مجھے رو پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈورلی کا ہاتھ پکڑ کر بہ رقت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اتنا کہا۔ "انور صاحب آپ نہیں جانتے"...

میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کمیاب حسن کی چند نورانی کلیاں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ انوکھے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو ناپید اکنار سمندر بنا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔

آخر کار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور سینا ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت اکتا بھی گیا تھا۔ ادھر کیتھرن نے مجھ سے روٹھ کر اپنی زندگی ہی بدل لی تھی۔ وہ سب سے تعلق توڑ چکی تھی۔ اگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو اور لوگوں سے بھی گریزاں ہی رہتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کے تجربات تلخ و شیریں کے بعد شکست فریب کی تلخیاں برداشت کر رہی تھی۔ اب وہ صرف کھیلنا نہیں، زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

درخت کا اکھڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ دروں زندگی میں سب سے بڑا دکھ انتقال ہے جڑیں وصل زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراہنے لگتی ہیں۔ میری حیات کا درخت بھی صحت گاہ میں ڈیڑھ سال تک نصب رہا تھا۔ اور اب علیحدگی کے وقت اعصاب کے شوریدہ و دردناک ہو

رہے تھے میں رخصت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی اقامت گاہ کو گیا۔ سب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سبھوں نے بڑے اُنس اور خلوص سے میری پذیرائی کی اور بعض نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر کیتھرن وہاں بھی خاموش رہی۔

رخصت کی صبح کو ایشتری نے مجھ سے کہا۔ "کٹو ساری رات بھر روتی رہی ہیں اور ڈولی بھی۔ آپ کو سبھی لوگ چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جو میری خطرناک حالت میں بھی بیگانہ رہا ہو، وہ بلاؤز کے پیرس بٹن ٹوٹ جانے پر تو رو سکتا ہے مگر میرے لئے اس کے آنسو کی ایک بوند نہیں ہو سکتی۔ ہاں ڈولی سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

ایشتری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرن آئی اور اس نے ایشتری کو ڈیوٹی روم میں بلا لیا۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور ہنس کر کہنے لگی۔

"جائیے مل لیجئے! بوا بلاتی ہیں!"

نہ جانے کیوں میں ارادے کے خلاف اندر چلا گیا اور ایشتری وارڈ میں مریضوں کا ٹمپریچر لینے چلی گئی۔

خوددار و خودبیں کیتھرن کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جذباتی انداز میں پکڑ لیا اور اسی حال میں میز پر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے اپنے آنسو دکھلانے میں بھی عار تھی۔ اچانک اس نے سر اُٹھا کر کہا۔

"انور بابو! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا۔ بس ایک گڑیا، ایک گڑیا، ایک گڑیا؟"

"کلیاں اور کانٹے"

اکتاہٹ

ایک اجنبی 'پورچ' میں نمودار ہوا۔ اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا ملاقاتی کمرے کے سامنے دالان میں آکر رکا۔

"ڈاکٹر جوزف تشریف رکھتے ہیں؟"

مس نینسی سنتانم نے ریڈیو سٹ کے قریب سے اٹھتے ہوئے اجنبی کی زبانی یہ سوال سنا۔ وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اجنبی نہایت سادہ لباس میں ملبوس تھا، ملگجی سفید قمیص اور اجلے زین کا ڈھیلا ڈھالا پینٹ جس کی کریزیں درست نہ تھیں۔ پاؤں میں چپل، چہرہ ہر رنگ و روغن سے خالی۔ مس نینسی اور اجنبی آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اجنبی نے نینسی کی سیاہ، ملائمی، گہری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مکرر سوال کیا۔

"ڈاکٹر جوزف سنتانم تشریف رکھتے ہیں؟"

ڈاکٹر سنتانم کی پُر فضا کوٹھی پر سناٹا طاری تھا۔ ملاقاتی کمرے کے ایک خوب صورت گوشے سے اٹھتا ہوا ریڈیو کا نغمہ آبشار کوہستان کی موسیقی کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ نینسی اپنے گداز شانوں پر گھنیرے بال بکھرائے، پُر پیچ ساڑی میں لپٹی سروِ خاموش کی طرح کھڑی تھی۔ احاطہ میں جھوا اور یوکلپٹس کے درخت تازہ بارش میں نہائے ہوئے ایستادہ تھے۔ ابھی ابھی بوندا باندی تھمی تھی۔ آسمان پر ابر گھرا ہوا تھا۔ ہوا تھم گئی تھی۔ پرندے گھونسلوں میں ہنوز چھپے بیٹھے تھے۔ فطرت خاموش تھی۔ اور نینسی چپ تھی۔

"میں ڈاکٹر سنتانم سے ملنا چاہتا ہوں — ہیں وہ؟" اجنبی نے کہا۔

نینسی نے جواباً سر ہلا دیا، انکار میں۔

"کوئی بھی گھر پر نہیں؟ ۔ مسز سنتانم؟"

"نہیں!"

نینسی نے محسوس کیا کہ اجنبی میں جھجک نام کو نہیں۔ اس کی نگاہوں میں شوخ دلیری تھی۔ اس کا لب ولہجہ بے باک تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ وہ کسی نہ کسی سے مل کر ہی جانے پر تُلا ہوا ہے۔ نینسی سختی سے کہنا چاہتی تھی "نہیں، کوئی بھی نہیں۔ آپ کسی سے بھی نہیں مل سکتے۔" وہ ریڈیو کے نغمات میں اُلجھی ہوئی اس اُداس شام کو ایک مُبہم انتظار میں غرق رہ کر بتانا چاہتی تھی۔ اور اجنبی کی مداخلت اسے بہت ہی کھل رہی تھی۔ لیکن وہ مہذب لڑکی تھی۔ اُس نے صرف ایک بیگانہ سی 'نہیں' کہنے پر ہی اکتفا کی، اور سمجھی کہ بلا ٹل جائے گی۔

"آپ مجھے کاغذ کا ایک پُرزہ دے سکتی ہیں؟ ڈاکٹر سنتانم سے بے ملے لوٹ جانا بڑی بداخلاقی ہوگی، وہ کس وقت واپس آئیں گے؟" اجنبی نے ملاقاتی کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

اب وہ نینسی کے قریب کھڑا، اس کے سراپا کا بڑی یگانگت سے جائزہ لے رہا تھا۔

"قریباً دس بجے رات کو! یا اس سے بھی دیر میں" نینسی نے خلجان کے ساتھ جواب دیا۔

"تو پھر میں ایک نوٹ چھوڑ ہی جاؤں۔ مجھے تاسف ہے کہ میں اب تک ڈاکٹر سنتانم سے نہیں مل سکا۔ وہ میرے محسن ہیں۔ مجھے کاغذ اور قلم بھی عنایت کیجیے۔"

اجنبی نے ملاقاتی کمرے کے ایک صوفہ پر اپنے لانبے قد کو بڑے آرام واطمینان سے ڈالتے ہوئے اور اپنے جیب میں قلم ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

نینسی اپنے چھریرے اور سڈول جسم میں بیزاری کے خم پیدا کرتی ہوئی پہلو کے کمرے میں چلی گئی۔ اجنبی بیٹھے ہوئے ڈرائنگ روم کے باہر، احاطہ سے آگے، ملحق سبزہ زاروں سے پرے، ندی کے اُس پار، زمردیں کہساروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہریالے درختوں پر، اودی اودی بدلیاں اپنے سائے ڈال رہی تھیں، اچانک ترشح ہونے لگا۔ چھوٹا ناگ پور کی سطحِ مرتفع پر سرشار ہوائیں چلنے لگیں اور سیہ مست تیلی بے زنجیر ابر امنڈ نے گھمنڈ نے لگے۔ جیسے اُبھرے ہوئے سینوں پر کالی کالی لٹیں جوشِ شباب کے البیلے پن میں چھنک چھنک جائیں۔

ریڈیو اب کوئی فیچر نشر کر رہا تھا۔ نینسی تیکھے انداز سے ڈرائنگ روم میں واپس آئی۔ لیٹر پیڈ اور قلم اجنبی کی طرف بڑھایا اور ریڈیو کے قریب بے پروائی سے بیٹھ کر نشریات کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ کبیدہ خاطر معلوم ہو رہی تھی۔ اجنبی نے ڈاکٹر سنتانم کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ اور لکھتے لکھتے رک کر نینسی سے مخاطب ہوا۔

"آپ مجھے پہچان نہ سکیں۔ نو سال گذر گئے، نو سال۔ اُن دنوں آپ گیارہ بارہ سال کی ہوں گی۔ غالباً آپ نینسی ہیں اور فینسی کہاں ہیں؟ آپ نینسی ہی ہیں۔ ضرور۔ میں بڑی بڑی حقنا جیسی آنکھوں والی نینسی کو پہچاننے کے بارے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ اور آپ کی بہن شرمیلی فینسی۔ وہ تو اُس وقت نو دس سال کی گڑیا تھی۔ اور یوکن کہاں ہیں؟ وہ تو لمبے تڑنگے جوان ہو گئے ہوں گے۔ اور رڈ فرن؟........"

نینسی کی پیشانی کی شکنیں مٹتی گئیں۔ اب وہ نیم نگاہی سے اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ اور اجنبی شاید بالکل اجنبی نہ تھا!

"— لیکن میں یہ نہ سمجھا تھا کہ نینسی اتنی شاندار اور دل کش خاتون بن جائیں گی۔ اوہ! آپ اپنی والدہ سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں! یہ تو بتلایئے، آپ نینسی ہیں نا؟"

اجنبی کے زانو پر پیڈ دھرا تھا۔ ہاتھ میں قلم اونگھ رہا تھا اور وہ سرگرم سخن تھا۔ نینسی کے صاف، صندلی چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور رخساروں پر موہنیاں نمودار ہو گئیں۔

"بے شک بے شک! آپ نینسی ہیں۔ میں ان موہنیوں کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ کہئے نا! آپ نینسی ہیں — بے خطا!"

مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

"میں نینسی ہی ہوں"

"ماں کی کتنی جھلک ہے آپ میں۔ یہ موہنیاں بھی......"

"نہیں، میں ممی سے زیادہ مشابہت تو نہیں رکھتی۔ میرا قد تو ڈیڈی کا ہے" نینسی نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں، ہاں، آپ کا قد بالا ڈاکٹر سنتانم کے ڈھنگ کا ہے۔ کتنا دل آویز اور موزوں قد

ہے! کیسی رعنائی ہے خرام میں۔ رنگ بھی مسز سنتانم سے زیادہ صاف ہے۔ غالباً آپ کی چھوٹی خالہ، آپ سے زیادہ حماثل تھیں۔ مگر قد! ...."

"شکر خدا کا کہ میں قد کے اعتبار سے ڈیڈی پر اُتری ہیں پست قد ہونا کبھی پسند نہیں کرتی تھی!" نینسی نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ بشاش تھی اور اس کا کھلتا ہوا چہرہ تاباں تر ہو گیا۔ اس نے ساری کے پلو کو سجل کرتے اور سینے پر تنتے ہوئے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔

"مگر آپ نے تو اپنا تعارف کرایا ہی نہیں۔"

"میں فرحت ہوں۔ آپ کے خاندان کا دیرینہ واقف کار۔ ڈاکٹر سنتانم میرے محسن ہیں۔ میں اُن کے احسانات فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف میرے معالج ہی نہیں، بلکہ میرے غم گسار بھی ہیں۔ اور مسز سنتانم کی نوازشوں نے تو مجھے زندہ کیا ہے۔ کتنی گھریلو فضا تھی صحت گاہ کی! میں تو اپنے کو ڈاکٹر سنتانم کے خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ کیا آپ فرحت کو بھول گئیں؟ آپ کو وہ ڈرامے یاد نہیں؟ ہر ماہ ایک ڈراما ہوا کرتا تھا۔ آپ اور نینسی اور یوکن، میری اداکاری کی نقلیں اُتارتے تھے!"

"اچھا آپ فرحت ہیں! دو فرحت ہوا کرتے تھے اُن دنوں۔ مجھے وہ زمانہ بہت یاد آتا ہے۔ بلنک اور وحشت ڈرائیو، اور پُر رونق کرسمس۔ اور چہکتی ہوئی نرسیں۔ آپ کو ایکٹنگ کا ذوق تھا۔ اور پکنک میں آپ ہم سب کو اپنے لطیفوں سے ہنساتے تھے۔ اُن دوسرے فرحت صاحب کو فوٹو گرافی سے شوق تھا۔ گپتا، کملا، ڈیوڈ، آنور، مس ونسلوا مس ستھا سبھی بڑے اچھے لوگ تھے۔ میں تو چاہتی ہوں، وہ دن لوٹ آتے!"

نینسی نے غمگین، رومانی، حسرت آمیز لذت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں پھر کل آؤں گا۔ ڈاکٹر سنتانم سے ملنا ضرور ہے۔ نینسی، یوکن اور ڈفرن کی بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں۔ کہاں ہیں وہ —؟"

"یوکن مدراس میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں ہیں۔ کل ہی پرسوں تو وہ یہاں سے چھٹیوں کے بعد گئے ہیں — آپ کوئی شربت پئیں گے نا!"

نینسی اُٹھ کر شربت بنانے چلی گئی۔ اور فرحت خط پورا کرنے لگا۔

"آرینج اسکوئش آپ پسند کریں گے نا! لیجئے حاضر ہے۔"

"بہت شکریہ! آپ نے بڑی تکلیف کی۔"

"آپ کیا کر رہے ہیں مسٹر فرحت؟" نینسی نے نہایت رغبت سے دریافت کیا۔

"میں ایک آزاد صحافی ہوں مس نینسی! تحریر اور سفر، یہی میرے مشغلے ہیں۔"

"نہایت خوب شغل ہے۔ آپ کو سنیما سے بھی شوق ہے؟ مجھے تو اس کا شوق فراواں ہے۔ آج ہی میں فینسی کے ساتھ فلم دیکھنا چاہتی تھی، مگر ڈیڈی اور ممی دونوں اپنے ہیلتھ کلنک چلے گئے، اور مجھے ڈفرن کی دیکھ بھال کے لئے یہاں رک گئے۔ کسی کو تو گھر پر رہنا تھا۔ ڈفرن بہت ہی پاجی لڑکا ہے۔ دیکھئے نا! اس بارش میں بھی وہ سائیکلنگ کے لئے باہر نکل گیا ہے۔ اور میں تنہا اکتائی اکتائی بیٹھی ہوں۔ یہاں سوشل لائف بھی نہیں۔ یہ کوہستانی شہر ویرانہ ہے۔ ویرانہ — بالکل جی نہیں لگتا۔ اُداس شامیں، بھیگی صبحیں، بھائیں بھائیں کرتے ہوئے دن اور سپاٹ، بے کیف راتیں۔ یا اللہ"! نینسی نے بڑی بیزاری سے کہا۔

"اچھا، اُن نو سالوں کا تو حال سنائیے! میں آپ لوگوں کے بارے میں جاننے کے لئے مر رہا ہوں۔" فرحت نے آرنج کے سنہرے شربت کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے استدعا کی۔

"ڈیڈی صحت گاہ کی نظامت سے علٰحدہ ہو کر، چند سال پہلے یہاں اس شہر میں آرہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں، پھر ہم سب لوگ پونا چلے گئے۔ ڈیڈی نے وہاں ایک صحت گاہ کا انتظام سنبھالا۔ ہم لوگوں کی تعلیم بمبئی میں ہونے لگی۔ مسٹر ٹلکم اس کوٹھی کی دیکھ ریکھ کرتے رہے۔ ممی کبھی کبھی اس شہر میں آرہتی تھیں۔ ایک سال ہوا ڈیڈی پھر اس شہر میں واپس آگئے۔ نہ جانے انھیں اس سے کیسی وابستگی ہے، کہ چھوٹتے نہیں چھوٹتا۔ یہ اپنی کوٹھی جو بن گئی بس غضب ہوا۔ اب یہاں سے چند میل دور ڈیڈی اپنی خاص صحت گاہ تعمیر کر رہے ہیں۔ مجھے تو بمبئی بہت پسند ہے۔ وہاں کی شامیں .... اس سال میں نے بمبئی یونی ورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ دو ماہ ہوئے، کہ وہاں سے آئی ہوں۔ فینسی پہلے ہی چلی آئی تھی۔ وہ ان دنوں سنیئر کیمبرج کی تیاری کر رہی ہے، میں گھر پر بیٹھی سڑا کرتی ہوں۔ صحت کو فت ہوتی ہے۔ ڈیڈی سے کہتی ہوں، 'لیڈی اِروِن کالج' دلّی میں نام لکھوا دیجئے۔ کلچرل اور ڈومیسٹک کورس لے لوں گی۔ مجھ سے تو یہ بے کیف دن نہیں بتائے جاتے ......"

نینسی نے بڑے پیارے انداز میں سر کو جھٹکا۔ اس کے گیسو نئی تماش بنا کر بکھر گئے۔ اس کا جسم جنوبی ہند کی بھری بھری الائچیوں کی طرح گدرایا ہوا تھا۔ اس کی لٹوں سے بادِ جنوب کی خوشبو آرہی تھی۔ اجنتائی آنکھیں سرشار تشنگی اور بے تاب حیا کی کیفیات سے شراب دو آتشہ کے جام لبریز بنی ہوئی تھیں۔ یہ ساری باتیں کہہ کر وہ چوکنا سی ہو گئی اور کچھ اس طرح چپ ہو گئی، جیسے انجان طور پر کوئی راز افشا کر دیا ہو۔

"فلم سے کیوں دل نہیں بہلاتیں؟ اور کوہساروں کی سیریں۔ یہ تو بہت ہی پُر لطف مقام ہے۔" فرحت بولا۔ اور بڑی جسارت و انہماک سے نینسی کو تکنے لگا۔ نینسی کو یہ دلیر و متجسس نگاہیں بہت بھلی لگیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ سرِ شام سے، بلکہ مہینوں سے ایسی ہی بے باک اور کریدنے والی نظروں کا انتظار کر رہی تھی۔ فرحت کوہساروں، مرغزاروں اور آبشاروں کی تعریفیں کرتا رہا اور نینسی اپنی گھنی پلکوں کی چلمن سے اس کے گورے کتابی چہرے، ستواں ناک اور تیکھی بھوؤں کو دیکھتی رہی۔

"بمبئی آپ کو بہت مرغوب ہے"؟ فرحت نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ بڑی دل چسپیاں ہیں وہاں۔ نئی فلمیں، شام کے تازہ پروگرام، لڑکے اور لڑکیاں، طلبا کا ایک ہجوم رواں، مجھے ہجوم اور حرکت بہت پسند ہیں۔ دلی میں بھی وہ بات نہیں جو بمبئی میں ہے۔ مگر اس جنگل سے تو دلی بسا غنیمت رہے گی۔ یہاں تو میں مر جاؤں گی۔"

نینسی ریڈیو کی سوئی گھمانے لگی، اور ایک خوش گوار و جولاں آرکسٹرائی راگ پر آ کر تھم گئی۔ ہر سُو نغمہ بکھرنے لگا۔ باہر رِم جھم ہو رہی تھی۔ فرحت نینسی کو دیکھتا رہا اور وہ موسیقی کی لہروں میں کھوئی رہی۔

"آپ کو ہندوستانی فلمیں پسند ہیں؟ مجھے بہت بھاتی ہیں۔ بدیسی فلموں سے زیادہ۔ ان کے گیت دل میں اُتر جاتے ہیں۔ یہاں اپنی سی دنیا ملتی ہے، اپنے من کا راگ سنائی دیتا ہے۔ سچی کہانیاں نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔"

"فلم تو ویسے مجھے پسند ہیں، مگر ہندوستانی فلموں کا فنی معیار بڑا پست ہوتا ہے۔ اور کبھی تو تکنیک میں مضحکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے کئی بار اس قسم کی فاش غلطیاں دیکھی ہیں، کہ مُغل

دربار میں کوئی درباری پیش خدمت سفید ٹینس شُو پہنے ہوئے ہے۔"

فرحت کے اس بیان پر نیلسی ہنسنے لگی۔

"یہ تو ہے۔ مَیں نے بھی ایسی خرابیاں دیکھی ہیں۔ پچھلی صدیوں کے سین میں بجلی کی روشنیاں جلائی گئی ہیں۔ اور ہر ہر قدم پر گانا۔"

"اوہو، گانے نہ کہیئے۔ مجھے یاد ہے، مَیں ایک دوست کے ساتھ 'شیریں فرہاد' دیکھ رہا تھا۔ فرہاد کی موت کی خبر پاکر شیریں بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ میرے مُنہ سے نکلا۔ 'مرجائے گی بیچاری!' ۔ میرے دوست نے جھٹ سے کہا۔ 'ابھی ایک ماتمی غزل گالے گی تب نہ مرے گی۔' فطرتِ انسانی کا یہ لوگ سوانگ نکالتے ہیں۔"

"فقیرنیں سلیقے کے کپڑے پہنائی جاتی ہیں، اور گلیوں میں دن کے وقت بھیک مانگنے کی بجائے سبزہ زاروں کی تنہائی اور چاندکی کرنوں میں فقیرانہ صدائیں لگاتی ہیں۔"

"آپ کی نظر بھی بہت گہری ہے۔ مگر آپ تو ابھی ہندوستانی فلموں کی تعریفیں کر رہی تھیں۔"

"مَیں ان تکنیکی باتوں کی پروا تھوڑی کرتی ہوں۔ ہندوستانی فلموں میں ہیجان اور سنسنی ہوتی ہے۔ رومانوں میں اپنا پن ہوتا ہے اور گیت نہایت میٹھے اور رسیلے ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہ اتنے بھاتے ہیں، کہ مَیں نے کالج کے چار سالوں میں اچھی خاصی ہندوستانی زبان سیکھ لی۔ ورنہ بچپن میں تو غلط سلط بولتی تھی۔ آہ یہ پیاری فلمیں کتنے سنہرے روپہلے خواب دکھلاتی ہیں۔ زندگی کو فریب رومان دیتی ہیں۔ حقیقتیں جب بے کیف ہوجائیں، تو یہی فریب رنگیں تو جینے کا سہارا ہوتا ہے۔"

نیلسی نے اپنی اداؤں کو والہانہ بناتے ہوئے کہا۔ اس کی نشہ پرور آنکھیں نیم وا تھیں۔ دکٹوریہ جیسیر پردہ نیم دراز تھی۔

"آپ فلم لائن کیوں اختیار نہیں کر لیتیں؟۔ آپ کے قد اور بدن کا فن کارانہ تناسب، آپ کے جاذب خد و خال، نفوذ کرنے والی نگاہیں، آپ کی تعلیم اور کلچر آپ کی کامیابی کے ضامن ہوں گے۔" فرحت نے شوخ سنجیدگی سے کہا۔

"کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں؟ لیکن نظم کے خداؤں کا مذاقِ فن اتنا اونچا کہاں! ان کی پسند و ناپسند........"

نینسی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی سرشار نگاہوں سے شراب چھلک پڑی۔ پھر وہ مجوب ہو کر سمٹ سی گئی۔ بارش ختم گئی تھی۔ مگر ابر اب تک گھرا ہوا تھا۔ سڑکوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ مسافر کو رات نے اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔

"مجھے ایک مجلس میں تقریر کے لئے جانا ہے۔ سات بج چکے ہوں گے۔ آدھ گھنٹہ وقت اور ہے۔" فرحت بولا۔

"آپ کی زندگی خوب مزے کی ہوگی۔ تحریر و تقریر اور سیر و تفریح۔ اُف مجھے یہ دو مہینے اسی قید خانہ میں کاٹنے ہیں۔" نینسی بڑے سوگوارانہ انداز میں بولی۔

"آپ اس سطح مرتفع سے نیچے آئیے نا۔ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ دو مہینے وہیں آکر رہیئے۔ آپ کو تکلیف نہ ہوگی۔ میرے شہر میں یہاں سے زیادہ رونق ہے۔ کالجوں میں طلبا کے پرے کے پرے ملیں گے۔ میرے ساتھ آپ سفر بھی کر سکتی ہیں۔ ڈاکٹر سنتانم آپ کو اجازت دے دیں گے۔ میرے گھر میں آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے کافی جگہ ہے۔"

"میں بہت زیادہ جگہ بھی تو نہ لوں گی ــــ واقعی آؤں؟" نینسی نے بڑے تپاک سے کہا۔

"دیکھئے میں نے اب تک اس خط پر اپنے دستخط بھی ثبت نہیں کئے۔" دستخط کرتے ہوئے فرحت نے کہا۔ "اچھا رخصت! مجھے کل صبح آنے کی فرصت نہ ہوگی۔ صحافیوں کی ایک دوسری مجلس میں شرکت کرنی ہے۔ شام کو آؤں اور پھر ڈاکٹر سنتانم سے ملاقات نہ ہو تو؟ کیوں نہ میں پرسوں اتوار کو ہی آؤں؟"

"کل شام کو بھی کوشش کیجئے نا۔ ڈیڈی گھر پر نہیں بھی ہوں تو...... آپ ان کا انتظار کر سکتے ہیں۔" نینسی نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔ اس کے تاباں رخساروں کی سرخی نمایاں ہوئی اور آنکھوں میں چھپی ہوئی اکتاہٹ پھر انگڑائیاں لینے لگی۔ فرحت اٹھا۔ اس نے نینسی سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا ــــ "شب بخیر!"

"کیچلیاں اور بال جبریل"

سیکھ جہور

———— اور زمانہ بھی کتنا تیز گذرتا ہے۔ وہ بڑے سرکار کے یہاں رگنج آباد آور روکی طرح آیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے۔ بتیس سال پہلے۔ وہ ملی جلی زبان بولتا تھا۔ سیکھی ہوئی اردو اور بھلائی ہوئی بنگلہ۔ کہتا تھا مرشد آباد باڑی آچھے، لیکن مرشد آباد سے بہار تک کئی سال میں پہنچا تھا۔ وہ محرم میں ماتم کرتا تھا اور مچھلی نہیں کھاتا تھا۔ ماتم صرف اس حد تک کہ رنگا ہوا سبز کرتا اور پدھی پہن لیتا تھا اور کسی اکھاڑے میں پیک بن جاتا تھا۔ "سیکھو جہور" نام بتاتا تھا۔ لیکن کسی نام سے بھی پکارنے پر جواب دے دیا کرتا تھا۔ اس میں خدمت گاری کی فطری صلاحیت موجود تھی۔ خدمت گاری کے فرائض وہ بڑے حب سے انجام دینے کی طرف مائل تھا۔ ہر وقت وہ بڑے سرکار کے بنگلہ پر حاضر رہتا۔ گھرونچی پر پانی رکھنا، بدھنا میلنا، حقہ تازہ کرنا حویلی سے سینی پر کھانا لانا، دسترخوان بچھانا، کھانا کھلانا، پانی پلانا، لالٹین صاف کرنا، بچھاون بچھانا، پنکھا جھلنا اور جہور، کی پکار پر ہر آن کان دھرے رہنا اس کے روزمرہ میں داخل تھا۔ وہ بنگلہ، حویلی کی ڈیوڑھی اور قصبہ کے بازار کے درمیان چرخ رہتا اور تیسرے پہر کے وقت بنگلہ کے احاطہ والے نیم کے درخت کی جڑ پر بیٹھا کچھ سوچتا رہتا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے کا عادی تھا۔ ہر قسم کے اُتارن یا نئے کپڑے پہن لیتا تھا۔ لنگی، پائجامہ، دھوتی، کرتہ، قمیص، گنجی، کوٹ اور شیروانی وغیرہ وغیرہ۔ اور لباس کی مناسبت کے بارے میں اس کی پسند بڑی ٹھگ دار اور آزادخیال تھی۔ اس میں کٹرپن نام کو نہ تھا۔ وہ شیروانی ہاف پینٹ ساتھ پہن لیا کرتا تھا۔ ویسٹ کوٹ اور پائجامہ، دھوتی اور کوٹ، طرح طرح کے میل پیدا کر لینا اس کی عادت تھی۔ موسم کی قید بھی اس کے ہاں نہ تھی۔ وہ گرم اوور کوٹ اپریل مئی تک

پہنتا تھا اور اُونی سوئٹر پہن کر جیٹھ کی دوپہروں میں بیڑی لانے یا نا رہا تھا۔ دسمبر میں ململ کا کُرتہ خوب پہنتا تھا اور اسی حالت میں صبح اور شام دوڑ دوڑ کر کام کرتا اور جب کام کا ریلا ختم ہوتا تو دوہر اوڑھ کر یا شیروانی پہن کر بیٹھ جاتا۔

تیس سال قبل جھمو کی عمر پچیس سال کی تھی۔ وہ پست قد کا نوجوان تھا اور فرصت کے اوقات میں اُلٹے سیدھے گانے گاتا اور اپنی کیلی آنکھوں سے حویلی کی باندیوں اور ماماؤں کو بہت ہی پُرامن طور پر گھورتا۔ رفتہ رفتہ وہ حویلی کے اندر بھی آنے جانے لگا تھا کیونکہ وہ ذرا کم عقل مشہور ہوگیا تھا۔ وہ گھر کے لڑکے لڑکیوں اور کبھی کبھار بڑے لوگوں کو جھڑک دیتا اور انھیں سخت سُست بھی سُنا دیتا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، دیدے نکال کے باتیں کیا کرتا تھا اور اس کی یہ ادا بہرحال قائم رہتی۔ صرف مزاج کے پارے کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ درجہ اور زاویے کا فرق پیدا ہوتا رہتا تھا۔ حویلی کی نوجوان لڑکیاں اس کی دیدہ دلیری سے لجا کر اور کبھی غصّہ سے تلملا کر رہ جاتیں۔ وہ کام دھام، کھانا پینا، چھوڑ چھاڑ چادر تان کر بندی خانے میں سو رہا کرتا تھا۔ دورے کی میعاد لامعلوم تھی۔ یہ جھمو کا قطعی طور پر نجی اور داخلی معاملہ تھا۔ پھر وہ اچانک چاق و چوبند ہو کر اُٹھ بیٹھتا۔ کبھی گھنٹوں میں، کبھی دنوں میں۔ جب دو تین سال گذرے تو بوڑھی مامائیں کہنے لگیں کہ جھمو کی شادی کر دینی چاہئے، تب وہ انواٹی کھٹواٹی لینا بند کرے گا۔ مگر جھمو اپنی معرکہ آرا شادی کے بعد بھی کبھی خوب چونچال رہتا اور کبھی بے حد اُداس ہو کر پڑ جاتا۔

٭ ٭ ٭

سلطنتِ مغلیہ ایک عیش جاگتی، بولتی گرجتی بھرپور زندگی تھی۔ اس کی شکست و ریخت کے بعد بھی اس کے ٹکڑے، پرزے، ریزے، ذرّے ایک صدی بعد تک بھی ایک ٹوٹتے ہوئے عظیم جہاز کے سمندر میں تیرتے ہوئے تختوں کی طرح سارے ہندوستان میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور اب تک اِدھر اُدھر اُن کے پریشان آثار ملک میں انقلابات کے باوجود نظر آجاتے ہیں۔ ہر قصبہ میں چھوٹی بڑی سرکاریں تھیں۔ اور ان سرکاروں کی حویلیاں اور دیوان خانے تھے۔ ان حویلیوں میں بھانت بھانت کی مخلوقات رہتی تھیں اور جانے کہاں کہاں سے آجاتی تھیں۔ حویلیوں میں رہنے والی مخلوقات میں ایک کا اضافہ ہوا۔ ایک عجیب و غریب مخلوق بڑے سرکار کی حویلی میں آئی۔

قدرے لنگڑی اور اس سے زیادہ ٹیڑھی میڑھی، بگ ڈول سی، سر کے بال اُڑے اُڑے، چہرے پر انگنت جھرّیاں اور اتنی نمایاں کہ دیکھنے والی نظروں کو ان کے اُلجھاووں میں چہرے کی رنگت کا احساس باقی نہیں رہتا تھا۔ غالباً اس کا رنگ گہرا سانولا یا کالا تھا۔ وہ گنگی تھی۔ اشاروں سے نہایت صاف طور پر اظہار خیال کر لیتی تھی، ہر وقت "اوں اوں، قیں قیں، آں آں" کرتی رہتی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ شاید جوان تھی اور بوڑھی معلوم ہوتی تھی۔ یا بوڑھی تھی اور مشتبہ طور پر جوان سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کے سر کے بال سیاہ تھے مگر دانت مُنہ میں گھسے پٹے، کھوئے ہوئے تھے، اس پر پوپلا پن طاری رہتا تھا۔ وہ بے حد کاہل تھی اور بے حد لڑاکن بھی۔

اب اسکو سنجوگ کہیے یا ساعت کہ حویلی میں یہ طے پایا کہ 'جھور' کی اُداسی کے دوروں کا یہی گنگی بستی، جسے عورت سمجھا جاتا تھا، علاج تھی۔ نسخہ تجویز ہوا اور علاج کر دیا گیا۔ نکاح کس نے قبول کیا اور کس کا کس سے ہوا، اس سے کیا بحث۔ جھور خوش تھا کہ آج اُسے دولہا بن کر اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے وارڈروب میں کچھ اور جوڑے جامے کا اضافہ ہوا۔ اب وہ نئی قماش سے انھیں پہننے لگا۔ گنگی کو وہ کبھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور شاید وہ خود بھی کبھی گنگی کی آنکھوں میں نہیں کھبا۔ سہاگ رات کیا گذری کسے معلوم۔ مگر اتنی تو ضرور سب کے کانوں میں پڑی کہ گنگی مخلوق رات بھر زور زور سے "قیں قیں، قیں قیں" کرتی رہی۔ صبح ہوئی تو دونوں کے مُنہ پھولے ہوئے تھے اور دونوں کے چہرے پر خراش کے نمایاں نشانات تھے۔ اس دن یا رات کے بعد دونوں میں کبھی نہ بنی اور اکثر و بیشتر ان کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ جھور حق شوہری جتانے کے لیے گنگی کو گاہے ماہے دھپ دیا کرتا تھا۔ تھپڑ، لپڑ، مُکا، لات، کھورنی، لاٹھی، بینا، پھونکنی، جھاڑو، ڈنڈا، بانس، بلونگ، کھپڑا، اینٹ، پتھر، ہانڈی، صراحی، گھڑا وغیرہ آلات حرب و ضرب ان کے درمیان بڑے مخلصانہ طور پر آزادانہ استعمال ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بیاہ کا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جھور کی جھورن مل گئیں اور بس۔

بڑے سرکار کا انتقال ہو گیا اور چھوٹے بابو اپنے نئے مکان "گل فشاں" میں اُٹھ آئے۔ چھوٹے بابو بڑے سرکار کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ بڑے سرکار کی گدی پر وہی بیٹھے۔ اور جھور چھوٹے

بابو کا خدمت گار بن گیا۔ "گل فشاں" قصبے سے باہر نئی وضع کی کوٹھی بنی تھی۔ جھور نئے مکان میں آکر خدمت گار تو رہا مگر کچھ بڑا سا چپراسی بننے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ شیروانی پہن کر گمچھے سے اپنی کمر کس لیتا اور چھوٹے بابو کے پرانے جوتے پاؤں میں ڈال کر قصبے کے بازار میں جا کر اپنا رعب جماتا تھا۔ جب چھوٹے بابو قصبے سے باہر جاتے تو کوٹھی کے بیل دار خوب صورت دالان میں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ کر جھور انگریزی اخبار پڑھنے کا عمل نہایت سنجیدگی کے ساتھ کرتا۔ اخبار چاہے کسی رُخ سے اس کے ہاتھ میں آجائے وہ پوری توجہ کے ساتھ سیدھی یا اُلٹی سطروں پر نظر ڈالتا۔ وہ اتنا مہذب اور بافہم ضرور تھا کہ چھوٹے بابو کی آرام کرسی پر کبھی دراز نہ ہوتا۔ وہ کوٹھی کی عزت، حفاظت، آن بان، وقار اور رعب داب کی پوری ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔ اور ہر وقت اُسی ذمہ داری کے بوجھ کے نیچے دبا رہتا۔ خصوصاً جب چھوٹے بابو ڈسٹرکٹ بورڈ یا لوکل بورڈ کی میٹنگوں میں شرکت کے لئے شہر جاتے۔ دراصل وہ کرسی پر اسی لئے ڈٹ کر بیٹھتا اور انگریزی اخبار پڑھنے کا سوانگ بھرتا تھا کہ کوٹھی کا سرکاری وقار قائم رہے اور رعیت یہ سمجھے کہ سرکار کی کرسی خالی ہے تو نائب سرکار تو بہ نفسِ نفیس موجود ہیں۔

جھور کی آن بان میں اضافے ہوتے رہے تھے۔ چھوٹے بابو یونین بورڈ کی صدارت، اسپتال کمیٹی کی صدارت، مڈل اسکول کی سکریٹری شپ، امدادِ باہمی بینک کی چیرمینی سے ترقی کرتے ہوئے ضلع بورڈ کی چیرمینی تک پہنچ گئے اور اسی نسبت سے 'سیکھ جھور' کی شان بڑھتی گئی اور ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ یونین بورڈ، اسپتال، اسکول اور بینک کے چپراسیوں اور کلرکوں پر جھور رعب گانٹھتا رہتا تھا۔ اب وہ چرواہوں، گوالوں، برالیوں، اور بنیوں کی سطح سے بلند ہو گیا تھا۔ ویسے جھور اپنے اقتدار کے اس پہلو سے غافل نہیں تھا۔ 'گل فشاں' کے احاطہ اور قصبہ کے حلقہ بھر کے لوگوں کی تادیب اس کے فرائض میں داخل تھی۔ جھور کا خیال تھا کہ سوائے اس کی گنگی بیوی کے سب لوگ اسی کی تادیب و تربیت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یوں تو حویلی کی باورچن مقبولن سے بھی اس کا شدید اختلاف تھا، لیکن جھور اسے اچھی طرح سبق سکھا دیا کرتا تھا۔ اس کی جھورن سبق پڑھنے تک سے منکر تھی۔ ایک دفعہ اس نے گنگی کو اتنا مارا کہ وہ اور زیادہ لنگڑی ہو گئی اور مہینوں زمین پکڑے رہی۔ مگر جھور

کا اس پر رعب نہ جما۔ لہٰذا جھبور کو دوسری شادی کی فکر ہوئی اور اس کے لئے وہ بے قرار رہنے لگا۔

اُن دنوں قصبہ میں کوآپریٹو بینک کے ایک نہایت ہی رنگیلے منیجر آئے، سخاوت حسین نامی۔ اُن سے جھبور کی خوب بنی۔ منیجر صاحب جھبور اور جھبورن کے معاملات اور جھبور کی ذمہ داریوں سے خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دور بھی اسی کے جھبور کے عروج کا دور تھا۔ جہت بڑے علاقے میں اس کا رعب واثر تھا۔ یہاں تک کہ قصبہ کی پتریا میں بھی اس کی قائل ہو رہی تھیں۔ بات یہ ہے کہ سخاوت حسین منیجر نے جھبور کا تعارف قصباتی رنڈیوں سے کرایا تھا۔ جن کا پیشہ منیجر صاحب کے کرایہ کے مکان پر رہتا تھا۔ جھبوران دنوں نہایت زندہ دل ہو گیا تھا۔ چھوٹے بابو کے کالج میں پڑھنے والے بیٹوں، بھتیجوں یا خود منیجر صاحب کا اُتارن پتلون پہننے لگا تھا۔ بغیر انگریزی جوتا پہنے بازار نہیں جاتا تھا۔ اور بینک کے چپراسی کی سائیکل پر اس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ سائیکل چلانی نہیں جانتا تھا۔ مگر پھر بھی سائیکل استعمال کیا کرتا تھا۔ استعمال کا یہ نیا طریقہ اسے وجدانی طور پر القا ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ مشتریا کے کپڑے دھوبی نے نہیں دیئے تو اس نے منیجر صاحب کے یہاں آن کر شکایت کی اور ترت منگوا دینے کی فرمائش بھی کر دی۔ جھبور وہیں حسنِ اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے اپنی خدمت رضا کارانہ طور پر پیش کر دی اور اچانک سائیکل اُٹھا کر دھوبی کی طرف دوڑ پڑا۔ سائیکل کے دونوں ہینڈل پکڑے وہ دوڑتا چلا گیا۔ سخاوت حسین ہنسے اور مشتریا پتریا قہقہہ مار مار کر دیر تک ہنستی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کے کپڑے دھوبی کے یہاں سے آ گئے اور وہ جھبور کی شہسواری کی تعریف کرتی ہوئی شکر گزار چلی گئی۔ اُس روز سے جھبور اپنے دل میں مشتریا کے لئے کچھ درد سا محسوس کرنے لگا۔ اور اب اکثر وہ ضروری اور جلدی کے کاموں میں سائیکل ضرور استعمال کیا کرتا تھا۔

مشتریا کی ایک چھوٹی سی بچی تھی، ایک ڈیڑھ سال کی۔ جھبور مشتریا کے یہاں کثرت سے آنے جانے لگا اور اس کی بچی کو کھلانے کی خدمت انجام دینے لگا۔ وہ اسے "بیٹی" "بٹیا" کہہ کر بہلاتا اور پکارتا تھا۔ بچی جھبور کی گود میں پلنے لگی اور اسے واقعی بچی سے محبت سی ہو گئی۔ اس کے لئے وہ چھوٹے موٹے تحفے لایا کرتا تھا۔ زندگی کے اس موڑ پر جھبور ذہنی طور پر اپنی گنگی عورت سے بالکل علیحدہ اور عملی زندگی میں بھی اس کی جارحانہ تربیت سے دست کش ہو گیا۔

کوٹھی کی ذمہ داریوں کے بعد جھورے کے دو مشغلے تھے۔ مشتریا کی بیٹی کو کھلانا اور سخاوت حسین یا ان کے عملہ کے سامنے خیالی پلاؤ پکانا۔ وہ اپنے تصور میں خدمت گار سے زمیں دار بن گیا تھا۔ اور یہ معجزہ اس لیئے رونما ہوا تھا کہ وہ اپنے کو مشتریا کے قابل سمجھ سکے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مرشد آباد میں اس کی بھی جائداد ہے، گماشتے ہیں، براہل ہیں اور کیا نہیں ہے۔ لیکن گھر والوں سے ناراض ہو کر وہ بو باس کے لیئے نکل کھڑا ہوا۔ سوتیلی ماں کا ظلم اور کیا۔ شاید کبھی اس کے دن پھریں۔ اور اچانک اس کے دن پھر گئے۔ وہ اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لیئے مرشد آباد چلا گیا۔ ایک مہینہ وہ قصبہ سے غائب رہا اور پھر جب نمودار ہوا تو بڑے ٹھسّے سے یہ کہتا پھرا کہ اس کے باپ لٹن کا انتقال ہو گیا ہے، وہ حکم احکام دے کر واپس آ گیا ہے۔ یہاں کے تعلقات کو چھوڑنا اور مشتریا کی محبت کو بھولنا اس کے بس میں نہ تھا۔ ورنہ وہ لوٹ کر نہ آتا۔ اور یہ معلوم ہوا کہ بس ضلع کے صدر مقام میں وہ کسی قصاب کے یہاں عارضی طور پر ملازم ہو گیا تھا۔

جھورے کی یہ عادت ہو گئی کہ وہ برس چھ مہینے میں اپنے مرشد آباد چلا جایا کرتا اور ایک آدھ مہینہ میں واپس آ جاتا۔ کہتا مال گذاری وصول کر کے خیرات کر دی، شادی۔ جب مشتریا اس کی نہیں ہوئی تو پھر دھن دولت کیا ہے۔۔۔ اور مشتریا اس کے نکاح میں نہ آئی مگر وہ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی کہتا رہا۔ بیٹی کا نام اس نے لکھ پتیا رکھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہوئی۔

بعض دفعہ سانحات پے در پے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ یوں رونما ہونے کے لیئے بچا بچا کر رکھے گئے تھے۔ فساد انگیز اندولن ہوا، شور انگیز بٹوارہ ہوا اور فرقہ وارانہ قتلِ عام۔ اور پھر یک لخت ملک دو لخت نہیں بلکہ سہ لخت ہو گیا۔ قصبہ کی زندگی پر ان واقعات کا گہرا اثر پڑا۔ جھورے بھی ان سانحات سے متاثر ہوا۔ ان نیموں پر کچھ اور کریلے بھی چڑھے۔ خود اس کی نجی زندگی اور اس کے نزدیکی تعلقات میں بھی حادثے رونما ہوئے۔ اس کے نجی حادثات گھومی سانحات کے بیچ بیچ رونما ہوتے رہے۔ پہلا نجی حادثہ یہ تھا کہ ایک مشٹنڈی میلہ گھومنی قسم کی عورت اس کی زندگی میں زبردستی داخل ہو گئی۔ اور طوفانی انداز میں نکل گئی۔ گلفشاں کوٹھی کی نئی قضیئے کے باوجود اس کی حیثیت میں چنداں فرق نہیں آیا تھا۔ اور اگر آیا بھی تو اتنا آہستہ کہ نمایاں طور پر محسوس نہیں ہوا۔ گھومنی گھاٹی ایک چرپانک ہستی کی تھی جوانی کی آخری

منزل پر پہنچی ہوئی عورت کوٹھی کی حویلی میں در آئی ۔ اس کے پھیلے ہوئے موٹے کولھوں پر سوار ایک بچہ بھی تھا۔ یہ بچہ اس عورت کا جزو لاینفک بن بیٹھا تھا ۔ وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد بڑی سہولت سے عورت کی مھنت ناک چھاتیوں کو کھول کر دودھ پینے لگتا تھا ۔ عورت کا نام سنیچری تھا ۔ سنیچری اسی عالم میں سب کام کرتی تھی ۔ چلنا پھرنا ، اٹھنا ، بیٹھنا ، کھانا ، پینا ، سونا ، پاخانہ پیشاب کو جانا ، جھاڑو دینا ، برتن مانجنا وغیرہ وغیرہ ۔ سنیچری کو گنگی سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ۔ روزانہ تھکم فضیحتا ہوتا ۔ اس دشمنی کے سبب سنیچری نے فیصلہ کیا کہ جھور کو اپنے عقد میں لے لے گی ۔ ویسے جھور بھی دوسرے بیاہ کی فکر میں تھا ۔ مگر ثریا کے عشق نے شادی کی خواہش کو بھڑکا کر بجھا بھی دیا تھا ۔

سنیچری اس پر ٹوٹ پڑی اور اس سے بیاہ کر کے رہی ۔ جھور کو عشق کا تجربہ بھی تھا اور بیاہ کا بھی ۔ لیکن ازدواج کا لطف اور وصال کا مزہ اسے ہاتھ پائی ، مار دھاڑ اور بچہ کو گود کھلانے سے زیادہ نہیں ملا تھا ۔ اب کے کچھ ایسے آثار تھے کہ جھور بالکل میاں بن جاتا ۔ مگر مستقل شوہری کے دروازے سے وہ اٹھاں وخیزاں باہر کر دیا گیا ۔ سنیچری گھر میں بھی "بچہ بہ کمر" داخل ہوئی ۔ اس انداز نے جھور کو ناخوش کر دیا اور وہ اپنے آزمودہ نسخہ حقوق و فرائض کو آزمانے پر تل گیا ۔ گربہ کشتن روز اول ۔ اختلاف رائے کو کامیاب منطقی نتیجہ تک پہنچانے کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جھور میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ وہ اپنی حرم اول کو پورے طور پر رام کر سکتا ۔ خلوت صحیحہ بہت دور کی بات تھی ۔ حرم ثانی کا مقابلہ تو اس کے بس سے باہر تھا ۔ وہ سنیچری کا منکوحہ سعادت مند شوہر بن کر رہتا تو شاید وہ شاد کام ہو جاتا ۔ مگر وہ بیوی پر حکم چلانے کی جرأت دیمیا کی کر رہا تھا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جھور "شب ثانی" میں چیخ چیخ کے رو دیا کیا اور اسے "شب اول" یاد آئی ، جب اس کی گنگی رات بھر گنگار دنا روتی رہی تھی ۔ ہوا صرف اتنا تھا کہ گھر میں سنیچری نے اچھی طرح جھور کی مرمت کر دی تھی اور منہ پھاڑے ، ٹانگ پھیلائے بچہ کو دودھ پلاتی رہی تھی ۔ اس حادثہ کے بعد جھور دو بیویوں کا شوہر تو کہلاتا رہا مگر اس کے اچھوتے پن پر کوئی آنچ نہ آئی ۔ چند ہفتوں کے بعد سنیچری بھاگ گئی ۔

جھور کی زندگی کا دوسرا حادثہ اس کی موت پر ختم ہوتے ہوتے رہ گیا ۔ وہ اپنا غم غلط کرنے مرشد آباد کو چل دیا تھا ۔ اس دورے پر وہ دو تین ماہ تک رہا اور جب آیا تو گلفشاں

کی کایا پلٹی ہوئی تھی۔ گھر کی مالکن کا دل کے دوروں کی وجہ سے انتقال ہو چکا تھا۔ چھوٹے بابو اور گھر کے گھر کا عجیب حال ہو گیا تھا۔ "گلفشاں" پر خزاں آگئی تھی۔ جھبو اپنی گردن پر کاربنکل کا خطرناک زخم ساتھ لایا تھا۔ وہ بالکل جھول گیا تھا۔ اس کی شکل بالکل بھیانک ہو گئی تھی اور اس کا سارا ڈھانچہ کھڑکھڑا گیا تھا۔ گھر کا یہ حال اور اس کی اپنی بری حالت، اُسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ قصبے کے ہسپتال میں اُس کا زخم اور بگڑتا ہی گیا۔ آخر ش چھوٹے بابو نے جھبو کو اپنے منجھلے بھائی صاحب کے پاس شہر بھیج دیا۔ وہ خود ڈاکٹر تھے وہیں جھبو کا علاج ہوا اور وہ کشتم کشتم اچھا ہو گیا۔

جھبو کی داخلی زندگی کا سب سے بڑا غم یہ تھا کہ زمانہ بدلتا جا رہا ہے اور نہایت بدڈھنگے طریقے سے۔ امداد باہمی بینک فیل کر گیا۔ کاشت کاروں نے قرض واپس نہیں کیے۔ منیجر سخاوت حسین قصبہ سے چلے گئے۔ جھبو انھیں اپنا ہمدرد و ہم زلف سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مشتریا کی بہن سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بینک کے فیل ہونے سے کوٹھی کی شان و وقار میں بھی فرق آیا۔ چپراسیوں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ جھبو کے لیے یہ بڑا سانحہ تھا۔ کوٹھی کے وقار سے اُسے گہری وابستگی تھی۔ اُس کی شان و شوکت ہی جھبو کا سب کچھ تھا۔ اُس کی تمناؤں کا سہارا، اُس کا خواب، اُس کا مشغلہ، اس کی ذمہ داری، اس کا کام، اس کے ادھورے وجود کی تکمیل۔ اسے کوٹھی کے ذرے ذرے سے لگاؤ تھا، تنکے تنکے سے وابستگی تھی۔ اس کی فضا اور ماحول کے چھوٹے سے چھوٹے جزو کے ساتھ اس کے جذبات وابستہ ہو گئے تھے۔ محبت، نفرت، غرور، فخر، ایثار، خدمت، عروج و ترقی اور مسابقت، فنا اور بقا کے جذبات .... بڑے تہ دار اور پیچیدہ۔ دراصل خود جھبو اور "گل فشاں" کا ماحول و فضا، اس کے جیتے جاگتے لوگ، وہاں سے سدھار جانے والی ہستیاں، اس کے میدان و اشجار برگ و بار، وہاں کے پالتو جانور، اور پکھیرو، اس کا ماضی و حال اور اس کے مستقبل کی دھندلی سی تصویر ـــ یہ سب کچھ مل کر، مخلوط و مرکب ہو کر جھبو کے دل و دماغ میں ایک مربوط اور مسلسل دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی قماشِ حیات بناتے تھے اور اس ترکیب زندگی میں، کچھ اس بے دردانہ انداز سے تبدیلی پیدا ہو رہی تھی کہ جھبو کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ جھبو کا شعور اور اس کی قوتِ تجزیہ بہت کمزور تھی

لیکن اس کے احساسات تیز تھے۔ یہ احساسات الگ الگ خانوں میں معیّن طور پر بٹے ہوئے نہیں تھے۔ انھیں انفرادیت شخصیت اور گویائی حاصل نہیں تھی۔ پھر بھی وہ تیز تھے اور ایک کی گرفت کمزور پڑنے سے دوسرے احساسات و جذبات شدید ہو جاتے تھے۔ اور وہ سب کے سب "گل فشاں" اور اس کے ماحول کے پروردہ تھے۔ اور وہ شناسا فضا بدل رہی تھی۔ وہ ماحول بدل رہا تھا۔ اس کے متعلقات نہایت ہی ناخوش گوار رنگ میں متغیر ہو رہے تھے۔

ہنگامہ خیز دور شروع ہو گیا تھا۔ نیا چناؤ آیا، نئے نعرے تھے، نئی پارٹیاں تھیں، یونین، لوکل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر نئی وضع و قماش کے لوگوں کا قبضہ ہو گیا اور چھوٹے بابو سے صدارت کی کرسیاں بہت دور ہو گئیں۔ کوٹھی کی شان و شوکت اور رعب و وقار کی کمی جھور کے لیے بجاں گسل تھی۔ شور و شر بڑھتا رہا اور جب صوبہ میں نئی حکومت برسرِ اقتدار آگئی اور سارے ملک میں اقتدارِ اعلیٰ اور تقسیم اقتدار کے لیے کشاکش شروع ہو گئی تو جھور نے صاف طور پر دیکھا کہ کوٹھی کلرکوں، گرودوں، چپراسیوں، گماشتوں اور براہوں سے خالی ہو گئی۔ جتنی ڈاک "گلفشاں" میں آتی تھی اتنی علاقے بھر میں نہیں آتی تھی۔ لیکن اب ڈاک اِکّے دُکّے غیر سرکاری لفافوں اور بے رونق سے بھائیں بھائیں کرتے ہوئے پوسٹ کارڈوں پر مشتمل ہوتی اور بس۔ ڈھیر سے سنہرے سرکاری لفافے اب کہاں تھے۔ جھور کوٹھی کے پھیلے سکڑتے ہوئے اقتدار کی ان المناک علامتوں کو محسوس کر کے خود بھی پگھلتا سکڑتا جا رہا تھا۔ حد ہو گئی تھی اب گائیں اور بھینسیں ڈراتی ہوئی کوٹھی کے احاطے میں گھس آتی تھیں اور عجب اونے پونے گنوار لوگ چھوٹے بابو کے پاس آ کر کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ جھور کی شخصیت بُری طرح مجروح ہو رہی تھی۔ ان گایوں اور بھینسوں کی سینگوں کی نوکیں وہ اپنے کلیجے میں پیوست ہوتی ہوئی محسوس کر کے تلملا اٹھتا تھا۔

صوبہ خوں ریز فساد میں غرق ہو گیا۔ کوٹھی چونکہ قصبہ سے باہر کھلی جگہ پر تھی اس پر حملہ کا خطرہ زیادہ تھا۔ چھوٹے بابو کسی کام سے صدر گئے ہوئے تھے کہ قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ کوٹھی کے سب لوگ جان جوکھوں کے بعد حفاظت کے خیال سے شہر چلے گئے۔ جھور کوٹھی کی ہستی اور اس کی عزت وقار کی حفاظت کے لئے کوٹھی ہی میں رہا۔ اُسے یہ خیال بھی تھا کہ نہ معلوم چھوٹے سرکار کب صدر سے واپس آئیں۔

—— اور زمانہ بھی کتنا تیز گذرتا ہے۔ تیس سال پہلے وہ بڑے سرکار کے یہاں آیا تھا۔ اب اس کی عمر پچپن برس کی تھی۔ سر کے بال سفید ہو گئے تھے، چہرہ پچک گیا تھا اور اس کے ملے دَلے سمٹے ہوئے میلے کپڑوں کی طرح مختلف زاویوں سے پُرشکن ہو گیا تھا۔ مُغتوں اس کی داڑھی حجام کی پہل سے محفوظ رہتی اور اس کی پیہم ہلتی ہوئی ٹھوڑی چلتے ہوئے جبڑے کے حاشیہ سے سفید دیمک کی طرح جمتی ہوئی نظر آتی۔ اس کے اکثر دانت پائریا سے سڑ کر ٹوٹ گئے تھے اور بعض ہلتے اور دُکھتے تھے۔ وہ مسوڑھوں اور دانتوں کو چوستا رہتا تھا۔ اس کے پھیکے پھیکے لب عجیب عجیب انداز میں سکڑتے اور پھیلتے رہتے تھے۔ ٹھوڑی تالو اور ناک کے مجاذ سے قریب تر آ گئی تھی۔ آنکھیں دھنس کر اندھے کنوؤں کی طرح بے رونق ہو گئی تھیں۔ شانے جھک گئے تھے۔ بازو بے بسی سے جھولتے رہتے تھے۔ وہ پستہ قد تو تھا ہی اب اور پستہ قد نظر آنے لگا۔ مگر وہ اب تک تیز تیز چلتا تھا۔ اور خدمت گاری کے سارے فرائض بڑے جوش وخروش سے انجام دیتا تھا۔ اسے کوئی بوڑھا نہیں سمجھتا تھا، جیسے وہ اب تک نوجوان خدمت گار ہو۔

اور انقلابات کی تہیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ پرت پر پرت جمتی گئی۔ من بانٹن ہوا اور دیش بانٹن —— جھبو رکہتا تھا کہ "من بانٹن" صاحب آئے اور ملک بانٹ کر چلے گئے۔ صاحب لوگوں کو اپنی مزدور حکومت کی ترقی پسندی اور انسانیت ثابت کرنے کے لئے بڑی قاتل عجلت کرنی پڑی۔

قصبہ سونا ہوتا گیا۔ کئی خاندان دور دیش چلے گئے۔ "گُل فشاں" سے نزدیک کی حویلی بالکل ویران ہو گئی۔ ایک بوڑھے پنشنر کے سوا اس بھرے گھر میں اب کوئی نہ تھا۔ اور جب زمینداری اُٹھی تو بوڑھے پنشنر نے مکان کے زیادہ حصے کو کرایہ پر اُٹھا دیا۔ اس میں انچل ادھیکاری کا دفتر کھلا۔ جس مکان میں چنچل ناریاں رہتی تھیں، اب اس میں انچل ادھیکاری نواس کرنے لگے۔

چھوٹے بابو پبلک کاموں سے بالکل علیحدہ ہو گئے اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جھبو رکی خودی کی لانبی گردن کچھوے کی طرح اپنے خول میں چھپ جانے پر مجبور

ہوگئی تھی۔ اس کی دُنیا سکڑ کر بہت تنگ ہوگئی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔
اس کا کلینڈا ایک ایسے نیم مُردہ مینڈک کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کی اگلی پچھلی ٹانگیں نڈھال
حالت میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اُس کے مُنھ سے ایک مخصوص "کر کرکر کر" کی آواز نکلتی رہتی تھی۔
وہ اپنے ملسلاتے ہوئے مسوڑھوں کو تھرتھراتی ہوئی زبان سے ادھ کھلے منھ میں سہلاتا رہتا تھا،
جیسے کوئی گوند کی مٹھائی یا چیونگ گم چوس رہا ہو۔ اس کے مینڈک نما جبڑوں اور چپکی ہوئی تھوڑی
کے اندر سے جھینگر کی سی آواز اکثر و بیشتر نکلتی رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے۔ بہرحال و
بہ ہر گام۔

اب جھور زیادہ تر بنڈی خانے کی کوٹھری اور حویلی کے باورچی خانے کے درمیان
زندگی گزارتا تھا۔ وہ بنڈی خانے میں چت لیٹا رہتا اور جب تک اس پر غنودگی یا نیند
طاری نہیں ہو جاتی، وہ ادھ جلی بیڑی پیتا اور کر..... کر..... کر، کرتا رہتا۔ وہ ایک
بڑا مینڈک یا ایک جھینگر بن گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر ماننا پڑتا کہ تناسخ کا عقیدہ برحق ہے۔ وہ اچانک
اُٹھ بیٹھتا اور اُکڑوں بیٹھتا، سر بہ زانو سوچتا رہتا۔ گرگٹ مُرغی کے انداز میں۔ پھر وہ پر جھاڑ کر کھڑا
ہو جاتا اور تیز پھدک پھدک کر حویلی کے باورچی خانے پہنچ جاتا۔ کبھی کھانے کی تقسیم کے مسئلہ
پر اس کی مقبولن باورچن سے جھڑپ ہو جاتی اور غم گسارانہ انداز میں ان کے درمیان باتیں
ہوتیں۔ جھور کی مقبولن سے پُرانی شکایت تھی۔ اس نے مقبولن کا لکھ لُٹ زمانہ بھی دیکھا تھا۔
وہ بڑے جھوری انداز میں سرمایۂ شباب لٹاتی رہی۔ مگر سمندر سے پیاسے کو شبنم تک نہ ملی۔
پھر اس سرمایہ کو مقبولن نے شوہری بینک میں رکھا اور یکے بعد دیگرے چھ بینک بدلے۔ جھور کو
شکوہ تھا کہ مقبولن نے اپنے نصف درجن شوہروں کے سلسلہ میں اسے کہیں پر جگہ نہ دی حالانکہ
دونوں ہم حویلی تھے۔ تاہم جھور اس سے اپنے دل کے راز کہہ دیا کرتا تھا۔ الفت و نفرت کے
درمیان ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

جھور اکثر اپنی ہونے والی شادی کا ذکر لے بیٹھتا۔ باورچی خانے کی مخلوقات کے
چہروں پر ہنسی کی چنگاریاں اُڑنے لگتیں۔

"میری شادی طے ہو گئی ہے" ایک رات جھور نے لاکھویں بار بڑے گنوارے پن کے

ساتھ اعلان کیا۔

"کہاں ۔۔؟" مقبولن نے سوال کیا۔

"پنچ کیسر" جھور نے مطلع کیا۔" بس میری جمعداری کی آمدنی آجائے اور بیاہ ہو جائے مکبولن" پھر جھور نے چولی کے جوڑے اور چڑھاوے کے زیوروں کی فہرست سنانی شروع کی۔

۔۔۔ "ساری سلوکہ تو جرور ہو گا مکبولن۔ مگر چیچ ہی ۔۔۔" ذرا شرماتے ہوئے رُک رُک کر جھور نے کہا۔

"کا؟ کون نگوڑے کا انوکھا چیچ ۔۔؟" مقبولن نے چونک کر پوچھا اور مُسکرا دی۔

"او ہی .... ارے او ہی .... چہ چہ .... چہ چہ ارے ....

اُو اُو، اُو چیجوا ....!"

"کھاک! بول نہ!" مقبولن نے اینٹھ کر شہہ دی۔

"او ہی رنگ برنگی سکھر کے طرح جو سلوکہ کے اندر دُلہن بہو پہنے ہیں۔"

جھور کے تصور میں پہلے مشریا کی انگیا آئی۔ مگر اپنی ہونے والی بیوی کے وقار کا لحاظ کر کے اُس نے دُلہن بہو کی رنگین بریسیرئوں کا خیال کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہہ گذرا۔

باورچی خانے میں ملی جلی، متحیر، چونکی، گھبرائی مگر شوخ ہنسی کا ازدحام پھوٹ پڑا۔ چولھے کے اندر ایک لکڑی زور سے تڑخی۔

"ہائے!" مقبولن آنچل سمیٹتے ہوئے بول پڑی۔

جھور اپنی شادی کے خواب دیکھتا، پوپلے مُنھ کے مسوڑھے سہلاتا، کر...... کر ......کر...... کرتا، انگیا کے تانے بانے بُنتا اور رنگ برنگی بریسیروں کے پیچ و خم کھولتا یونہی زندگی گذارتا رہا۔

"کچلیاں اور بال جبریل"

دسمبر ۱۹۵۹ء

اُنھیں مُردے نہ کہو

[یہ افسانہ ۱۹۴۸ء میں عرب اسرائیل کی پہلی جنگ کے موقع پر لکھا گیا۔ جب امریکا کے ساتھ ساتھ اور اس سے بھی زیادہ روس ریاست اسرائیل کے قیام کا حامی تھا۔ اس افسانے کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ اس کی اشاعت پر اُس وقت کے نام نہاد ترقی پسند حلقے میں ایک کھلبلی مچ گئی، اس لئے کہ افسانہ روس کی اُس وقت کی خارجی پالیسی کے خلاف تھا۔ لہٰذا اختر اُورینوی کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے خارج کر دیا گیا! ———]

——— "خداوند خدا یوں کہتا ہے۔ کہ تم دو دفعہ اسیر کئے جاؤ گے۔ یہودا کا غضب تم پر بھڑکے گا۔ تمہارے پلوٹھے مارے جائیں گے۔ تمہاری کنواریوں کی چادرِ عصمت کو تمہارے دشمن تار تار کر دیں گے۔ تم اپنے گھروں میں غلام بنائے جاؤ گے۔ تمہارے ہیکل لوٹ کر ویران کر دیئے جائیں گے۔ اور یہ اس لئے ہوگا، کہ تم نے خداوندا، اسرائیل کے پروردگار کی نافرمانی کی۔ خداوند خدا یوں کہتا ہے کہ تم ملک ملک میں خانماں برباد ذلیل مارے پھرو گے"۔

——— محمود مسکلی تل عفیف سے یروشلم جانے والی سڑک پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ مختلف باتیں اس کے ذہن میں اُبل رہی تھیں۔ پرانے عہدنامہ کے حوالے مبہم طور پر اس کے حافظہ کے پردہ پر ابھر رہے تھے۔ وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا ایک شامی طالب العلم تھا۔ اس نے عرب عسکرِ آزادی میں رضاکارانہ طور پر شرکت کی تھی۔ اس کا بائیس سالہ شباب، لانبا چھریرا بدن، تیکھا

ناک نقشہ، سرخی مائل زیتونی رنگ اور اس کی ارادہ و عزم سے چمکتی ہوئی عقابی آنکھیں ہمہ تن
مدافعت و اقدام معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اس کے تیور میں کچھ ایسی ادائیں بھی تھیں جن سے یہ صاف
جھلکتا تھا کہ عزم و عمل کی قوت کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں فکر و تخیل کی طاقت بھی تھی۔
فلسطین پر صیہونی حملہ کے دفاع کے لیئے وہ صرف جوش و ولولہ کے تحت نہیں نکل آیا تھا، بلکہ
نہایت غور و فکر کے بعد۔ وہ یونی ورسٹی کا ایک سنجیدہ فرد تھا، مساوات و جمہوریت کا حامی۔
اس کی عادتیں سادہ تھیں۔ وہ ہمیشہ ایثار پسند رہا تھا اور انسانی اخوت کا قائل۔ حبش کی تباہی
پر اس کا دل رو یا تھا۔ انڈونیسیہ کی جمہوریت اور چین کی خلقت کی بربادی پر اس کی جان گھلی تھی۔
نازیت کے مظالم اور روس کی جفتا کی خونابہ فشانی سے اس کی روح چیخ چیخ اٹھی تھی۔ مگر آج
ان ساری باتوں کو سوچ سوچ کر اس کے دل و دماغ میں ایک تشویش تھی۔ یہ الجھن کبھی خلفشار کی
کیفیت اختیار کر لیتی تھی۔ وہ غم و غصہ سے بھر جاتا۔ اسے حیرت ہوتی کہ جب صیہونی فسطائیوں
نے مظلوم و مفلس فلسطین پر حملہ کیا اور لاکھوں عربوں کو بہیمانہ وحشت و بربریت کے ساتھ موت کے
گھاٹ اتار دیا تو آزادی، جمہوریت و مساوات کے حامیوں کو کیا ہوا کہ ان میں سے اکثر ظالم کی تائید
کرنے لگے اور بقیہ مجرمانہ طور پر خاموش ہو بیٹھے۔ وہ ابھی تل عفیف اور یروشلم کے درمیان سڑک
پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ وہ پتھر کی ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی رائفل اس کی آغوش
سے ایک شریک حیات کی طرح وصل تھی۔ اس کا دستہ پہرہ پر معمور تھا۔ یہودی یروشلم کے
محاصرہ کو توڑنے کے لیئے بڑی جد و جہد کر رہے تھے۔ عرب افواج نے یروشلم کے قدیمی شہر کو
فتح کر لیا تھا اور اب نئے یروشلم کی یہودی تجارتی منڈی کا محاصرہ تھا۔ متذکرہ بالا شاہراہ کی
حیثیت رگِ جاں کی تھی۔ عرب جیالے اپنے ننگ و ناموس اور اپنے وطن و ملت کی حفاظت
کے لیئے جان لڑا رہے تھے۔ اور صیہونی حملہ آور ٹینک اور بکتر بند موٹریں استعمال کر رہے تھے۔
امریکی سرمایہ دار اور روسی کارخانے ان کی مدد پر تھے۔ جنگ کی رفتار ابھی ذرا تھم گئی تھی۔ وہ
اپنے مورچہ سے نکل کر دو گھڑی کے لیئے نیلے گرم آسمان، چٹیل اور استوار پہاڑیوں اور زیتون
کے توانا اشجار کو دیکھ کر زندگی کی گراں بہا لذت حاصل کر رہا تھا۔ پاکیزہ ہوا اس کے رخساروں
سے کھیل رہی تھی۔ اور اس کے فکر و تخیل کے لیئے مہمیز بن رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ صیہونی مطالبے میں کیا کوئی دُور کی بھی حق داری ہے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے رومیوں نے یہودیوں کو فلسطین و شام سے جلاوطن کر دیا تھا۔ یہ خفیہ ریشہ دوانیاں کرنے والی، آپس میں تفرقہ رکھنے والی، اپنوں سے غداریاں کرنے والی اور اپنے بہی خواہوں کو قتل کرنے والی بدنصیب قوم سارے کرۂ ارض پر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ سے اس نے اپنی ناامی کے باوجود دُنیاوی بادشاہت کا مطالبہ کیا تھا۔ مسیح نے جواباً کہا تھا کہ۔۔ "میری بادشاہت تو آسمانی ہے" پھر اس مغضوب قوم نے امن کے شہزادے کو، اپنے خون اور اپنے گوشت کو، اپنے نجات دہندہ کو صلیب پر لٹکوا دیا۔۔۔ "خداوند خدا یوں کہتا ہے کہ اس کا غضب تم پر بھڑکے گا۔ اور یہ اس لئے ہو گا کہ تم نے خداوند خدا، اسرائیل کے پروردگار کی نافرمانی کی"۔

پُرانے عہد نامہ کی پیشگوئیاں اس کے ذہن میں رہ رہ کر اُبھر رہی تھیں۔ اچانک اُس کا جسم خوف سے لرز اُٹھا۔ پروردگار کی نافرمانی، اور اس کا غضب تم پر بھڑکے گا۔ یہ الفاظ بار بار اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا۔ "تمہارے پلوٹھے مارے جائیں گے اور تمہاری کنواریوں کی چادر عصمت کو تمہارے دُشمن تار تار کر دیں گے" اس کے رخساروں پر غیرت اور غم واندوہ میں غلطیدہ خون کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے وہ قتل عام یاد آنے لگا، جو گذشتہ دنوں صیہونی یہودیوں نے مفتوحہ آبادی کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ننھے بچے، جوان اور بوڑھے مرد اور عورتیں تہ تیغ کر دی گئی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ عرب تو یہودیوں سے زیادہ مغضوب ہو رہے ہیں، خود یہود کے ہاتھوں مقہور۔ وہ اس داغ رسوائی کو مٹانا چاہتا تھا۔

"بہر قیمت! بہر قیمت! اپنے خون سے، سارے عرب کے باحمیت خون سے" اس کا ہاتھ بے اختیارانہ رائفل سے مربوط ہو گیا۔ مگر پرانے عہد نامہ کی پیشگوئیاں اس کے دماغ کی تہوں میں منڈلاتی رہیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ داخلی طور پر ایک آئینہ دیکھ رہا ہے۔ جس میں اس کی قوم کی صورت بھی نظر آ رہی تھی۔ خیالات کی اس خالص ردّ کی تلخیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ چٹان پر سے اُتر آیا۔ اور اپنے رفیقوں سے ملنے کے لئے مورچے کی طرف بڑھا۔ حُریت عرب کے علمبردار مورچے کے قریب سربکف بیٹھے، قہوہ پی رہے تھے۔

گہرا سرخ، گرم اور خوش بُودار قہوہ، خالص عربی قہوہ۔ ان نوجوان مجاہدوں کے پاس راشن کی قلت تھی۔ اکثر وہ قہوہ پی کر ہی گذارتے تھے۔ ان کے پاس کافی اسلحے بھی نہ تھے۔ اقوام متحدہ کے امن پسند اراکین نے اسلحوں کی درآمد پر امتناعی پابندیاں لگادی تھیں۔ اگر روسی "پردۂ حدید" کے اس پار سے اسرائیل کی نام نہاد مملکت کو جدید ترین اسلحے اور طیارے مل رہے تھے، اور "بحرِ ظلمات" کے ساحلوں پر قائم حکومتوں کے خزانوں سے زرِ خالص آرہا تھا، تو اس کی ذمہ دار بھلا اقوام متحدہ کس طرح ہو سکتی تھی؟۔ اس نے اپنے رفیقوں کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ایسی محبت جو صرف میدان جنگ کے رفقاء کے درمیان ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے دل میں انھیں دیکھ کر تازہ اعتماد پیدا ہوا۔ رفیقوں کی آنکھوں میں وہ عزم و توکل جھلک رہا تھا جو بن ہتھیار اور بلا غذا کے بھی آمادۂ ستیز کر دیتا ہے۔

"ایک فنجان ادھر بھی" محمود علمی نے عادتاً کہہ دیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "رفیقو! معاف کرنا! ہم دمشق یا قاہرہ کے قہوہ خانوں میں بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ اوک میں ہی مل جائے تو غنیمت۔"

"یہ مگ حاضر ہے۔ اور بوترابوںؓ کے لئے یہ بھی نہ ہو تو کیا ہے۔"

"تم پر فیضِ بوترابیؓ ہیں کیا شک ہے رفیقو۔ تم باب الحجاز کی حفاظت کر رہے ہو۔ تم روضۂ نبیؐ کے پاسبان ہو۔ تم کعبہ کے محافظ ہو۔ یورپ اور امریکا کے سرمایہ دار صیہونی یہود ناحق ہمارے وطن پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ اُن کی نیتیں اُن کے اعمال سے زیادہ سیاہ ہیں۔ اُن کا آخری نشانہ مدینہ اور مکہ ہے۔ وہ جمہوریتِ اسلامی اور ہماری بین الملیتنا کی جڑوں کو اکھیڑ پھینکنا چاہتے ہیں ــــ" وہ سنجیدہ جوش کے عالم میں سرگرم سخن تھا۔ اُفقِ مغرب سے آنے والی آتش باری کی پیہم آوازوں نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ہر شخص چوکس اور ہوشیار ہو گیا۔ پھر بم اور گرینیڈ بم پھٹنے کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ یہ نوجوان عسکری میدان جنگ میں اب تک اتنے تجربے حاصل کر چکے تھے، کہ وہ مختلف آتش بار اسلحوں کی منفرد گونج اور گرج اچھی طرح پہچاننے لگے تھے۔ سبھوں نے اپنے اسلحہ سنبھال لئے اور ہر مجاہد مقررہ مقام پر تیزی سے پہنچ گیا۔ ٹریچ چشم انتظار بن گئے اور سنگین چٹانوں کے جگر کے اندر دفاعی 'پل باکس' دل مضطر

کی طرح دھڑکنے لگے ۔ آسمان کے نیلے سلیٹ پر ایک طیارہ صلیب کے نقوش بناتا ہوا گذر گیا ۔ جلد ہی اس کے فراٹے کی آواز بھی فضا میں تحلیل ہو کر گم ہو گئی ۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا ۔ دور کی آتش باریاں بھی بند ہو گئیں ۔ مبہم امکانات سے لبریز سکوت ماحول پر طاری تھا ۔ محمود حلمی اپنی چھوٹی دوربین سے مغربی افق کے پردوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا ۔ ایانک داہنی جانب نارنج کے کنج سے مشین گنوں کے متصل تڑاخے سنائی دینے لگے ۔ حملہ شمال کی طرف سے ہو گیا تھا ۔ مورچے کے افسر نے جوابی کارروائی کے احکامات صادر کئے ۔ مجاہدین نے بھی دشمن کے رُخ پر گولیاں برسانی شروع کیں ۔ آگ کے بدلے آگ ۔ محمود حلمی اپنے فرض سے ایک ثانیہ کے لئے بھی غافل نہ ہوا ۔ اُس کی دوربین نگاہیں تل عفیف کی طرف سے آنے والی سڑک اور اس کے اطراف و جوانب کی ایک ایک چٹان، ہر ہر سنگریزے اور ہر پیچ و خم کا محاسبہ کر رہی تھیں ۔ حلمی کے گرد اگرد گولیاں برس رہی تھیں اور شل پھٹ رہے تھے ۔ لیکن وہ فطرت سے بے پرواہ دشمن کی سرحدوں کو اپنی نگاہ کے نیزے سے بلا توقف کھرچ رہا تھا ۔ اپنے رفیقوں کی رائفلوں اور مشین گنوں کی گونج اور گرج اسے بہت ہی سہانی معلوم ہو رہی تھی ۔ دوربین پر ہاتھ رکھے وہ زیر لب بڑبڑانے لگا ۔ "ناخن کے بدلے ناخن، دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ"

مغربی افق پر ایک دھبہ نظر آیا ۔ دھبہ پھیلتا گیا ۔ آسمان اور زمین کے کناروں پر ہل چل تھی، دھبہ نے حرکت و حیات کی صورت اختیار کر لی ۔ محمود حلمی کی دوربین نے افق افق کھنگال دیا ۔ اس نے صاف طور پر دیکھا کہ انسانوں کا ایک مجمع افراتفری میں مشرق کی طرف بھاگا آ رہا ہے ۔ مغرب میں آتش باری بھی ختم ہو گئی ۔ مگر مجمع قریب ہوتا گیا ۔ اب یہ واضح تھا کہ وہ غریب خانماں برباد پناہ کی تلاش میں ادھر آ رہے تھے ۔ اُن کا اکثر حصہ سڑک پر ہی مسافت طے کر رہا تھا ۔ عورتیں چادروں اور برقعوں سے بے نیاز بچوں کو گود میں اٹھائے یا کوئی بوجھ سر پر لئے ہانپتی کانپتی بھاگی آ رہی تھیں ۔ بوڑھے جوان اور لڑکے لبادوں کو سمیٹے اپنے سامان و اسباب سروں، کاندھوں اور بغلوں میں لئے لپکتے یا دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔ حلمی بہت ہی مشوش ہوا ۔ وہ نہتے بے خبری میں میدان کارزار کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ وہ بہت قریب آ گئے ۔ حلمی نے ایک نوجوان رفیق کو اُس جانب دوڑایا، جو پیک جنگی (فوجی چپراسی) تھا، تاکہ عرب

مہاجرین کو متنبہ کیا جائے اور انھیں جنوبی جانب چکر کاٹ کر مشرق کی سمت بڑھنے کی ہدایت دی جا سکے۔ مگر مہاجرین کا مجمع سیدھے سڑک پر بڑھتا ہی آیا۔ پیک نے آکر حلمی کو اطلاع دی کہ مہاجرین کے عقب میں یہودیوں کا ایک مسلح دستہ ہے۔ وہ عربوں کو زبردستی اس راہ پر لا رہا ہے۔ یہ ہمرنگِ زمین دام تھا، 'کمفلاج'! حلمی نے فوراً افسر کو اطلاع دی اور وہ خود بھی فکر میں ڈوب گیا۔ رفیقوں کو اب دو جانب سے حملہ کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ مگر دقت یہ تھی کہ سامنے نشانہ پر عرب مہاجرین تھے۔ یہ شرارت صیہونیوں نے مرتب نقشہ کے مطابق کی تھی۔ محمود حلمی نے دیکھا کہ مغرب سے تین برن گن کی حامل موٹریں تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ یہودیوں نے نئے رُخ سے آتش باری شروع کر دی۔ اس نئی سمت میں جواب دینا محال تھا۔ سامنے بیکس و بے بس عربوں کے سینے کھلے ہوئے تھے۔ حلمی اضطراب میں چیخا۔ !

"بھائیو! جنوب کی جانب! جنوب کی جانب!!" مہاجرین کا اگلا حصہ جنوب کی سمت دوڑ پڑا۔ حلمی نے دیکھا۔ وہ پٹ پٹ مُنھ کے بل گرنے لگے۔ صیہونیوں نے اس طرف باڑھ ماری۔ ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ قماش جنگ اُلجھا ہوا تھا، اور مہاجرین جدھر سینگ سماتا بھاگے جاتے تھے، اُفتاں و خیزاں و نالاں۔ صیہونی گولیاں اُن کا صفایا کر رہی تھیں۔ عرب حفاظتی مورچہ پر بھی شِل برس رہے تھے۔ شمال اور مغرب سے سخت حملہ ہو رہا تھا۔ دو گھنٹوں کی خونریز جنگ کے بعد عرب مورچہ ٹوٹ چکا تھا۔ محمود حلمی چند اور رفیقوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔

اب وہ کہیں نام نہاد مملکتِ اسرائیل کے حلقۂ محصور میں تھا۔ اسرائیل، فلسطین کے دل کی ایک قاش، عرب کے جگر کا تراشہ، جسے اقوام متحدہ کے اربابِ ثلاثہ نے یورپ اور امریکا سے آنے والے صیہونی بھیڑیوں کے آگے خون چوسنے کے لئے پھینک دیا تھا۔ حلمی ہزاروں عربوں کے ساتھ صیہونی کانسنٹریشن کیمپ میں موت سے بدتر زندگی گزار رہا تھا۔ زبردستی کی ناقابلِ برداشت کڑی محنت، ذلّت اور فاقہ ــ کھلے آسمان کے نیچے دن کو سخت گرمی اور رات کو اچانک ٹھنڈ۔ محصور کیمپ میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ عراقی، شامی، نجدی، یمنی اور مصری عرب۔ نوجوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ۔ ایسے بھی جو پرانی وضع کی دو منزلی لوڈر، لے کر میدان جہاد میں اُتر آئے تھے ــ ایسے جن کی ساری کائنات بس ایک بدو

تار تار لبادہ تھا — شہری، پیشہ ور اور بادیہ نشین بدو۔ زیتون اور نارنج کے باغوں میں مزدوری کرنے والے فلسطینی، عرب دارالعلوموں کے طالب العلم، مسلم اور عیسائی سب اپنے ننگ و ناموس، اپنے وطن، اپنی جان، اپنی زمین، اپنی روٹی کی حفاظت کرنے جنگ کی گھمسان میں کود پڑے تھے۔ یورپی فاشسٹ، صیہونی سرمایہ دار سارے عرب کو لوٹ کر ویران کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ عرب عوام اس عظیم خطرے سے واقف ہو گئے تھے اور جس طرح بن پڑتا تھا اس کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مگر اس جاں سوز فرض کی انجام دہی کے لئے سامان پورے طور پر مہیا نہ تھا۔ اور سب سے بڑی کمی یہ تھی، کہ ملوک عرب میں اتفاق نایاب تھا اور مجاہدین میں ایسے عناصر بھی تھے جنھیں حملہ کی وسعت اور گہرائی کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ وہ بغداد، بصرہ، دمشق، عمّان اور قاہرہ کے قہوہ خانوں میں لوبان و مُر کے دھوئیں، پر جوش قصیدوں اور گرم فنجانوں کے درمیان اپنے جذبات کی پرورش کرتے رہے تھے، اور صیہونی روس اور امریکا کی فیکٹریوں اور جنگی تعلیم گاہوں میں اسلحوں کی خریداری اور فوجی تربیت حاصل کرنے میں مشغول تھے۔

حلمی محصور کیمپ کی سنگ لاخ زمین پر تھکا ماندہ بیٹھا ہوا تھا — رات خنک ہو چلی تھی۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد تھا — اور اس کا دل تو اور بھی درد مند ہو رہا تھا۔ اسے شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ کبھی وہ آنتوں کی اینٹھن سے تلملا اٹھتا۔ اور کبھی نقاہت کے سبب نیم بیہوشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا۔ سیاہ آسمان کے ستاروں کے ساتھ اس کے خیالات بھی جھلملا رہے تھے — !

— وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا وسیع احاطہ ہے۔ حلمی دائرۃ المعارف کی حسین عمارت میں داخل ہوا۔ کتب خانہ میں الماریاں کندھے سے کندھا ملائے فوجی قواعد کی حالت میں استادہ تھیں اور صف بہ صف کتابیں پریڈ کر رہی تھیں۔ ہر طرف شل پھٹنے لگے۔ قطار اندر قطار کتابیں گر گر کر گرنے لگیں بہت سی مجروح ہو کر کراہ رہی تھیں۔ سارا کتب خانہ میدان جنگ بن گیا تھا۔ حلمی نے دیکھا کہ لطفی منفلوطی اور خلیل جبران کی کتابیں دم توڑ رہی ہیں۔ جب جبران کی ایک کتاب کی روح پرواز کرنے لگی تو دم واپسیں اس کے یہ کلمات سُنائی دیئے:۔

"اے زمین! کتنی حسین ہے تو، اور کتنی دل کش، ہم تیرے چہروں کو خون سے رنگتے ہیں، اور تو ہمارے چہروں کو آبِ کوثر سے دھوتی ہے۔ ہم تیرے عناصر سے بندوقیں اور توپیں بناتے ہیں اور تو ہمارے عناصر سے گلاب اور سوسن کے پھول پیدا کرتی ہے" ـــــ دائرۃ المعارف کی عمارت منہدم ہوگئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ خرابے کے ایک گوشہ سے ایک پیکر نمودار ہوا۔ سیاہ برقعے میں محجوب۔ وہ پیکر قریب آتا گیا۔ قریب آکر اس نے نقاب اُلٹ دیا۔ حلمی نے اس کے غم ربا، دلکش، حسین چہرے کو پہچان لیا۔ وہ تو شمع تھی۔ لوگ اسے دارالعلوم کی "شمعِ فروزاں" کہتے تھے۔ وہ بیروت کے دارالعلوم میں نئی آئی تھی۔ طالبات اُسے "الحمرا کا گلاب" کہتی تھیں۔ وہ حلمی کی پرستیدۂ خیال تھی، وہ اس کا رشکِ مہتاب چہرہ، اس کی ناقابلِ فہم، خواب آگیں، سحرناک آنکھیں، سفید کبوتروں کے جوڑے کی طرح اس کے پیارے پیارے ہاتھ، اس کی چراغ کی لَو کی مانند لانبی لانبی مخروطی دل کش انگلیاں، اس کا جاذبِ نگاہ پیکرِ موزوں، اس کا حشر خیز خرامِ ناز۔ شمع نے حلمی کی دنیائے دل ہی بدل دی تھی۔ نئی روشنیاں! نئی روشنیاں!!

حمرا کے گلاب نے دائرۃ المعارف کے خرابہ کو بھی گُل افشاں کر دیا تھا۔ پھر نارنج و زیتون کے کُنج رونما ہوئے۔ اور مشین گنوں کی آوازیں اور خندق اور پھر خندق عرب مہاجرین کی لاشوں سے بھر گئی۔ مرد، عورتیں اور بچے ـــ!

یوں ہی رات بھر محمود حلمی کے خیالات بے ہوشی اور ہوش کے درمیان جھلملاتے رہے اور پھر صبح ہوئی تھی۔ مگر حلمی کے لئے کالی رات کا لامتناہی سلسلہ تھا۔

صبح ہوتے ہی چند عرب قیدیوں کو پابجولاں لایا گیا۔ ایک صیہونی سپاہی نے انھیں کیمپ کی ایک طرف قطار میں کھڑا کیا۔ اُن سے کچھ سوالات پوچھے گئے۔ اور پھر انھیں دوسرے دوسرے قیدیوں کی آنکھوں کے سامنے گولی سے اُڑا دیا گیا ـــ حلمی کے قریب ایک عرب قیدی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ قیدی نے سنایا کہ ان میں سے دو نوجوان اس کے گاؤں عریش کے رہنے والے تھے۔ صیہونی یہود عربوں کے شہری مکانات اور اُن کے دیہاتوں کو ڈائنامیٹ سے اُڑا رہے تھے۔ مگر جہاں جہاں عرب یہود کے مکانات بھی ملے جُلے ہوئے تھے۔ کُل عریشی نوجوانوں نے اپنے گاؤں کو ڈھانے سے انکار کر دیا ـــ وہ اس پیارے گاؤں کو

کیسے ڈھائے۔ وہاں اُن کی طفلی، عنفوان شباب اور جوانی گذری تھی، وہ اُن کے خاندانوں اور قبیلوں کا مسکن تھا۔ وہ گھر اُن کے جسم و جان کے حصّے تھے۔ وہاں اُن کے خیالات و ارمان پلے تھے۔ وہ اُن کی حیات کا گہوارہ، وہ اپنے اشجار، وہ شناسا باغ و نخلستان۔!

"ہم تو عریشی یہود کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے سہتے آئے تھے۔ ان صیہونی غیر ملکی یہود نے ہمارے باپوں، بھائیوں، ماؤں اور بہنوں کو قتل کیا اور اب وہ ہماری بستیوں کو مسمار کر رہے ہیں"

حلمی کا رفیق عرب قیدی آنسوؤں کی جھڑی کے درمیان اپنی بپتی بیان کرتا رہا ـــــ

" وہ سب سے لانبا نوجوان جسے ابھی گولی سے ہلاک کیا گیا، میرا دوست فوتحی تھا۔ آج فجر کی نماز تک وہ میرے ساتھ تھا۔ کل زبردستی اسے عریش کے عرب مکانوں کو ڈھانے کا حکم دیا گیا۔ وہ اپنے گھر، اپنے آبائی مکان میں داخل ہوا۔ مانوس در و دیوار سے اپنے آپ کو اس قدر قریب پاکر اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا گھر اپنی آغوش کھولے اسے اپنے سینہ سے بھینچ لینے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔ چند ماہ پہلے وہ اپنے گھر میں اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کا باپ اسی مکان میں جاں بحق تسلیم ہوا تھا۔ بہت پہلے، جب وہ بچہ تھا۔ ہر جانب سے شناسا پیاری آوازیں سُنائی دیں۔ وہ جذبات کی گراں باری سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ خونی منظر گھوم گیا، جب اس کے بھرے گھر کو تہہ تیغ کیا گیا تھا۔ وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔ بے خبری کے عالم میں وہ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں دیوار کے محراب کے اندر کھونٹی سے آویزاں کئی ملبوس تھے۔ وہ اُن سے دوڑ کر لپٹ گیا۔ اس کی ماں اور بہن کی خماریں اور اوڑھنیاں اب تک اُسی طرح ٹنگی ہوئی تھیں، جیسے اُن عزیز ہاتھوں نے اُنھیں لٹکایا تھا۔ وہ ان کپڑوں سے لپٹا رو رہا تھا، کہ ایک صیہونی سپاہی نے پیچھے سے آکر رائفل کا کندہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔"

وہ عرب، حلمی کے سامنے زار و قطار رو رہا تھا ـــــ "صیہونیوں نے عریشی نوجوانوں کو مسلسل زد و کوب کیا۔ میرے غیور ہم وطنوں نے اپنے پیارے گھروں کو ڈھانے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ یہی ان کا قصور تھا۔ رات بھر فوتحی میرے پہلو میں کراہتا رہا۔ اور آج وحشی ظالموں

نے میرے سب بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار ہی دیا ــ"

حلمی کی آنکھیں بھی پُرنم ہوگئیں۔ لیکن سیلِ اشک، اُس کے دل میں گھُٹ کر ہی رہ گیا۔

معنی خیز التوائے جنگ، 'لیک سیکسس' کے 'شیش محل' کی عاقلانہ امن پسندی اور پیرس کے 'پیلیے دی شیلو' کی مخمور انسان دوستی نے عرب، کے زخمی دل و جگر کا مداوا تلاش کر ہی لیا تھا، اور یورپ کے اُکھڑے اُجڑے یہودیوں کے درد کا درماں بھی یوں مل گیا کہ سیل یہود کو فلسطین کے تنگ، نائے اسرائیل میں سمو دینے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ ساحرانِ سیاست نے دریا کو کوزہ میں بند کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود محمود حلمی جیسے نوجوان خواہ مخواہ کُڑھتے ہی رہے۔ اُن کے آنسو نہ تھمے۔ اُن کے دلوں سے خون رِستا ہی رہا۔

محمود حلمی نے اپنے آپ کو نو ہی راستوں کی تعمیر میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے پایا۔ صیہونی حملہ کی بڑی تیاریاں کر رہے تھے۔ جنوب، مشرق اور شمال کی جانب ایسے راستے درست کئے اور نئے راستے بنائے جا رہے تھے، جن پر ٹینک کے علاوہ میکانکی دستے گذر سکیں۔ ہوائی اڈوں کی تعمیر بھی گھما گھمی سے ہو رہی تھی۔ آخرش صیہونیوں نے 'شیش محل' پر پتھر پھینک مارا۔ موسم سرما کے آغاز میں وادی نغب پر یلغار شروع کر دی۔ 'سرخ دیوار آہن' کے عقب سے لوہا اُڑ اُڑ کر اسرائیل پہنچ رہا تھا۔ مشرقی یورپ سے جنگی طیارے وہاں کثرت سے آ رہے تھے اور یہ طیور نارنج و زیتون کے شاداب و گنجان کنجوں میں چھُپ چھُپ کر گھونسلے بنا رہے تھے، تاکہ 'شیش محل' کے نگہبانوں کی نگاہِ غلط انداز نہ پڑ جائے۔ اپنے سرمایہ و سامان پر نازاں صیہونی یہود وادیِ نغب پر چھاتے ہی گئے۔ مصری دستے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ شرق اُردن کی عساکرِ عربیہ (عرب لیجن) قدیم یروشلم میں خاموش بیٹھی تھیں اور جیوش شام گلیلی جھیل کے ساحل پر آئینۂ آب میں 'شیش محل' کی جادوگری کا عکس مشاہدہ کر رہے تھے۔ صیہونیوں نے بڑے خون خرابے کے بعد بیرشیبا کو فتح کر لیا۔

ایک روز محمود حلمی دوسرے اسیروں کے ساتھ نواحِ بیرشیبا میں کدال اور بیلچے سے ارضِ فلسطین کو صیہونیوں کے حکم سے کھود رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ فلسطین کی پاک اور پیاری مٹی میں اس کی محنت کا پسینہ مل رہا تھا۔ اُس کا دل پگھل رہا تھا۔ اُس کا خون پانی ہو رہا تھا۔ وہ آرزومند

تھا اپنی قبر کھود کر اس میں دفن ہو جائے۔ کیونکہ اس سے زبردستی کام لیا جا رہا تھا، جس سے اُسے کراہت آتی تھی۔ وہ اپنی ملت، اپنی قوم کی تدفین کے لئے مجبور و مقہور ہو کر زمین کھود رہا تھا۔ مادر وطن کا جگر چاک کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "کاش وہ لڑتا ہوا مارا جاتا، اسیر نہ بنتا" کئی دنوں سے حلمی سخت اذیت و کرب میں مبتلا تھا۔ اس کے قلب کو جو سب سے بڑا غم کھائے جا رہا تھا، وہ عرب حکومتوں کی آپس کی رقابتیں تھیں۔ عرب محاذِ اتحاد میں رخنہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس دُکھ سے حلمی کا دل چھلنی ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جسمانی صعوبتوں کو بھولا ہوا تھا۔ کبھی اسے جاں سوز مایوسی ہوتی۔ کبھی وہ شکست قریب کی تلخیوں کے گھونٹ پیتا۔ اندوہ و مصیبت کی چٹان اس کے ذہن و دماغ کو پیس رہی تھی۔ کندھے سے کندھا ملا کر لڑتے ہوئے مارا جانا آسان ہے۔ یہاں تک کہ متحدہ مقابلہ کے بعد شکست کی نشتر سامانیاں بھی گوارا ہیں۔ مگر جو غم سہا نہیں جاتا وہ قومی خطرہ کے وقت آپس کا اختلاف یا رفقائے کار کا علیحدہ ہو جانا ہے۔ حلمی ایسے ہی درد و سوز میں مبتلا تھا۔ وہ دشمن کے مقابلہ میں سرگرم عمل ہو کر اپنے خون کے قطرے قطرے کو شہید آزادی بنا دینا چاہتے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اپنی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں میں سوچ رہا تھا۔ اُس نے اپنے قریب بیرِ شیبا کے مضافات کے بدوی قبائل کے شیوخ کو بیٹھا دیکھا۔ وہ تیس کی تعداد میں تھے۔ اپنی عبائیں اور کندھوں تک لٹکے سر کو چھپائے ہوئے کسابوں کے ساتھ وہ سب اکڑوں بیٹھے ہوئے مُرغوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے، جو کسی مطبخ میں ذبح کرنے کے لئے قطار اندر قطار رکھے گئے ہوں۔

ان کے سامنے چند دو طرفہ دستوں والی صراحیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مینا کی وضع کی خوب صورت لانبی گردن والی صراحیاں — حلمی ان صراحیوں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ وہ شیخوں کے بے رونق، بُجھے ہوئے، شرمندہ چہروں کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ شیوخ کی آنکھیں زمین میں دھنسی جا رہی تھیں یا بے آسرا، تھکی ہوئی، افق میں سرگرداں تھیں۔ وہ پاتال تک کریدنا چاہتی تھیں، لیکن تقدیر کی گتھیاں ان سے سلجھ نہیں رہی تھیں۔ اُنہیں راستہ کیسے ملتا۔ اُن کی پژمُردہ آنکھوں کی شمعیں بُجھی ہوئی تھیں۔ وہ موت کی تاریک وادی میں حیات ابدی کی تلاش سے قاصر تھیں۔ یہ شیوخ عرب بیرِ شیبا کے صیہونی ملٹری گورنر سے اپنی جانوں کی امان طلب کرنے آئے تھے۔ وہ اپنے تاریخ اور زیتون کے باغات کی بھیک مانگنے آئے تھے — وہ اپنے زرکار خیموں کے عیش کی حفاظت کا

وسیلہ ڈھونڈنے آئے تھے۔ لیکن آوازان کے دلوں میں گھٹ رہی تھی۔ اُن کے حلقوم پھنس رہی تھی۔ بیرِ شیبا کے یہودی ملٹری ڈکٹیٹر کے حضور دوبارہ عرض پیش کرنے آئے تھے کہ انھیں حکومتِ اسرائیل کی وفادار رعایا بننے کا شرف بخشا جائے۔ انھیں جو پچیس ہزار بدوی اہلِ قبائل کے سردار ہیں۔ مگر اُن کے ضمیر کراہ رہے تھے۔ وہ نقب زنوں سے یہ سوال گدایانہ کر رہے تھے کہ انھیں ان کے گھروں میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ وہ ظالموں سے یہ التجا کرنے کو بے قرار تھے کہ انھیں مظلوم بننے کا فخر عطا کیا جائے۔ ان کی مضطرب روحوں کی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ محمود حلمی نے بدوی شیوخ کی آنکھوں کی شمعِ کشتہ کی بے نوری دیکھی۔ اُن کے دلوں کے پژمردہ لالوں کا مشاہدہ کیا اور ان کے نا اُمید و بے عمل جسموں میں اُن کی مضمحل روحوں کی تدفین کو محسوس کیا۔ حلمی کے نفس کے اندر صرصر و سموم چلنے لگے۔ وہ اس منظرِ جانگزا کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اس کے دل کے بیکراں اعماقِ محبت سے نفرت کا آتش فشاں پھوٹا۔ پر شور غیر مرئی لاوا اُس کی نگاہوں سے رواں تھا۔ حلمی اس گھڑی اپنے آپ سے، اُن سارے شیوخ سے، صیہونیوں سے، اور مشرق و مغرب کی سُرخ و سفید شہنشاہیت و سلطائیت سے نفرت کر رہا تھا۔ ایک عظیم مقدس نفرت کا جذبہ اس کے سارے وجود پر طاری تھا۔ یہ جذبہ سیلابِ رواں کی صورت اختیار کر لینے کو ہانپ رہا تھا، ایسا طوفانِ نوح جو سب کو غرق کر دے۔ محمود حلمی نے بیلچے کو اپنے ہاتھ میں مضبوط پکڑ لیا۔ اس نے شیوخ سے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کاش! صیہونیوں کا خون آشام طائفہ ارگُن زوائی لیومی تم سب کو تہ تیغ کر دیتا!"

"شیوخ! تمہاری غیرت و حمیت کو کیا ہوا؟" حلمی کے نوجوان اسیران رفیق کام چھوڑ کر حلمی اور شیوخ کی باتیں سُن رہے تھے وہ سب غیرت و شرم کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ اور اس عار و ننگ کو دور کرنے کے لئے بے چین تھے۔ انھوں نے ایک پچاس سالہ شیخ کا جواب تلملا کر سُنا۔ "ہماری غیرتیں ملوکِ عرب کی زردار ہتھیلیوں میں بند ہیں۔ یا پھر پٹرول کے ساتھ دیارِ فرنگ کو بھیج دی گئیں۔"

"بخدا! بہت سے سینوں میں وہ اب بھی محفوظ ہیں۔!" محمود حلمی نے کہا اور نعرۂ تکبیر لگاتا ہوا وہ صیہونی نگہبانوں پر ٹوٹ پڑا۔ بہت سے اسیروں نے اس کا ساتھ دیا۔ انھوں نے

کئی صیہونیوں کو مار گرایا۔ اور پھر وہ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں خاکِ پاکِ فلسطین سے وصل ہو گئے۔ مادرِ وطن نے انھیں اپنے زخمی و رنجور سینہ سے لگا لیا۔

ایک بوڑھے بدوی شیخ نے زیرِ لب کہا۔ "انھیں مُردے نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں۔"

"کیچلیاں اور بالِ جبریل"
دسمبر ۱۹۵۹ء

کینچلیاں اور بالِ جبرئیل

[یہ افسانہ تاثراتی اور ایمائی ہے۔ اس کی تکنیک بھی اسی آہنگ کی استعمال کی گئی ہے۔ افسانہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ نمبر کی جو اشکال مقرر کی ہیں وہ بھی ایمائی ہیں۔ مثلاً (۱)، (۲)، △۳ اور آخری ۴۔ پہلی شکل عام وحدت کی سمبل ہے۔ دوسری خالق و مخلوق کی سمبل، جس کی انتہا قاب قوسین ہو جاتی ہے۔ تیسری وہ مثلث ہے جس میں آدم کی اولاد گرفتار ہے، اور چوتھی شکل شکست و ریخت کی سمبل ہے، جب چار دیواریاں ٹوٹ چکی ہیں۔]

(۱)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا..........

آدم! آدم! آدم!

ہر طرف نور ہی نور تھا جبکہ اطراف بھی نہ تھے اور آنکھیں بھی نہ تھیں۔ میں اس وقت کی کہانی سنا رہا ہوں جب گوش ہوش بھی نہ تھا، وہم و خیال بھی نہ تھے۔ راز راز نہ تھا۔ وہ اپنے آپ پر آشکار تھا۔ کوئی رازداں بھی نہ تھا۔ نہ صبح ازل میں کسی کو ہونے انکار کی جرأت ہوتی تھی۔ نہ روح، نہ مادہ، نہ فرشتے، نہ شیطان۔ آدم میں بھی نہ تھا۔ نہ پانی نہ مٹی۔ عناصر لامعلوم۔ مظاہر نامشہود۔ نہ سمت۔ نہ جہت۔ نہ رنگ نہ صورت۔ نہ لفظ۔ نہ معنی۔ کچھ نہ تھا۔ مگر وہ تھا۔ عدم کی رات میں سوتا سنسان

جاگتا پاک پروردگار - عالم ہو تھا - شب لا میں حسن کی جلوہ فشانی دیدنی تھی ، مگر نہ دید نہ شنید -
صرف خود بینی تھی - ضمیر حسن میں جمال و جلال کی موجیں اُٹھ رہی تھیں - روح کن فکان میں خود بینی
کی ایک تیز ہوک اٹھی - مصدر قوت ساکن تھا - اس میں تحکمیں پڑ پڑ گئیں - اچانک حرکت کی
لہریں اُٹھیں - پرتو جمال بے قرار ہوا - جوہر آئینہ پیدا ہوا اور پھر آئینہ سامانی ہوئی - پہلے عالم انفس کو
جنم دیا گیا - بعد ازاں عالم آفاق پیدا کیا گیا -

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں !

ضمیر یزداں میں لطیف مگر قوی لہریں اُٹھیں اور ایک حیرت فزا اور امکانات سے لبریز لفظ

کُن

ادا ہوا - مگر ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ حرف و صوت نہ ہوا - تاہم یہ جانِ کائنات و روح حیات تھا -
تخم زندگی ! اور دیکھو بیج میں باغ - ! اور پھر ـــ

فیکون

عالم ہُو سے خلاؤں کی وسعتیں پیدا ہوئیں - ہر سُو برق وش آتشیں پر کالے لہرانے لگے - رنگین سیماب
منڈلانے لگے - "خیال" نے صورتیں اختیار کرنی شروع کیں - "قوت" نے مادہ کی نیرنگی کے روپ
دھارن کیے - اظہار فیکون میں قرنہا قرن لگ گئے - مگر یہ زمان و مکان سب کچھ اضافی ہیں -
تخلیق کی بوالعجبیوں کو ظاہر کرنے کے لئے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ کُن فیکون کا قرن
بھی ایک آن ہے اور آن بھی ایک قرن - ایک کُن کے بیج سے ستاروں اور سیاروں کے غنچے کھلے
چاند کی کلی چٹکی اور پھول بنی - آفتاب کا پھل لگا - صحرا صحرا ، دریا دریا وجود میں آئے - دشت و
بیاباں - جنگل اور کوہستان ، بر و بحر ... ...
... ...

(۲)

.... کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا -

و ہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں حُسن کی بزم ناز بھلا عشق کی انجمن آرزو کے بغیر کیسے

بجنی! اور کچھ نہ ہوتا کیسے! کسی کو نشاطِ کارکس ڈھب سے نصیب ہوتا۔ وہ غیر مبتدل لذتِ ارتقا اور کیفِ انقلاب کس سبیل سے حاصل کرتا۔ خالق نے مخلوق کا استعارہ پیدا کر لیا۔ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں، اور نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا، پر عمل ہو رہا ہے۔ غیر فانی نے فانی کو رچا۔ جینے کا مزہ پانے کو۔ ہر یوم نئی شان، نئی آن! گلستاں کا دروازہ کھلا۔ جنّت۔! مالی نے عطرِ مجموعہ تیار کیا۔ مٹی میں روح ڈالی۔ یہ طرفہ تماشہ تھا اور اسے اور تماشہ بنایا گیا۔ فرشتوں کی سبھا سجائی گئی۔ نظرِ انتخاب کی فتنہ سامانی نے نیا گُل کھلایا۔ قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند۔ کسی نے السنت کہا اور کسی نے ہاں کہہ کر بھی انکارِ عظیم کا پہلو نکال لیا۔ کوئی دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ مگر یہ کانٹا دراصل میرے دل و جگر کے لئے تھا۔ سو وہ بھی ہو گیا۔ ابھی تو آدم کی زندگی انگڑائی ہی لے رہی تھی کہ کش مکش، اقرار و انکار میں مبتلا کر دی گئی۔ کون کہے کہ پیمانے لبلا رہی۔ یہوداہ نے بناوٹی غصّہ دکھلایا۔ حیات کو پیمانۂ امروز فردا سے ناپ ہی نہیں سکتے۔ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں، خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری لیکن میری کہانی میری زبانی سننے کو نہ جانے کون بے چین ہے کہ آپ بیتی سنانے میں مجھے بھی مزہ ملتا ہے۔ کون جانے کس چیز کا بارِ امانت میرے سپرد کیا گیا۔ پہلا واسطہ فرشتوں سے پڑا۔ پھر شیطان سے۔ بعد ازاں جبریلِ امین کسی کا فرمان سنا گئے۔ اور ایک عطیۂ ربانی بھی پیش کر گئے۔ عورت! لذت، کیف و سرمستی اور تکمیل کا ذریعۂ لطیف۔ ہر ابجر شاداب باغ تھا۔ جنّت عدن۔

ایک روز نہایت ہی خوب صورت سانپ رینگتا ہوا آیا۔ اور پھر آتا رہا۔ میں کیا عرض کروں۔ کہتے ہیں میں آزاد ہوں۔ مختار ہوں۔ میں تو جبریل، عورت اور شیطان کے مثلث میں مارا گیا۔ اور نہ معلوم عورت خود میرا متمثّل دردِ پہلو ہے۔ میری بائیں پسلی سے پیدا شدہ حسین مورت یا میری دعائے مقبول۔ عورت بھی تو یہی کہتی ہے کہ میں بھی خدا، شیطان اور مرد کے مثلث میں گرفتار ہوں۔ ہم دو گھڑی بھی تو آزادی کا سانس نہ لے سکے۔ دم بھر کے لئے دوسروں کے اثرات سے بری نہ ہو پائے۔ ؎

ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی!

بری زندگی کیا! تلوّن مزاج یار کی طرح آنی جانی فانی۔ شجرِ ممنوعہ کا واقعہ تو گذر گیا۔ اس

کے بعد قید لامعلوم شروع ہوئی ۔ جسے بچانے کی تہمت بھی بالائے غم ہائے دگر برداشت کرنی پڑی۔ موت نے بڑا کرم کیا۔ لیکن اس سے قبل بہت ہی عجیب ، بہت حیرت ناک واقعات رونما ہوئے ۔ عورت نے ایک نئے آدم کو جنم دیا۔ حیات کے اندر سے حیات پیدا ہوئی مٹی سے آدم کا پیدا ہونا اتنا حیرت ناک نہ تھا اور حیرت بھی کیسے ہوتی ۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی!

لیکن عورت کے بطن سے سلسلۂ آدمی کی ابتدا ، خیرہ کن حقیقت تھی ۔ میری روح نئے آدم اور ہر آدم میں بولتی رہی ۔ ہر آدمی میں میں ہی میں تھا ۔ موت آئی ۔ میں مر گیا مگر میں زندہ رہا ۔ کاش میں مرجاتا! میں مرتا جیتا رہا ۔ کتنا عجیب ہے یہ سانحہ! میں ہوں بھی اور ہر وقت نہ ہونے کا احساس بھی لئے ہوئے ہوں ۔ بے ثباتی کا غم اور گاہ پائندگی اور تسلسل کا بارگراں ۔ میں خودی کو پالتا رہا۔ خدا سے روٹھا رہا۔ لیکن کبھی کبھی مجھ پر بے خودی بھی طاری ہوتی رہی ۔ خدا کو منانے کا جذبہ بھی جاگتا رہا۔ میری حیات کا سب سے اندوہ گیں باب دل مبتلا ہے یا فکر رسا؟ نہیں معلوم ۔ جذبات کے نشتر کے بعد سب سے گہرا نشانہ فکر و خیال نے لگایا اور اب تو دل و دماغ دونوں میرے خلاف سازش کرتے رہتے ہیں ۔ الامان!

ڈبویا مجھ کو ہونے نے ....

میں نے بہت سے اسم سیکھے ہیں اور اسمِ اعظم بھی سیکھا ۔ میں انھیں سیکھ کر بھولتا اور بھول بھول کر سیکھتا رہا۔ میں اپنے بیتے دنوں کی جھوٹ سچ کہانیاں بناتا رہتا ہوں ۔ محروم وصال تو کر دیا گیا ہوں مگر محرومِ تمنا نہیں ہوں ۔ میری آرزوئیں کہانیاں گڑھتی ہیں اور میری حسرتیں شاعری پیدا کرتی ہیں ۔

عمر خیام نے ایک کہانی کہی تھی ۔ کوزہ نامہ ۔ مٹی کی مخلوق کی کہانی ۔ آپ بیتی ۔ یہ مینا و جام کو کون بنا کر توڑتا ہے؟ انھیں شراب سے کون بھرتا اور خالی کرتا ہے؟ مگر کہانیوں اور گیتوں کے مینا و جام تو میں خود بناتا ہوں ۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ۔

افسانہ از فسانہ خیزد —— پرماتمانے آتما کو مادہ میں داخل کر دیا۔ میری روح جس وقت مادہ میں ڈالی گئی، مجھے عجیب احساس ہوا۔ مادہ کو کیا احساس ہوا ہوگا نہیں معلوم۔ روح نے مادے کے ذرّے ذرّے میں سرایت کرنا شروع کر دیا۔ اس عمل سے روح کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس دردناک تجربہ سے میرے وجود میں ایسی کپکپی اُٹھی کہ مادہ بھی لرز اُٹھا۔ روح و مادہ کے امتزاج و ترکیب سے 'مَیں' کا احساس پیدا ہوا۔ "مَیں" تو موجود تھا لیکن مَیں کا احساس نہ تھا۔ کیا کہوں احساس کی اذیت بخشیوں کو۔ احساسِ اوّلین کی پہلی گھڑی سے لے کر آج تک مَیں نے اَن گنت زبانوں میں لاتعداد استعارے اور تشبیہیں پیدا کیں۔ مگر احساس کی اذیت رسانیوں کی صحیح اور مکمل ترجمانی نہ ہو سکی۔ میری محرومی اور نارسائی کا یہ پہلا باب ہے۔

مادے کے بے شمار روپ تھے۔ ان میں روح گُم ہو گئی۔ آسمانوں کے تارے گنے جا سکتے ہیں مادہ کے روپ نہیں گنے جا سکتے۔ روح بالکل کھو گئی۔ جیسے گھنیرے جنگل میں تنہا بچہ۔ روح کے ملتے ہی مادہ نے اور تیزی سے بہروپ بدلنا شروع کیا۔ "مَیں" کا اوّلین احساس کب اور کس منزل پر جاگا۔ یہ بتایا نہیں جا سکتا۔ یہ احساس مکمل کب ہوگا۔ یہ بھی نہیں معلوم۔ اور ہاں صرف میرا جسم ہی روپ نہیں بدلتا۔ میرے اندر کی دنیا بھی بدلتی رہتی ہے۔ کبھی آگے بڑھتی کبھی پیچھے ہٹتی ہے۔ میرے اندر احساسات کے بعد جذبات کی آنچ اُٹھی۔ پھر تخیلات پیدا ہوئے۔ بعد ازاں ادراک جاگا۔ مَیں نے یہ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ یہ نت نئی اُٹھنے والی اندرونی موجوں کے یونہی سے نام ہیں۔ بالکل ادھورے۔ غرض یہ کہ میرے اندر کی دنیا باہر کی نسبت زیادہ تیزی سے بدلتی رہی ہے۔ مَیں اپنے روپ رنگ اور اپنے اندرونی ڈھنگ کو پہچاننا چاہتا ہوں مگر پہچان نہیں پاتا۔ کسی کو قرار نہیں۔ مَیں بھی بے قرار ہو جاتا ہوں۔ اور رونے لگتا ہوں۔ ہر آن ایک نئی موت، ایک نئی حیات۔ کیسی المناک زندگی ہے۔ جب مَیں اپنے آپ کو بھی نہ جان سکوں، نہ پہچان سکوں، نہ سمجھ سکوں! اور غضب تو یہ کہ زندگی ——

جاودان پیہم دواں !

مَیں اپنی صورت و ہیئت کیا بتاؤں؟ میں اپنی کیفیت و حالت کس طرح بیان کروں؟

خودکشی و خود شکنی کو بھی جی چاہتا ہے۔ اور میں کر بھی گذرتا ہوں لیکن میری موت کی خاکستر سے حیات کی چنگاری بھی پھوٹتی ہے۔ نئے سرے سے نئے قالب کے دُکھ درد جھیلنے پڑتے ہیں۔ اور پھر سے میں اپنی تہیں خود اُکھیڑنے لگتا ہوں۔ کبھی اپنے قالب کو کھرچتا ہوں، کبھی روح کو کریدتا ہوں۔ گاہ باہر جھانکتا ہوں۔ گاہ اندر دیکھتا ہوں۔ کچھ سمجھتا ہوں۔ بہت کچھ نہیں سمجھ پاتا۔ غور و فکر میں مبتلا ہی رہتا ہوں کہ کبھی باہری دنیا اندر کی دنیا کو بدل دیتی ہے۔ اور کبھی اندر کی دنیا باہر کی دنیا کو تہہ و بالا کر کے بدل ڈالتی ہے۔ میں سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔ اور سوچنے کا موضوع بدل چکا ہوتا ہے۔ گھبرا کر میں ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی سعی ناکام کرتا ہوں۔ ماضی غیر مبدل ہے۔ مستقل ہے اٹل ہے۔ لیکن خود میری نگاہ بدلتی رہتی ہے۔ جیسے دوربین میں نت نئے شیشے لگائے جائیں۔ نظر کا مرکز و محور اور فوکس بدلتا ہے۔ زاویہ نگاہ بدلتا ہے۔ جانا پہچانا ماضی بھی دھندلا کر رہ جاتا ہے۔ مجھے پناہ نہیں ملتی۔ بوکھلا کر حال کا جائزہ لینے لگتا ہوں۔ اُسے سمجھنا چاہتا ہوں۔ لیکن حال سے زیادہ غیر یقینی اور کوئی شئے نہیں۔ ارتقا اور انقلاب کا نقطہ مرکزی۔ گرم جولاں، تپاں و لرزاں، شعلہ فشاں، شور کناں۔ شدید حدت، روشنی اور رفتار کا بھڑکتا ہوا سیابی ریولا۔ میں حال کی بھٹی میں جلنے لگتا ہوں۔ پگھلنے لگتا ہوں، بکھرنے لگتا ہوں اور کوہ آتش فشاں کے لاوا کی طرح پریشان ہو کر مستقبل کی جانب پرواز کرنے لگتا ہوں۔ ایک انجان دنیا کی طرف۔ مستقبل کے تصور سے دو گھڑی کے لئے پناہ مل جاتی ہے۔ یا شاید صرف ایک آن کے لئے۔ جو بھی ہو، بعد میں دل ہی کیوں نہ ٹوٹے۔ میں آرزو پرور رہ مستقبل کو اپنے فکر و خیال کی مدد سے جس طرح چاہتا ہوں پروان چڑھاتا ہوں۔ مستقبل حال بن جاتا ہے۔ دل ٹوٹتا ہے۔ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ پر شاید مستقبل کبھی بھی حال نہیں بنتا۔ حسرتیں اور تمنائیں مستقبل کے نئے ہیولے بناتی رہتی ہیں۔ لیکن اس پر پرواز سے مجھے قرار نہیں ملتا۔ ہر لمحہ اضطراب پیہم سے سیماب وار و برق وش بنا رہتا ہوں۔ پھر میں گردش مکان اور رور زمان کو روکنے کے لئے بڑے جلال کے ساتھ اُٹھتا ہوں۔ جیسے میں خود خالق زمان و مکان ہوں۔ ایک عظیم الشان تصادم ہوتا ہے۔ اور جریدۂ عالم پر میرا ثبت دو دوام ہو یا نہ ہو ایک کامیاب المیہ ضرور مُرتسم ہو جاتا ہے۔ میں ایسے اَن گنت المیے پیدا کر تا رہتا ہوں۔ ایسے المیوں کا ہیرو میری خودی ہے۔ میری خودی مادی اور روحانی

کیچلیاں بدلتی رہتی ہے۔ پھنکارتی ہوئی، کف در دہن، غضب ناک و زہرناک۔ کیچلی کا بدلا جانا ایک ماجرائے قیامت ہے۔ تبدیلی کا لفظ بڑا سادہ سا لفظ ہے۔ مگر اس لفظ کا عمل میرے اوپر ہر بار جہنم کے درد و کرب کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں اپنی خودی کو پوری طرح جاننا چاہتا ہوں۔ تاکہ اسے بھی ساکن اور منجمد کر دوں، اور تصادم سے رد کوں۔ مگر میری متحرک خودی تو چھلاوہ ہے۔ برقِ خاطف ہے۔ میں نے زہرِ خودی کے لئے بیخودی کا ایک تریاق ایجاد کیا ہے۔ میں نے اس تریاق کا استعمال یہ سمجھ کر کیا کہ مجھے سکون حاصل ہوگا۔ میں خوش تھا کہ نجات ملی۔ آرام ملا۔ اب کیچلیاں نہیں بدلیں گی۔ ارتقاء اور انقلاب کی رو رک جائے گی۔ "آواگون" کا چکر ختم جائے گا۔ لیکن ابھی مجھے ایک گونہ بے خودی ہی حاصل ہوئی تھی کہ میرے بازو میں ایک نئی چیز نمودار ہونے لگی۔ کچھ دنوں کے اندر اندر ہی یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ مجھے نئے قسم کے پر لگنے لگے ہیں۔ یہ پر بڑھے اور پرواز کے قابل ہوگئے۔ مجھے پہلے پہل تو سخت کوفت محسوس ہوئی۔ لیکن پروں کی نمود کے ساتھ ہی ساتھ میرے نفس کے اندر بھی آہستہ آہستہ تبدیلی رونما ہونے لگی۔ دھیرے دھیرے من میں ایک نئی ہوک اُٹھنے لگی۔ یہ نئے انداز کی بیتابی تھی۔ دل میں اضطراب۔ روح کو پھر رقص و وجد کی تمنا۔ سکون پھر رخصت۔ سطح بدل گئی۔ رُخ بدل گیا۔ منزل بدلی۔ مقصود بدلا۔ اب خودی کے بدلے خدا کے عرفان کی آرزوئیں مجھے بیتاب رکھنے لگیں۔ میں نے اپنے پروں کا جائزہ لیا۔ یہ بالِ جبریل سے مشابہ تھے۔ یہ پر مجھے اچھے نہیں لگے۔ لیکن رفتہ رفتہ عادت سی ہوگئی۔ ان پروں سے میری پریشانیوں اور الجھنوں میں اضافے پر اضافے ہوتے گئے ہیں۔ تو انھیں سمیٹ کر بیٹھ جاتا لیکن اندر کی دنیا میں تقاضائے پرواز اتنی شدت سے بازو کشا ہوا کہ میرا وجود ریزہ ریزہ ہوکر رہ گیا۔ عین اسی وقت شیطان میرا دل بہلانے آیا۔ وہ میرے درد کا درماں بن کر آیا۔ کاش میرا ارادہ آزاد ہوتا! کاش میں شیطاں کے فریب رنگ و بو کے دامنِ رنگین میں پناہ گزیں ہوسکتا! داغِ دل و زخمِ جگر کے لئے اس سے زیادہ خوشگوار اور کوئی مرہم شفا نہیں۔ خودی اور خدا تو زخم کو اور گہرا در دینا دیتے ہیں۔ مجھے حیات کے اس رستے ہوئے ناسور سے کوئی کسی طرح تو نجات دلاتا! اس کشاکش زندگی سے رستگاری دیتا! میں تو شیطان کو کبھی اپنا نہ سکا۔ فرشتے اور شیطان مجھے اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ اس رزم خیر و شر کا نشانہ تو میں ہوں۔ آہ! دل داغ داغ ہوگیا۔ جبریل اور شیطان مل کر مجھے ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہتے

ہیں۔ قاش، قاش، پاش، پاش، ریزہ، ریزہ۔ دونوں مل کر میری گردن ریتتے ہیں، سر قلم کرتے ہیں، سُولی پر چڑھاتے، دار پر کھینچتے، آرے سے چیرتے ہیں۔ مجھے مٹاتے اور برباد کرتے ہیں۔ اور ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ پریشان ہو کے میری خاک پھر دل بن جاتی ہے اور پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ شیطان اور فرشتہ کا تو ایک بیچ ہے، ایک حجاب ہے، میں جانتا ہوں مجھے خراد کر، تراش کر، کاٹ چھانٹ کر، کوٹ پیس کر، گوندھ گوندھ کر، تپا کر، پگھلا کر کون اپنے لئے کھلونے بناتا رہتا ہے۔ ایک زندہ وجود کو تخلیق کی بھٹی میں ڈالنا ستم ہے کہ کرم؟

ایک سفید روشنی محدب شیشے سے گذاری گئی۔ قوس قزح کے سات رنگ پیدا ہو گئے۔ میری روح کے بھی کھنڈ کھنڈ کر دیئے گئے۔ اور پھر "آواگون" کا چکر۔ ان گنت ٹکڑوں میں بٹ جانا اور ہر ٹکڑے کا صد ہزار قالب سے گذرنا۔ نقوش سے بھی رنگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آغاز داستان کی بات ہے کہ میں نے اگنی، اوت، انگرا، وایو اور نارد منی کے اندر سے جھانکا۔ ان دنوں مجھ پر گیان کی برکھا برستی تھی۔ سنسار میں بھی سُکھ چین تھا۔ پھر یوں ہوا کہ میری روح کا ایک ٹکڑا کہتے ہیں کہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ چند اور ٹکڑوں سے بھی لغزش ہوئی۔ ایک ٹکڑے کو لنگڑے آدمی کے قالب میں ڈال دیا گیا۔ ایک کو گونگا بننا پڑا۔ ایک فاحشہ عورت بنا۔ ایک سود خوار سرمایہ دار اور ایک شاہی دربار کا گیانی وسیاست داں۔ کرم کا پھل ملا۔ کئے کی سزا پائی۔ میں نے دکھ سب تو جھیل لئے۔ لیکن پاپ کی سزا پاپ، یہ روح کو چھیلنے والا انوکھا دکھ سہا نہیں جاتا تھا۔ بیسوا پن، سود خواری اور سیاسی دلالی کے جون میں میری روح کڑھتی، جلتی، سسکتی اور کراہتی رہی۔ سب سے بڑا غم تو یہ تھا کہ نیکیوں کی راہ بند تھی اور یزداں کا دروازہ تقدیر کی اٹل چٹان سے ڈھک دیا گیا تھا۔ میں آئندہ جون میں سانپ، بندر، سور، ریچھ اور غدار وطن بنا دیا گیا۔ جب میری انسانی روح کے ٹکڑوں نے پہلے پہل بہائم کے قالبوں میں آنکھیں کھولیں تو جاں سوز گھٹن کا احساس برسوں طاری رہا۔ میں بولنا چاہتا تھا، مگر زبان کی حرکت ایک پھنکار، ایک قلقاری، ایک چیخ، ایک ہنکار بن کر رہ جاتی تھی۔ خیالات اور جذبات مردہ روحوں کی طرح منڈلاتے تھے۔ مگر وہ واضح ہو سکتے تھے اور نہ اظہار ادھورا اظہار ہی ہو پاتا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا مگر رو نہیں سکتا تھا۔ ہنسنا چاہتا تھا تو نقلی ہنسی بھی نہیں نکلتی تھی۔ میری روح کے

ٹکڑوں کے اندر سخت جلن تھی ۔ میری ابتدائی فطرت حیوانو ںانہ ہیئت و سیرت سے ٹکراتی تھی ۔ اندرونی کش مکش سے روح تلملاتی رہی ۔ رفتہ رفتہ بہیمانہ ، حشراتی ، اور وحشیانہ فطرت غالب آ گئی ۔ غدار ملک و ملت کے قالب میں ایک سکون ضرور تھا ۔ یعنی داخلی کش مکش سے نجات ۔ ہاں کبھی کبھی اپنی خباثت و ذلالت کا احساس ہو جاتا تھا لیکن جس طرح پائخانہ کا کیڑا کلبلا کر بھی اسی غلاظت میں پڑا رینگتا رہتا ہے ، اسی طرح غداری میرا اوڑھنا بچھونا بن کر رہ گئی ۔ اور آنے والے ' جون ' میں میری روح کے اس ٹکڑے کو واقعی پائخانہ کے بلو کا قالب ہی ملا ۔ اور دوسرے ٹکڑے چمگادڑ ، چیرا ، جونک اور کھٹوہڑ کی جھاڑی بنا دیئے گئے ۔ اُفتادِ آدم ! زوالِ آدمی ! میری روح نے ایک دفعہ جونک کے اندر سے خون چوستے ہوئے سوچا ۔ کیا میں پھر نارد منی کے اندر سے جھانک کر شانتی کی برکھا برستی ہوئی دیکھ سکتی ہوں ۔ کیا ایک جونک نارد منی بن سکتی ہے ؟ کیا آواگون کا رُخ پلٹ سکتا ہے ؟ کیا یہ سلسلۂ تناسخ سارے جانداروں کو ، چمگادڑوں ، جونکوں اور کھٹوہڑ کی جھاڑیوں میں تبدیل کر کے رکھ دے گا ؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ روح نے ویدانت کا شیشہ لگا کر دیکھا ۔ ساری دنیا مایا نظر آئی ۔ کچھ نہ تھا ۔ صرف پرماتما تھا ۔ آتما نہ تھی ۔ یہ سب پرماتما کے ٹکڑے تھے ۔ ہمہ اوست ۔ جو چیز بھی وہ پرمیشور کا حصہ تھی اور جو پرمیشور نہ تھی ، وہ کچھ نہ تھی ۔ فلاطون کے قالب کے اندر بیٹھ کر روح نے سوچا کہ حقیقت ماورائی ہے اور یہ سنسار چھایا ہے ۔ مایا ہے ۔ صوفی کے اندر سے روح بولی اناالحق ! منصور اور سرمد کے قالب میں میرے اجزا بھی جذب و مستی لئے پھڑکتے رہے ۔ میں کبھی یہ بھی سمجھتا ہوں کہ میں خدا کا جزو ہوں ۔ اور ہر شئے میں خدا کے اجزا پاتا ہوں ۔ انا الحق ! ہمہ اوست ! میں حافظ ، جامی ، صائب ، ورڈسورتھ اور شا کے قالبوں میں بھی رہا ہوں ۔ میرے تجربوں کی انتہا نہیں ۔

اور ڈاروِن کے دماغ کے اندر بیٹھ کر میں نے سوچا ـــــ کچھ نہ تھا ۔ صرف پانی تھا ۔ ستاروں کی گردِ کارواں سطحِ آب پر پڑی ۔ آدم کا خمیر گوندھا گیا ۔ پروٹوپلازم پیدا ہوا ۔ شعاعوں اور لہروں نے اسے گود میں کھلایا ۔ ننھے سے قالب میں روح پڑ گئی ۔ میں اب سوئی کے ناکہ سے بھی ہزار گنا چھوٹے "امیبا" کے اندر سانس لے رہا تھا ۔ مجھ پر صدیاں گذر گئیں ۔ میں جیلی فش بن گیا ۔ پھر صدیاں

گذریں اور میں رہو مچھلی تھا۔ اور صدیاں گزرتی گئیں۔ میں باری باری مینڈک، گھڑیال، مگرمچھ بنتا رہا۔ صدیاں گذرتی رہیں۔ میں اژدہا بنا۔ پھر اُڑنے والا اژدر۔ پھر رُخ۔ پھر گدھ، عقاب، افریقی چمگادڑ۔ اور ایک بار گینڈا بن گیا۔ کبھی ہاتھی بنا، کبھی بھینس، کبھی گھوڑا، گاہ اونٹ، گاہ زراف، اور پھر میں چوہا اور گلہری بن گیا۔ قرنہا قرن بعد بندر بنا۔ پھر اس سلسلے میں قالب بدلتا رہا۔ چمپنزی، گوریلا اور بن مانس بن کر اُچکتا، پھُدکتا، لٹکتا پھرا۔ اور صدیاں گذرتی رہیں، گذرتی رہیں، یہاں تک کہ میں آدمی بن گیا اور آدمی بن کر بھی نچلا نہ بیٹھا۔ غار سے سفر کرتا ہوا "ہوائی قلعوں" میں اُڑا۔ یہ ہیں میرے قالب، میرے سنگ میل، پاتنجلی، پانینی، سقراط، ارسطو، ابن سینا، فارابی، ابن رشد، کانٹ، ہیگل، مارکس، آئنسٹائن، فرائڈ، برگسون اور رسل وغیرہ وغیرہ۔

میں بہت تھک گیا ہوں۔ ان گنت قرنوں کا بوجھ، بے شمار قالبوں کا وزن اور لاتعداد تجربوں کے بار کے نیچے دبا ہوا میں سسک رہا ہوں، دل زخمی ہے، دماغ مفلوج ہوا جاتا ہے، روح پھڑپھڑا رہی ہے، آہ کر رہی ہے۔ کراہ رہی ہے۔ اب میں کچھ سوچ نہیں سکتا۔ نہ جانے ارتقاء نے مجھے حشرات و وحوش سے آدمی بنایا ہے۔ یا تناسخ مجھے آدمی سے وحوش و حشرات میں بدلتا جاتا ہے۔ یہ کائنات نیچے سے اوپر اٹھ رہی ہے۔ یا اوپر سے نیچے گر رہی ہے؟ یا یہ سب ایک سطحی معاملہ ہے؟ یا تو سب پرماتما ہیں یا سب مایا؟ یا خدا! یا خدا! تو مجھے سزا دے رہا ہے یا خود جزو جزو ہو کر، اوتار لے کر سزا کے تجربے حاصل کر رہا ہے؟

—— اور میں نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ میں نے اپنے بھائی کو، اپنے آپ کو قتل کر دیا۔ سانپ کا زہر اب تک میرے بدن میں تھا۔ اور یہ روح میں نفوذ کر رہا تھا۔ میرے اندر ہی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور رہ رہ کے پھنکار اٹھتا تھا۔ میرا جسم صرف سانپ کی کینچلی ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں ہابیل تھا کہ قابیل؟

—— اور پھر ایک طوفان آیا۔ آسمان کا سینہ شق ہو گیا۔ اور زمین کا جگر چاک چاک۔ ہر طرف سے پانی کی دھاروں نے زیادہ تندی کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ پانی سے حیات ابھری تھی اور پانی کے گرداب میں موت کے بازو حیات کو جکڑ رہے تھے۔ میں پانی کے بھنور میں ڈوبا یا اپنی خودی کے گرداب میں گیا پتہ؟ مگر میری بسیط، عالم گیر روح کا ایک حصہ بچ گیا۔ وہ کشتیِ نوح کے سہارے بچ نکلا۔ اور پھر اسی سے ماجرائے حیات کی تعمیر ہونے لگی۔

—— دو ایک دور گذر جانے کے بعد یوں ہوا کہ آگ کا الاؤ جلایا گیا۔ بلند شعلوں

کی زبانیں برچھی کی انی کی طرح مجھ پر لپکنے لگیں۔ اور میں نے ہی یہ آگ لگائی تھی۔ یہ شعلے بھڑکائے تھے۔ اپنے آپ کو جلانے کے لیے۔ لیکن میں خود شکنی کے لیے بھی تو آزاد نہیں۔ خود آزاری تو میں نے کر لی، مگر میں خود کشی میں بری طرح ناکام ہوا۔ شعلے پھول بن گئے۔ چنگاریاں کلیوں میں بدل گئیں۔ اور پھر ایک عظیم الشان زلزلہ آیا۔ دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ شہروں پر پتھر پڑے۔ میرا جسم اور میری روح سفوف کی طرح پس گئی۔ خاک برباد بن گئی۔ پھر ایک لطیف و خفیف ذرۂ وجود نے سانس لی اور حیاتِ تازہ سے صحرا اور وادیاں معمور ہو گئیں۔ مگر قبل اس کے کہ ایسا ہو میری روح کے ایک جگر گوشے کو بہت ہی بڑی قربانی پیش کرنی پڑی۔ ذبحِ عظیم!

اور میں نے پھر خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ اور اب کے مجھے سانپ نے نگل لیا۔ اور یوں ہوا کہ پہاڑ روشنی سے بھر گئے۔ میری روح کے بے شمار اجزا نے میرے خلاف سر اٹھایا۔ اور وہ مجھ سے روگرداں ہو گئے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ سمندر دو حصوں میں بٹ گیا۔ یا میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ ڈوبا اور ایک سلامت نکل گیا۔ میں "غرقِ دریا" ہو کر بھی "رسوا" ہوا۔ ہزاروں سال بعد میرا جنازہ شاہانہ طور پر تو نہ اٹھا۔ لیکن ایک عجائب خانہ میں مجھے مزار کی جگہ مل گئی۔ اور ان اجزائے پریشاں کو جو سلامت نکل گئے تھے، سکینت ملی اور چالیس سال کی صحرا نوردی کے بعد ارضِ موعود بخشا گیا۔ لیکن سب کی ساری ساحل اور دشت پیمائی کی داستان اتنی سادہ نہ تھی۔ وہ تو افسانہ در افسانہ ہے۔

اور ہاں خوب یاد آیا۔ میں جمنا کے تیر میں پریم ناچ بھی ناچا۔ پریت بانسری بھی بجائی۔ میں حلقۂ رقص کا مرکز بھی تھا اور دائرہ بھی۔ اور پھر ایک مہایدھ ہوا۔ فوجیں صف آرا ہوئیں۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ اور آتما کے اندر سے ایک آواز اٹھی ——— روح غیر فانی ہے۔ زندگی نام ہے جہد و مقابلہ کا۔ بے عملی موت ہے۔ موت کی اور کوئی حقیقت نہیں۔ صداقت کے لیے جنگ تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے۔ آتما اپنی پاکی کے حصول کے لیے معرکۂ کارزار کی بھٹی سلگاتی ہے اور اس کی آنچ سے تپ کر، پگھل کر کھرے سونے کی طرح نکلتی ہے۔ کوئی کسی کو نہیں مارتا۔ کوئی کسی کو نہیں جلاتا۔

تلوار چلانے والی وہی ایک آتما ہے اور کٹنے والی چیز بدن ہے جو میل کی طرح چھٹ جاتی ہے۔ نہ کوئی حریف ہے، نہ کوئی حلیف۔ یہ سب ظاہری اعتبارات ہیں۔ میں ہی مارتا اور میں ہی جلاتا ہوں۔ میں واحد و یگانہ ہوں۔ میں ازلی، ابدی، اناوی اور سرشکتی مان ہوں۔ میں ست کا پالن کرتا ہوں۔ اور جب جب مایا کا، روپ اور بدن کا، مادّہ کا، جھوٹ کا زور ہوتا ہے، اَنیائے اور پاپ کی اندھیاری چھا جاتی ہے، تب تب میں اَوتار لیتا ہوں تاکہ ست کی چمکار دکھاؤں، نیکیوں اور فروتنی دکھانے والوں کی رکھشا کروں اور ظالموں کو ہلاک کر ڈالوں۔

——— اور پھر نٹ راج نے نئے نئے ناچ ناچے۔ بہت سی لیلائیں رچی گئیں۔ حُسن کی کرشمہ سازیاں ہوئیں، عشق نے داؤ چلائے۔ روح کی زلیخائی نے کسی کو قید و بند میں مبتلا کیا۔ آسمانوں پر فرشتے ہنستے رہے۔ ایک زندانی کے لئے ستاروں، چاند اور سورج نے سجدہ کیا۔ فرشتوں کے سجدۂ روزِ اوّل کی رسم دہرائی گئی۔ زلیخا کو اپنا محبوب ملا۔ اور محبوب کو تخت۔ لیکن سلومی کو اپنا محبوب نہ مل سکا۔ محبّت کی روح کے بطن سے نفرت کی جوالا مکھی پھوٹی اور سلومی نے یوحنّا کو پاکبازی کا صلہ دیا۔ سلومی نے یوحنّا کے بریدہ سر کو طشت پر رکھ کر محبت و نفرت کا ایک رقصِ آتشیں برپا کیا۔ کسی کو تخت کسی کو تختہ!

تب یہ دن ہوا کہ میں نے دُنیا کو تیاگ دیا۔ آتما کے نِروان کی تلاش میں۔ مجھے گیان کی روشنی ملی۔ اس نے مجھے یکسر بدل ڈالا۔ میں نے اپنے جذبات، خیالات اور ادراکات کے شعلوں کو ٹھنڈا کیا۔ روح نے جونوں کے چکّر سے، کرموں کے گت سے، بدن کے بوجھ سے مُکتی حاصل کرنے کا راز دریافت کر لیا۔ لیکن پھر آتما اپنی پَوِترتا کے دھیان میں اتنی محو ہوئی کہ پرماتما کو بھولنے لگی۔ جونوں کا چکر پھر شروع ہو گیا۔ لوبھ کا دھندا، مایا کی چھایا۔

——— اور اب ہوا کہ اب کے میں نے اپنی صلیب آپ اُٹھالی۔ کانٹوں کا تاج آپ ہی سر پر رکھ لیا۔ اور یہ طے کر لیا کہ سولی پر چڑھ جاؤں گا پر نفسِ امّارہ کے سرپھرے اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گذار کر چھوڑوں گا۔ کیونکہ خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کا یہی ایک

دروازہ ہے۔ اور جو فراخ دروازے میں داخل ہونا چاہتا ہے، اس کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔
مَیں مصلوب ہوا اور پھر جی اُٹھا۔ مَیں نے بالِ جبریل کی پھڑپھڑاہٹ سنی اور روح القدس کو کبوتر کی شکل میں
دیکھا۔ مَیں نے سولی پر چڑھنے سے پہلے گریہ و زاری کی اور مَیں نے آہ و بکا کے ساتھ پکارا — اے
روحِ اعظم! کیا تو نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟ پر اس نے مجھے تسلی دی اور مَیں تسلی پا گیا۔ پھر بھی ایک
کانٹا دل میں کھٹکتا رہا۔ سارے ابنائے آدم کو، میری روح کے سارے عناصر کو نجات نہ مل سکی۔
مَیں نے اُن عناصر کو بچانا چاہا۔ پر انھوں نے مجھ پر لعنت کی۔ ایک باغ تھا۔ اس کے مالک
نے باغ کا نظم چند باغبانوں کے سپرد کیا۔ باغبانوں نے کچھ عرصہ تک وقت پر مالک کو پھل دیا۔
لیکن پھر پھل دینا بند کر دیا۔ مالک ناراض ہوا اور اُس نے اپنے ملازموں کو بھیجا تاکہ باغبانوں سے
پھل حاصل کرے۔ مگر ایسا ہوا کہ باغبانوں نے مالک کے مرسل ملازموں کو مارا پیٹا اور پھل
دینے سے انکار کر دیا۔ تب مالک نے اپنے پلوٹھے بیٹے کو بھیجا تاکہ باغبانوں سے وقت پر پھل وصولے
لیکن بدذات باغبانوں نے مالک کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ مالک نہایت غضب ناک ہوا۔ اور
اس نے ارادہ کیا کہ وہ خود باغبانوں کو سزا دینے جائے گا۔ وہ آیا اور اس نے باغبانوں کو سزا
دی اور لعنت کی اور ان سے باغ چھین کر دوسرے مالیوں کو دے دیا جو وقت پر مالک کو
پھل دیں گے۔ وہ شعیر سے آیا اور فاران سے طلوع ہوا اور دس ہزار قدوسی اس کے ہم رکاب
تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت تھی۔ ایک چمکتا ہوا فانون، ایک شاندار نظام۔
روحِ آدم نے اپنا بلند ترین مقام حاصل کر لیا۔ خدا اور خودی اتنے قریب ہو گئے جیسے قابَ
قوسین۔ خودی کا ناز و پندار بالکل مٹ گیا تھا۔ وہ سراسر محبت و رحمت ہو گئی تھی۔ اور خدا
نے اپنا نازِ کبریائی فراموش کر دیا تھا۔ شیطان نے تاریخِ عالم میں پہلی دفعہ موت کا مزہ چکھا لیکن
قبل اس کے کہ داستان اپنے اس انجام کو پہنچے چراغِ روح سے شرارِ روح ستیزہ کار رہا۔ سراجِ
منیر پر مدتوں ظلمتوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر حملے کئے۔ میری داخلی دنیا میں جو گذری وہ خارجی سانحات
سے کہیں زیادہ خوں ریز تھی۔ کیا لو بھی میرے وجود کو نہیں جلاتی؟ یہ صحیح ہے کہ اب کے دفعہ
ابنِ آدم کو صرف ایک بار نہیں ساری عمر صلیب پر چڑھایا گیا۔ لیکن بنی آدم کے ان اعضا کا انجام
تو اچھا ہوا جو رنجور ہو کر بھی شفایاب ہو گئے۔ رونا تو ان اعضا پر ہے جو کاٹے گئے۔ بنی آدم

اعضائے یک دیگر اند - میری روح کو سب سے بڑی جراحت بھی اسی دور میں نصیب ہوئی جس میں اُسے سب سے بڑی رحمت نصیب ہوئی - اور اب وہ دور تا قیامت جاری رہے گا - دنیا کا عظیم ترین "الوہی رزمیہ" اس جلوۂ روح سے وابستہ تھا جس تجلّی کے لئے "نغمۂ داؤد" بیتاب اور شیام کی مُرلی بے چین رہی - جس مقام محمود کی سرشار محبت میں "غزل الغزلات" کی لے اُٹھی اور اورنگِ سلیماں کانپا اور آہ! روح کا سب سے عبرتناک "المیہ" اُس گھڑی وجود میں آیا جب "یوم فرقان" میں ایک مجروح صاحبِ پندار کی آخری متکبرانہ تمنا مرتے وقت بھی پوری نہ ہوئی - اس نے کہا "مَیں اعلیٰ و اجل ہوں - مَیں سردارِ عرب ہوں - مَیں فخرِ قوم ہوں - مَیں ابوالحکم ہوں - میں زندگی میں بھی مفتخر و سرآوردہ تھا اور موت میں بھی مکرّم و سربلند رہنا چاہتا ہوں - میری گردن شانے سے کاٹو" لیکن آتشِ حسرت اسے جلاتی ہی رہ گئی - اُس کی گردن تھوڑی سی کاٹی گئی - آگ! آگ! آگ!

——— اور یوں رُونما ہوا کہ آفتاب کے گرد نصف روشن اور نصف تاریک کُرۂ ارض گھومتا رہا - ہلال و قمر بھی رونما ہوتے رہے اور بدر کامل بھی طلوع ہوا - لیکن آج بھی مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ، پرانی دُنیا سے لے کر نئی دُنیا تک مَیں اپنی صلیب آپ اُٹھائے پھرتا ہوں -

آگ ہے ، اولادِ ابراہیم ہے ، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ہند و چین کی سبھتائیں رونما ہوئیں اور مٹ گئیں - ایران و عراق میں تمدن اُبھرے اور فنا ہو گئے - حبش اور جزائر میں تہذیبیں بار آور ہوئیں اور مُرجھا کر رہ گئیں - لیکن مَیں اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں دکھلاتا رہا - تخیل کی نئی دُنیا بساتا رہا - نغمگی و دوراں کے نقشے کھینچتا رہا - شعر کے بُت خانے بناتا رہا - کتابِ دل کی تفسیریں لکھتا رہا - خوابِ جوانی کی تعبیریں سوچتا رہا - عشق کی تصویریں کھینچتا رہا - دلوں پر تیر مارتا رہا - میری نوائے شوق سے حریمِ ذات میں شور بپا ہوتا رہا - میرے تخیلات میں حور و فرشتہ اسیر ہوتے رہے - کعبہ و سومنات میں رستخیز ہو گیا - اور ———

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود ٭ گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

میں نے ویاس اور والمیکی کا قلم پکڑ کر مہابھارت اور رامائن لکھوا دی۔ ہومر کے قالب کو الیاڈ اور اوڈیسی لکھنے پر مجبور کیا۔ ابن عربی کے بھیس میں فتوحاتِ مکیہ کو انجام تک پہنچایا۔ روح کا ابدی سفر اور اس کی معراج دیکھی۔ میں دانتے کی رگوں میں دوڑا اور اس کی آنکھوں سے ٹپکا۔ اُس کے آنسو کے ایک قطرہ سے جنت بنی اور دوسرے سے دوزخ۔ اور میں نے ان دونوں ہی مقامات میں ایک بڑا آئینہ خانہ دیکھا۔ ہر جگہ میں ہی جلوہ گر تھا۔ عذاب و انعام میں ہی پا رہا تھا۔ میں نے اپنے کو ہر جگہ پہچانا۔ عرفان اور شکستِ فریب کی سرحدیں اور اقلیم دونوں ملے ہوئے ہیں۔ مجھے ہر قالب میں نئے تجربات حاصل ہوتے رہے۔ گوئٹے کے مادی وجود میں سما کر میں نے فاؤسٹ کی ذات سے اپنے روحانی المیہ کی ایک تعبیر گڑھی۔ شیطان سے میں نے بیوپار کیا۔ علم، طاقت اور شباب خریدا اور اپنا ایمان بیچا۔ نفع اندوزی کی تجارت، سرمایہ وارانہ بیوپار میں ایمان بیچنا ہی پڑتا ہے۔ روح کی پاکیزگی فروخت کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر سود و سودا آتش و پیکار کے مترادف ہیں۔ آہ! میری روح! میری روح!

میں نے اوتھیلو بن کر اپنی محبت کا گلا گھونٹا۔ میکبتھ کے روپ میں اپنی وفاؤں کو قتل کیا۔ میں نے لیئر کے ہاتھوں اپنی شفقت کو زہر دیا اور ہیملٹ کے قالب میں آکر ان سب کا خمیازہ بھگتا۔ میں ظالم تقدیر کے وار سہتا اور تیر کھاتا رہا۔ مگر جرأت مقابلہ نہ کر سکا۔ تکمیلِ ارادہ کی کشاکش! الاماں! میرے وجود کو حقائق کے آرے نے دو حصوں میں چیر دیا۔ اور یہ حصے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ میری زخمی شخصیت اور گھائل ہوتی رہی۔ میں خانۂ مژگاں کو خونِ دل سے بھرتا رہا اور ایک عالم نے کہا: تمثیل کی گل طرازی ہو رہی ہے۔ اور تجربہ کی پختگی کے بعد میرا یہ احساس کتنا تلخ تھا کہ میں اسفل کیبنی بل بھی ہوں اور احسن پر وسپیرو بھی۔ نیم بہیمیت اور اور نیم وحشت سے میں قالب بدلتا ہوا اعلیٰ انسانیت تک پہنچا ہوں۔ مگر میرا سفر ختم نہیں ہے۔ اور ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ رجعت قہقری نہ کرنی پڑے۔ میری روح لرزتی رہتی ہے۔ میرے اندر دو ہستیاں ہیں، ڈاکٹر جیکیل اور مسٹر ہائیڈ۔ یہ ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ جب میں زرتشت تھا تو میں نے یوں کہا تھا "میرے اندر یزداں و اہرمن ہیں۔"

میں ابدیت کی تلاش میں شعلۂ عشق سے نہایا ہوں۔ حسن و عشق کی تکمیل کے لئے عورت کا وجود سب سے بہتر تمثیل ہے۔ عورت میری مثنیٰ ہے۔ اہرمن اور یزداں کی آنکھ مچولی سے نجات پانے کی دل کش ترین صورت ——— محبت میں ایک عورت کا ابدی انتظار ہے۔ اور میں مر مر کر اس لئے زندہ ہوتا رہتا ہوں کہ اپنے مثنیٰ کے آتش عشق کا ایندھن بنوں۔ محبت ابدی ہے۔ اور عورت ابدی ہے۔ ورنہ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔

——— اور میں نے اپنے محبوب کو ہر روپ میں، ہر رنگ میں، ہر آن میں، ہر ڈھنگ میں پہچانا ہے، اپنی جانِ جہاں کو، اپنی شمعِ آرزو کو، اپنی روحِ تمنا کو۔ یہ شمعِ آرزو مختلف فانوسوں میں جلتی اور بجھتی رہتی ہے اچانک کوئی قالب حسن و محبوبی کے انوار کے لئے بھک سے جل اٹھتا ہے۔ حسن و محبت کی ضیاء اس قالب کو محبوب ترین وجود بنا دیتی ہے۔ ہزاروں ارمان اس کے گرد طواف کرنے لگتے ہیں۔ اَن گنت حسرتیں پروانہ وار اس پر صدقے ہو جاتی ہیں۔ دل کے ٹکڑے اس پر قربان ہونے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ پھر اچانک وہ شمع بجھ جاتی ہے، فانوس سے روشنی سفر کر جاتی ہے۔ "محبوب ترین وجود" اپنے آشیانہ کے لئے کسی اور نشیمن کی تلاش کرتا ہے۔ نگاہ محبت منزلِ حسن کا سراغ لگا لیتی ہے، اور پھر ایک قالب انوار سماوی سے دمک اٹھتا ہے۔ مگر آہ! وہ قالب بے نور جس سے محبوبی سفر کر گئی! آہ وہ خاکستر جس میں ایک چنگاری بھی نہیں! جیسے ہیرا جل کر کوئلہ ہو جائے اور کوئلہ راکھ بن جائے۔

میں نے کیفکا کی چشمِ باطن سے اک "تغیر عظیم" کا مشاہدہ کیا۔ مادیت پرست، ظاہر بیں، سطح پسند دنیا کی بے دردیوں کو دیکھا۔ میں نے رومی اور سعدی کی آنکھوں سے بھی یہی کچھ دیکھا تھا۔ میری انسانیت کے ایک جزو نے دوسرے جزو کو نہ پہچانا۔ دوسرے جزو میں انسانیت تھی ہی نہیں، شیطنت تھی۔ ایک متنفس کی روح وہی ہو، دل و دماغ، جذبات و احساسات وہی ہوں، مگر جسم اور مادی وسائل بدل جائیں، تو پھر کم بیں، کور چشم دنیا اُسے بالکل غیر، قطعی بے احساس اور بے جان سمجھ کر اس سے آنکھیں چرانے لگتی ہے۔ میں نے پایا کہ کیفکا کا ہیرو "اسراول" نہیں بنا بلکہ دنیا والے پہلے چنگا ڑتے اور پھر ان کے دل و دماغ

پتھر بن گئے، بالکل پتھر ـــــ اور ان کی روح مرجھا کر نکہتِ گریزاں کی مانند انھیں چھوڑ گئی۔ وہ سب کے سب مشینی روبوٹ تھے۔ نفیس، وضع دار، مرقع۔ مگر ان کے اندر کی کھوکھلی اور تیرہ و تار سرنگ نائے میں سیاہ چمگادڑ پھڑپھڑا رہی تھی۔ بیسویں صدی کے تمام نہاد انسان، مہذب و متمدن ہونے کے باوجود، قطعی بے درد، بے حس، کٹھور، ظالم نکلے۔ آہ! مَیں کہ میری روح کا ایک جُز چمگادڑ بن جاتا ہے اور دوسرا جبریل!

اسرارِ ازل کے ایک واقف نے مجھ سے کہا کہ یہ تغیرِ عظیم، یہ انقلابات، یہ رد و بدل سب غدود کی وجہ سے ہیں۔ شہ رگ کے قریب بیٹھ کر وہ میرے خون میں غدود سے "ہورمونز" نچوڑ نا رہتا ہے۔ یہی "ہورمونز" کبھی زہر بن جاتے ہیں، کبھی تریاق۔ ہورمونز نے مارکس، فرائڈ، اور آئنسٹائن کو پیدا کیا۔ یہ تینوں بھی میرے نطفہ سے پیدا ہوئے۔ اور مَیں موسیٰ و ہارون نژاد بھی ہوں۔ اور سامری الاصل بھی۔ اور خداوند خدا نے کہا کہ ـــــ "مَیں تجھے برکت دوں گا اور تجھ پر لعنت بھی کروں گا۔ مَیں تجھے فرعون سے نجات دوں گا اور ارضِ مقدس میں بساؤں گا۔ پھر تو ذلیل بندر کی طرح ساری دنیا میں مارا مارا پھرے گا اور آخری زمانہ میں تو چہار دانگ عالم سے سمیٹ کر ارضِ پاک میں لایا جائے گا۔ مگر اس وقت تو ملعون ہوگا۔ تو اپنے بھائیوں پر، اسمٰعیل کی نسل پر ظلم ڈھائے گا۔ یہ اس لئے ہوگا کہ دنیا کو اپنی طاقت پر ناز ہے۔ اسرائیل کی سرزمین سے آگ بھڑکے گی۔ یاجوج و ماجوج جو دیو زاد ہیں ٹکرائیں گے اور آدم کی اولاد پر گندھک اور بڑے بڑے اولے پڑیں گے۔ اور سارا عالم میرے جلال کو دیکھ کر لرز اٹھے گا۔ سب تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے، روندے جائیں گے، از رو بھُس کی طرح مگر وہ جو نیک ہیں" ـــــ اور مَیں نے خداوند سے کہا کہ مَیں ہی بنو اسمٰعیل ہوں اور مَیں ہی بنی اسرائیل۔ کیا تو میرے ایک حصّہ کو مرحوم بنائے گا اور ایک کو ملعون؟

ـــــ مارکس یہودی کی روح میں سامری بھی تھا اور ہارون بھی۔ مارکس بھی میرے "تغیرِ عظیم" کی عجیب مثال ہے۔ یہ مرکبیتِ جدید زیادہ پیچیدہ، زیادہ مرکب، زیادہ تہ دار اور شاید زیادہ مخلص بھی ہے۔ مارکس نے فرعون کا مقابلہ کیا اور موسیٰ سے بھی منحرف ہو گیا۔

یہودیوں کی فطرت میں بغاوت ہے۔ اپنے پرائے سب سے۔ خدا اور شیطان دونوں سے۔
اور میں سامی النسل مارکس آریائی یاجوج و ماجوج کا پیغمبر بن گیا۔ لیکن یہ میرا اپنا تجربہ ہے کہ
آریائی قالب میں انا و استکبار ہے۔ خود پرستی اور آمریت ہے۔ مادہ بے خاصیت و ملکیت نہیں
ہوتا۔ مادہ میں بھی صفات ہوتی ہیں۔ تاثیر و تاثر دونوں۔ میں مادہ سے ڈرتا ہوں، لرزتا ہوں۔
میرے "تغیر عظیم" کی ذمہ داری بہت حد تک مادہ کے خواص پر منحصر ہے۔ بخدا مادہ معصوم نہیں۔
میں یوم میزان میں خدا کی ترازو پکڑ کر فریاد کروں گا۔ میری روح کی گنہ گاری کا بڑا حصہ دار مادہ
ہے۔ مادہ کی صفت مادیت ہے۔ اور آریائی قالب کے اندر جن چھپا ہوا تھا۔ آریائی قالب
میں مادیت، مادہ پرستی یعنی خود پرستی تھی۔ مظاہر پرستی شرک اور دہریت تھی۔ آریائی یاجوج و
ماجوج نے میری اشتمالیت، مساوات و جمہوریت کو بھی آمریت اور ریاستی سرمایہ داری میں
بدل دیا۔ خصوصاً جوج کے فرماں روائے، جو ماجوج میں سے ہے، روس، وٹنک اور تولبلک
کی سرداری حاصل کرکے، میری پیغمبری کے خلاف نبوت کی، میری روح اس کے آہنی شکنجے
میں پس رہی ہے۔ سعدی از دستِ خویشتن فریاد!

میں خارجیت، سطحیت اور مادیت سے گھبرا کر سیدھا لاشعور کی دنیا میں پناہ کے
لیے سیدھا پہنچا۔ یہ بھی اسرائیلیت کا انتہا پسندانہ دورہ تھا۔ عبرانی قالب زیادہ انتہا پسند ہوتے
ہیں اور یونانی متوازن، لیکن یہ اپنے توازن کو ہی پوجنے لگتے ہیں۔ عبرانی مزاج بت شکن ہوتا
ہے، اور گاہ خدا شکن بھی، یونانی مزاج اپنی وسعت و رواداری میں بہت سے خدا بنا لیتا ہے
سلامتی نہ یہاں ہے، نہ وہاں۔ اور لاشعور کی دنیا تو نہایت تاریک، وحشی، عفریتی تھی۔ لاشعور
کی سیادت تسلیم کرلینا اپنی ہفت ہزار سالہ زندگی کے ارتقاء کا انکار تھا۔ ادراک کی نفی
تھی۔ لطافتوں اور رفعتوں کا انکار تھا۔ یہ لاشعور بھی داخلی مادہ پرستی تھی۔ مادہ نے انیسویں
صدی عیسوی میں مجھ پر سخت غلبہ کیا اور آج تک میں مادیت کا شکار بنا ہوا ہوں۔

—— یہ تو بس غنیمت ہوا کہ ایک تیسرے اسرائیلی قالب کی بت شکنی نے میری
مدد کی۔ میں نے آئنسٹائن کے دماغ میں گھس کر پناہ لی۔ میں نے مکان و زمان کو ازل و ابد کے سامنے
ہیچ کر دکھایا۔ میں نے کائنات کی بے کرانی کو عبور کیا اور لامحدود کو محدود پایا اور ان گنت

کائناتوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔ کوئی شے مطلق نہ تھی۔ ہر شے اضافی تھی۔ یہ دریافت مارکس کی 'لا' سے زیادہ اہم 'لا' تھی۔ مگر سوئے 'الّا' سفر کرنے والی جدید طبیعات کے مشاہدہ و تجربہ سے مجھ پر قوتِ روحانیت کے دروازے کھلنے لگے۔ بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے میں نے یہ راز پا لیا کہ مادّہ غیر فانی نہیں۔ یہ فنا ہو سکتا ہے۔ ہر چند کہ ہنوز مادّہ میری روح پر غالب ہے تاہم میں نے اپنی فتح کا راز ڈھونڈ لیا ہے۔ لیکن میں مادّہ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی سیادت مٹانی چاہتا ہوں اور مادّہ مجھے فنا کرنے کے درپے ہے۔ خواہ خود غارت شکنی کے ذریعہ سے ہی کیوں نہ ہو۔

——— میں چاہتا ہوں کہ ایک دفعہ میں اپنے سب 'جونوں' کے دماغ سے اکٹھا کام لوں۔ اپنے سارے قالبوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھوں اور فلاح کی راہ کی جستجو کروں۔ آریائی دماغ اور سامی دماغ، عبرانی مزاج اور یونانی مزاج، منگول اور حبشی طبیعتوں کا ایک شاندار مرکب بناؤں اور اپنے نطفے اور بطن سے ایک نئے آدم کو جنم دوں۔ میں اپنے ابنا، اپنے جگر گوشوں میں مفاہمت کرانی چاہتا ہوں۔ کلّی مفاہمت۔ کپل، گوتم، منو، میکیاویلی، مِل، مارکس، فرائیڈ، ہیگل، کانٹ، برگسوں، آئنسٹائن، برٹرنڈ رسل، گاندھی، ابن رشد، سینا، فارابی، رومی، ابن عربی، غزالی اور ولی اللہ دہلوی کے درمیان۔ میں ایک دارالسلام کی تعمیر کے لئے بے چین ہوں۔ جیتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں۔

میری زندگی مضحکہ خیز بھی ہے۔ اس کے اَنمل بے جوڑپن پر ہنسی آتی ہے۔ بڑی بڑی باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھ جاتا ہوں۔ اور یہ معمولی باتیں مضحکانہ طور پر آفاقی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں میں بھی کیسا نادان ہوں!

——— ایک گداز، سانولا، بڑی بڑی آنکھوں والا قالب تھا۔ بھرے بھرے سینے، گٹھیلے بازو۔ لیکن ایک آنکھ دوسری آنکھ سے قدرے چھوٹی تھی۔ اور بایاں سینہ بھرپور ہونے کے باوجود نیچے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس قالب کو دوسرے قالب نرس فیبی کہتے تھے۔ ایک دوسرا قالب تھا۔ نرس مارتھا کا۔ لانبا، بے گوشت، ہڈیوں کی مالا، پلے ڈھنگا۔ اس کی پسلیوں پر سینے نہیں اُبھرے تھے۔ ادھورے خاکے سے اُبھرتے ہوئے تھے اور بس ——— عورتوں کے

ماہوار سوز و گداز سے بھی مارتھا آزاد تھی۔ اس کی حرکتیں، عادتیں، تمنائیں اور خیالات بھی مردوں جیسے تھے۔ وہ فیبی کے عاشقوں میں سے تھی۔ اور اس میں اتنا شدید جذبۂ رقابت تھا کہ وہ اکثر اپنی محبوب کے گرد عاشقوں سے کامیابی کے ساتھ لڑ لیتی تھی۔ فیبی پر اس کو بہت حد تک اجارہ داری کے حقوق حاصل ہو گئے تھے اور فیبی بھی اس کے ساتھ ناز و انداز محبوبی ادا اور قربانی رہتی تھی۔ اور اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سپردگی کا عالم طاری ہے۔

دو سال تک پذیرائی اور سپردگی کے یہ کھیل مارتھا اور فیبی کے درمیان کھیلے جاتے رہے۔ اور پھر اچانک مارتھا عورت کی خونابہ فشانیوں میں غرق ہو گئی۔ اُسے اس حادثہ سے سخت غصہ آیا۔ اس نے اس کی روک تھام کرانی چاہی۔ مگر ڈاکٹروں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ وہ کہتے ایام گل شروع ہوئے ہیں۔ مارتھا رو دھو کر چپ ہو رہی۔ کسی نہ کسی رنگ میں جوئے خون ابن آدم کے سر سے گذرتا ہی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ اس کی پسلیوں پر کے خاکے اُبھرنے لگے اور اُبھرتے اُبھرتے اچھے خاصے گول گول سے ہو گئے۔ اس کے کولھوں سے گوشت کی تہیں لپٹنے لگیں۔ اضافی طور پر اس کی کمر پتلی اور نازک نظر آنے لگی۔ ارتقا ایک "تغیر عظیم" سے گذر گئی —— تیس سال کی عمر میں تبدیلی جنس ہو رہی تھی —— اس کے خیالات، تمنائیں، عادتیں اور حرکتیں بھی بدل گئیں، وہ فیبی سے چھپ چھپ عشق کرنے والے مردوں سے عشق لڑانے لگی۔ محبوب رقیب بن چکا تھا۔ فیبی کا دل عجیب پیچیدہ طور پر ٹوٹا۔ مارتھا اس سے بھوکی شیرنی کی طرح لڑنے جھگڑنے لگی۔ فیبی روتے روتے دُبلی ہوتی گئی۔ اور اس کا دوسرا سینہ بھی ڈھلک گیا۔ اب یہ "ہورمونز" کا کرشمہ تھا یا لاشعور کا؟ طبیعات کا یا نفسیات کا؟ تاریخی مادیت کا یا مابعد الطبیعات کا، ارتقا کا، انقلاب کا، یا مثامورنوسس کا؟ یہ چھوٹی سی معمولی بات بھی عقدۂ لاینحل بن کر رہ گئی۔

مجھے ایک روز، کایا کلپ، یا یوں کہیے کہ کایا پلٹ کا تجربہ ہوا۔ وہ عنفوان شباب میں صوفیانہ مادرائیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ لیکن جب ایک لڑکی نے اس سے محبت کرنی شروع کی تو اس کی فلاطونی رفتہ رفتہ کیچلی کی طرح اُتر گئی۔ لیکن وہ ابیقوریت میں مبتلا نہ ہوا۔ ارسطوئی اسے بھائی۔ حور سے اتر کر ایک لڑکی پر آرہا۔ اور پھر اس لڑکی کو اپنی مثالیت کے ذریعہ

اونچی بلندیوں پر لے گیا۔ لڑکی نے اسے آسمان سے زمین پر اُتارا اور وہ اسے ساتھ لے کر آسمان کی طرف لوٹا۔ لیکن جلد ہی زمین کی کشش نے پھر دونوں کو اپنی سطح پر کھینچ لیا۔ اور کچھ دنوں بعد اس کرۂ ارض سے ایک اور سیارہ ٹکرایا۔ اس سے ایک دوسری حور شمائل لڑکی اُتری۔ اس نے بڑے سوز و ساز سے نوجوان سے اظہارِ محبت کیا۔ نوجوان کے دل کی کایا پلٹ گئی۔ محبتِ اوّلین کے پھول مرجھانے لگے۔ گُلِ تازہ کی نکہت نے مدہوشی طاری کردی۔ مگر مُرجھائے پھول عطر بن کر نوجوان کی روح میں جذب ہوگئے۔ ایک عجیب کشاکش شروع ہوئی اور اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک کرۂ ارض کا وہ خطّہ جہاں پر سیّارہ ٹکرایا تھا، ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوگیا۔ وہ اب تک مجبور بنتا رہا۔ حبیب بننے کی جبلت تشنہ تھی۔ دل میں ایک بار پھر تغیرِ عظیم برپا تھا۔ محبت کا آواگون۔ اس احساس کے باوجود کہ —— وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں! —— افقِ آرزو پر ایک نیا ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔

۴

.... نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

خودی کا تعلق صرف بقائے ذات سے ہے اور خدا کا بقائے کائنات سے۔ مگر جنس کا تعلق بقائے نسل سے ہے۔ میرے اندر خودی بھی ہے جنس بھی اور خدا بھی۔ نیز ایک چوتھی جبلت میرے اندر کارفرما ہے، فنا کی جبلت، تمنائے مرگ۔ اگر ہماری ساری خواہشات، اعمال اور خواب و خیال کا تجزیۂ نفس کیا جائے تو اربع عناصرِ نفسی میں انھیں بانٹا جا سکتا ہے۔ ان کے ماورا کچھ بھی نہیں۔ میں اکثر اپنے نہ ہونے کی تمنا کرتا رہتا ہوں۔ میں گا ہے گا ہے نہایت خلوص کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر اقدامِ خودکشی و خود شکنی کرتا ہوں۔ موت کے تجربات میں مجھے اسی طرح لذت ملتی ہے جیسے خودی، جنس اور خدا کے تجربوں میں۔ اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ میری یہ چاروں جبلتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ اور اسی چار دیواری میں میری روح پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ یہ جبلتیں ایک دوسرے کا ردِّ عمل بنتی رہتی ہیں۔

تہذیب حاضر خودکشی کر رہی ہے۔ میں ہونے سے تنگ آ گیا ہوں۔ لیکن کیا یہ ممت
اتنی سادہ اور سچی ہے؟

۱۸۔۱۹۱۴ء تک میں نے ڈھائی کروڑ نفوس کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ ۴۵۔۱۹۳۹ء
تک میں نے ساڑھے چار کروڑ آدمیوں کو، اپنے اجزا کو، اپنے جگر گوشوں کو ذبح کر دیا، گولی مار دی،
جلا دیا۔ اور اس کے بعد بھی یہ جوئے خون جاری ہے۔ میں آہستہ آہستہ اپنی رگیں کاٹ رہا ہوں۔ خون
بہتا جاتا ہے۔ میں دھیرے دھیرے خودکشی کر رہا ہوں۔ اپنے دل و جگر میں خنجر مار رہا ہوں۔

اگر شیطان، جبریئل سے نہیں، ——— مجھ سے پوچھتا تو میں بتاتا کہ،
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

فرشتے اور شیطان تو تماشہ دیکھتے رہے۔ صرف آدم کا قصہ ہی نہیں بلکہ کائنات کا مقصد
بھی آدم کے خون سے ہی رنگین ہوا۔

اب کے شیطان نے مجھ پر عظیم الشان حملہ کیا۔ اُسے مجھ سے ناحق کی دشمنی ہے۔ اُس نے
اب کے پیغمبروں کا بھیس بدلا۔ شیطان مجھے دھوکا دے رہا تھا۔ جنت میں وہ سانپ کے روپ
میں حملہ آور ہوا تھا۔ اور اب کے انسانِ مقدس کے روپ میں۔ اب کے حسد نے اسے یہ سکھایا کہ
وہ بھی انسانِ کامل بن سکتا ہے۔ وہ کیچلیاں بدلتا رہا۔ لیکن اس نے شہ پر جبریل کی پھڑپھڑاہٹ کبھی نہ
سنی۔ جب اسے یہ دردناک تجربہ ہوا کہ وہ "انسانِ کامل" کا بھیس بھی نہیں بدل سکتا، تو پھر شیطان
سپیرا بن گیا۔ اور اپنی ذرّیات کو بین کے نغمے سنانے لگا۔ اس کا زہر بڑھ رہا تھا۔ اور اس کی
ذرّیات کا بس بھی۔ یہ مجھ پر حملہ کی تیاریاں تھیں۔ مہلک ترین حملہ۔ آخر سانپ اور سنپولوں
نے حملہ کر دیا۔ اور ایک سانپ نے سپیرے کو بھی ڈس لیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ دو اژدہا پیکر بچھو آمنے سامنے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو
خوفناک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ بڑے بچھو کے منہ سے آگ کی جوالا پھوٹی اور چھوٹے کو جلانے
لگی۔ پھر چھوٹے بچھو کے منہ سے بھی آگ کا فوارہ پھوٹا اور بڑے کو جلانے لگا۔ بڑا بچھو جوشِ غضب
میں چھوٹے پر چڑھ دوڑا اور اسے کچلنے لگا۔ لیکن چھوٹے نے بڑے کو ڈس مارا۔ اور ایک نئے پیکار

آتشیں کی ابتدا ہوئی۔ بڑے بڑے شہر اور دیہات شعلوں میں بھسم ہو رہے تھے۔

پھر میں نے دیکھا کہ میں اس جنگ و پیکار سے بچ کر جنت میں آگیا ہوں۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو پایا کہ میرے اور جنت کے درمیان ایک بہت بڑا تاریک و ذخار سمندر سانپ کی طرح لہریں مار رہا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ایک عظیم الجثہ پھنکارتا ہوا اژدہا نازل ہوا۔ اس نے نیلا گنبد پر اپنا پھن مارا اور اسے ڈس لیا۔ اژدہے نے امرت نگر کو بس نگر بنا دیا۔ اور نیلا گنبد زہر کے اثر سے نیلا ہو گیا۔ اژدہا بپھرا ہوا دوسری طرف بل کھا کر مڑا۔ اور ایک گونجتے گرجتے ہوئے شہر کے رہنے والوں کو تیزی سے نگلنے لگا۔ اس کی پھنکار سے آبادیوں اور مسکنوں میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔

پھر اس نے شہ رگوں پر اپنے زہریلے دانت تیز کئے اور خون پینے لگا۔ اس نے شیر در سینوں سے دودھ پیا اور پستانوں کو کاٹ لیا۔ پھر وہ ہرے بھرے کوکھ چاٹنے لگا۔ جسموں کو عریاں کر کے ان میں زہر بھر دیا۔ پھر وہ عورتوں کے ننگے جلوسوں اور بچوں کی چچوڑی ہوئی ہڈیوں پر، اپنے بس کے نشہ میں لہراتا ہوا ایک بلند مینار پر چڑھ گیا اور اسے اپنی لپیٹ میں لے کر کڑکڑانے لگا۔

اور میں نے دیکھا کہ اس کرۂ ارض کے گرد ایک شیطان کی آنت کی طرح کا اژدہا لپٹا ہوا ہے اور دنیا اس کے شکنجے میں تڑپ رہی ہے۔ زلزلے کے جھٹکے پے بہ پے آ رہے ہیں۔ میں نے ایک طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ یک چشم دیوزاد دجال صلیب اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں دوزخ ہے اور دوسرے میں جنت۔ وہ کسی کو جنت میں رکھتا ہے اور کسی کو دوزخ میں ڈال دیتا ہے۔ وہ طاقت و جبروت کے نشہ میں چور ہے۔ وہ شہروں کو اپنی دوزخی منٹھی کھولتے ہی بھک سے اڑا کر آیا تھا۔ وہ اپنی خدائی کا اعلان عام کر رہا تھا کہ دوسری جانب سے عفریت اعظم آزاد پر دمیقیوس ایک بپھرے ہوئے خنزیر پر سوار موجود و لاموجود سب کا انکار کرتا ہوا، دجال سے ٹکرانے کے لئے بڑھا۔ ایک ہولناک تصادم ہوا اور دنیا میں حشر برپا ہو گیا۔ ذرات کی طاقت سے ستارے پاش پاش ہو رہے تھے۔ کرۂ ارض روئی کی طرح دھنک دیا گیا۔ پھر میں نے شہپر جبریل کی پھڑپھڑاہٹ سنی اور ایک "ید بیضا" کو بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کی ضیاء سے دجال اور خنزیر بر سوار عفریت دونوں پگھل کر فنا ہونے لگے۔ خوشی کی شدت نے اس لرزہ خیز خواب سے

مجھے جگا دیا ——— الأمان و الحمد۔!

مَیں اپنے خوابوں کا نفسی تجزیہ و تحلیل کرنے لگا۔ کیا یہ دجّال اور آزاد پر ومیتھیوس، یہ اژدہے، سانپ اور آتشیں بچھو خود میرے نفس سے نہیں نکلے ؟ کیا ارتقا صرف کینچلیاں بدلنے کا نام ہے ؟ اور مَیں سانپ کا سانپ ہی رہا؟ کیا "یدِ بیضا" بھی میرے اندر ہے ؟ کیا مَیں نے اپنی روح کے ایک گوشے کو شیطان کے تصرّف سے بچا لیا ہے ؟ کیا مجھے جبریل کے پر پرواز بھی عطا ہوں گے ؟ یا مَیں اس سے محرومی کے غم میں خودکشی کر لوں گا ؟ اگر مجھے جوہرِ روح نہ ملا تو مَیں مادّہ کی جوہر شکنی کر کے خدا کی کائنات کو فنا کر دوں گا اور خود بھی فنا ہو جاؤں گا۔

زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ؟

--- ۞ ---

"کینچلیاں اور بالِ جبریل"

دسمبر ۱۹۵۹ء

انارکلی اور بھول بھلیّاں

اس نے ایک خواب دیکھا — رات وہ بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ رسالے کا چھوٹا سا دفتر۔ بس ایک کوٹھری۔ اس میں ایک دروازہ جو بڑے بے ربط سے ہال میں کھلتا تھا اور ایک دریچہ سی گلی کا ایک حصّہ دکھائی دیتا تھا۔ گلی کی اُس جانب چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی ایک بے حس، بیگانہ سی دیوار، ماضی کی منجمد رسموں سے پابہ گل تو ہّمات کی طرح کھڑی ہوئی، کھلے آسمان کے نظارہ کو روکتی تھی۔ بے ربط سا ہال، بس ایک اونچا سا شیڈ تھا۔ یہاں آہنی پریس گھڑ گھڑ اتا رہتا تھا۔ چرخی چلتی تھی۔ تسمے گھومتے تھے۔ دندانے وصل ہو ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ دستے تختیوں کو لئے ہوئے قیام، رکوع، اور سجدہ کئے جاتے تھے، اور سفید کاغذ کے سینے گنجینے بن جاتے۔ صفحات پر سطریں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سویرے سویرے سائرن بجنے کے بعد میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے مزدوروں کی قطاریں فیکٹری میں جا رہی ہوں۔ پریس گھڑ گھڑاتا رہتا۔ اس کے دماغ دوز شور سے اُکتا کر وہ گلی میں دیکھنے لگتا۔ وہاں بھی موٹی عورتیں، دُبلی لڑکیاں، گندے مرد، محلے کے لڑکے ملکے پر لڑائی دنگا کرتے رہتے۔ خوانچے والے سودے کے اعلان کو کان میں ٹھونستے ہوئے گذرتے جاتے۔ اس کی میز دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ اس پر روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار، اخبارات، رسالے، مصوّر و غیر مصوّر جریدے ڈھیر کے ڈھیر پڑے رہتے اور معمولی سے قلم دوات، بالکل معمولی۔ اسے کتنی آرزو تھی کہ ایک سلیقے کی میز ہوتی۔ میز پوش، گلدان، گھڑی، قاعدے کا قلمدان، ایک اچھا سا بک شیلف — وہ حُسنِ مذاق رکھنے والا ادیب تھا، مگر ملازم۔ مطبع اور دو رسالوں کا پروپرائٹر اس بات کا قائل تھا کہ کم سے کم دانہ گھاس پر ایک ادنیٰ سے اصطبل میں رکھ کر گھوڑے کو زیادہ سے زیادہ دوڑایا

جائے۔ گھوڑے کا وہ مالک تو نہ تھا، کرائے کا گھوڑا، بھاڑے کا ٹٹو، یہ گیا، وہ آیا، سب گھوڑے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ اور گھوڑے بہت ہیں۔ کرایہ کا ادیب، اور بھاڑے کا ٹٹو۔ ادیب بہت ہیں۔

غرض دریچہ اس کے داہنے کان کے بالکل متصل تھا اور گلی کی ہانک پکار اس کے کان میں یوں داخل ہوتی تھی جیسے وہ لاؤڈ اسپیکر کا بمبا ہو ——— "سر دے ہیں جی پتا ؤ اردے سر دے!" "دودھ بکری دا!" "لوہے والا! بوم بی والا!" اور کوئی شوخ چشم رمّال تو بس اس کے کان سے لگ کر زور سے کہتا ——— "بائی جی! تہاڈی تقدیری گتھیاں سلجھاواں۔ ہاتھ دکھلاؤ! زائچہ بنواؤ! بیٹھک جو چاہو پوچھ لو!"

وہ چونک پڑتا ۔ اس کا جی چاہتا کہ رمّال کا سر سامنے کی بے حس دیوار سے ٹکرا دے۔ مگر ہوتا یہ کہ دیوار خود اسی سے ٹکراتی رہتی۔ گلی کی الجھن سے تھک کر وہ اپنی میز پر رکھے ہوئے مسودوں کو اُلٹتا پلٹتا، کچھ لکھنے لگتا۔ لکھتا جاتا۔ یک بیک پریس کی گھڑگھڑاہٹ زبان اختیار کر لیتی، پچو کے لگانے والی زبان۔ اس کا مضمون چھپتا ہے اور پھر ناقدین کی کند چھری۔ اسے ناقدوں کی کیا پرواہ ہوتی ۔ وہ ان کے پورے قبیلے کو پریس کے شکنجے میں پچومر بنا کر رکھ دیتا، اور اسے اتنی بھی حس نہ ہوتی جتنی سگریٹ یا دیا سلائی کے خالی ڈبے کے کچل جانے سے ہوتی ہے۔ مگر ناقدین کی آواز پروپرائٹر کے کان میں سیدھی گھسی چلی جاتی ہے۔ اور عرض و نیاز کا اثر قبول نہ کرنے والی طبیعت یوں اثر پذیر ہوتی ہے جیسے بٹن دبانے سے الیکٹرک مشین پریس کا رولر۔ معاذ اللہ! تخفیف مشاہرہ کی دھمکی اور برطرفی کے قاتل اشارات۔ تو پریس کی گھڑگھڑاہٹ اسے ناقدوں کی جاں گسل آواز معلوم ہوتی۔ وہ مُڑ کر نفرت سے شیڈ کے اندر بھاری بھرکم پریس پلانٹ کو دیکھتا اور پھر خوف و نفرت کے ملے جُلے جذبے کے ساتھ آنکھیں پھیر لیتا۔ پریس مین، کمپوزیٹر اور دوسرے عمال اسے فراعنہ کے ان حبشی غلاموں کی طرح دکھائی دیتے، جن سے جلّادی کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ پھر لکھنے لگتا۔ اسے کیا کیا نہیں لکھنا پڑتا تھا۔ اداریے، افسانے، نظمیں، علمی مضامین، پروف دیکھنا بھی اس کے سپرد تھا اور پریس کے انتظامات بھی۔ لکھتے لکھتے وہ سوچنے لگتا کہ پریس اور رسالوں کا عملہ رومی غلاموں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آپس میں لڑ لڑ کر مر

جایا کرتے تھے۔ اسے پریس مین، کامپوزیٹر اور اپنے پر رحم آنے لگتا۔ اس کی نظریں کوٹھری کے ایک گوشے میں پڑی ہوئی آرام کرسی کی طرف اُٹھ جاتیں جس پر فربہ جسیم پروپرائٹر روزانہ ایک دو گھنٹے آکر بیٹھا کرتا تھا، اور ترقی کے خواب دیکھتا رہتا۔

رات وہ اسی دفتر میں بیٹھا بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ دو رسالوں کا سالنامہ سر پر تھا۔ ماہوار اور ہفتہ وار جریدوں کی ساری ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر تھی۔ اسے اسی طرح اور کئی بے خواب راتیں گذارنی تھیں۔ گذشتہ رات کو اس نے ایک خواب دیکھا۔

اس نے دیکھا۔ انارکلی بازار سجا ہوا ہے، اپنی ساری پُرکاریوں اور رنگینیوں کے ساتھ، اپنی رنگ برنگ اور بھرپور دکانوں کو لئے ہوئے، آمد و رفت، خرید و فروخت، اکل و شرب، نمائشیں اور حسرتیں، زندگی کی حرارت، روانی اور تنوع کو پیش کر رہی تھیں۔ خواب کی دنیا عجیب ہوتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ انارکلی سے ملحق لیکن اس کی سطح سے بلند مال روڈ اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انارکلی زمین ہے اور مال روڈ اس کا زریں آسمان، انارکلی اور مال کے گرد اونچی اونچی آہنی دیواریں حائل ہیں۔ آہنی مگر شفاف۔ وہ باہر کھڑا کھڑا سارا منظر دیکھ رہا ہے، ان دیواروں سے پرے چھوٹی چھوٹی پُرپیچ گلیاں ہیں اور اندھے راستے۔ یہ اُلجھی ہوئی گلیاں سب کی سب انارکلی کی طرف جانے کی سعی کر رہی ہیں۔ مگر گتھم گتھا کر بھول بھلیاں بن گئی ہیں۔ خواب ہی میں اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ تنگ پتلی گلیاں اس کی گردن میں پھندا بن کر لپٹی جاتی ہیں۔ وہ بے تحاشا انارکلی کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر آہنی دیواروں سے ٹکرا کر گر پڑتا ہے۔ مال کی بلندیوں سے کچھ لوگ اسے گرتے دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اس دلدوز قہقہے کی نشتریت سے بوکھلا کر وہ جاگ اُٹھا۔

یہ تھا اس کا خواب۔ دن بھر وہ خواب کی گرانی محسوس کرتا رہا۔ وہ اس غیر مرئی بوجھ کو پھینک دینا چاہتا تھا۔ تاکہ سالناموں کی اشاعت کے انتظامات میں منہمک ہو جائے۔ مگر خواب بھوت کی طرح سوار رہا۔ آج حالات اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہے تھے۔

وہ بس ایک ادیب ہو کر رہ گیا تھا۔ کالج میں تعلیم حاصل کرتے وقت ادب تو محض اس کی خوب صورت نامی جیسا تھا۔ وہ ذوقِ ادب کے اعلان سے اپنی نوجوان شخصیت کی

آرائش کا کام لیتا تھا ورنہ اس کی تمنائیں تو آئی سی ، ایس کے ملاءِ اعلیٰ پر جا پہنچی تھیں۔ حکومت کے کنگرے کو تخیل سے مس کرنا کالج کی طویل خوش خرام زندگی کے لئے پٹرول ہوتا ہے۔ زندگی کے ٹھوس مطالبات آرزوؤں کے نقطہ احتراق پر پہنچ کر گیس بن جاتے ہیں اور تصورات کی ٹنکی پھلنے لگتی ہے۔ پرواز خیال کے آگے ہر پکیتن اور اسپیٹ فائر کی رفتار مات۔ مگر نشہ کے آثار کے وقت صرف ڈپٹی مجسٹریٹی نظر آتی ہے اور اس سے بھی نیچے اتر کر تحصیلداری۔ غرض وہ ادیب یوں بن کر رہ گیا جیسے کسی ہوا باز کو "فورسڈ لینڈنگ" کرنا پڑے اور وہ بھی کسی بیگانہ سے جزیرے میں۔

بہر کیف فی الحال وہ ایک ادیب تھا اس کا ایک نام بھی تھا اور اس کی ایک خاص صورت شکل بھی تھی۔ مگر صورت شکل اور نام تو اس وقت منفرد مشخص ہوتے ہیں جب کوئی کامیاب حیات ہو جائے اور وہ تو اس منزل کی مخالف جانب پھسلتا جا رہا تھا وہ خلقت کے ہجوم میں ایک سپاٹ سا فرد تھا۔ لاکھوں لاکھ افراد کی طرح ایک فرد تھا۔ وہ زندگی کی چپٹی سطح پر ایک رینگتا ہوا ادیب تھا۔ محض ایک ادیب۔

وہ صبح سے شام تک رسالے کے دفتر میں بیٹھا ہوا ادیب کا چرخہ چلاتا رہتا تھا، نو بجے صبح سے لے کر ۶ بجے شام تک۔ دوپہر کا کھانا وہ دفتر کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا کھا لیتا تھا۔ کسی چائے خانہ در بغل پھیری والے سے چند سوکھے ہوئے بسکٹ اور ایسی چائے جس کا رشتہ کھیتے کے رقیق گھول سے زیادہ قریبی ہوتا ہے وہ قہر درویش کے طور پر خرید لیا کرتا تھا۔ اور اب تو وہ ایسی چیزوں کو سانس کی سی یکسانیت کے ساتھ پی جاتا تھا۔ اس نے دفتر سے قریب کہنہ و فرسودہ شہر کی بوڑھی فصیلوں کے آغوش میں ایک معمولی سی کوٹھری کرایہ پر لے لی تھی۔ اس میں بھی شرکت تھی۔ دنیا میں کوئی چیز اس کی اپنی نہ تھی۔ گاؤں میں رہنے والے باپ ماں کی تنگ دامانی و تنگدستی کے کسی گوشے میں اتنی وسعت کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ اسے اپنی خاص ایک دنیا سمجھتا۔ وہاں بھی اس کے بھائی بہن شریک تھے۔ گاؤں کا مکان بھی جدی مکان تھا اور یہاں اجنبی شہر میں اسے ایک چھوٹی سی تنگ کوٹھری میں بھی شرکت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اس کی اپنی ذات بھی تو اپنی نہ تھی۔ اس کے سارے اوقات، ساری مشغولیت پر رسالے کا دفتر چھایا ہوا تھا۔ وہ کنوارا تھا۔ وہ دنیا کی کسی ہستی کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ٹوپیوں کی دکان کا ایک ملازم دست فروش اس کے ساتھ رہتا تھا۔ بس رات کے چند اندھے گھنٹوں اور صبح کی چند عاجلانہ ساعتوں کا شریک۔ وہ دونوں اس طرح ملتے تھے

جیسے دو ماہانہ ٹکٹ رکھنے والے مسافر کسی ویٹنگ روم کو استعمال کرتے ہیں۔

اس کی چھوٹی سی کوٹھری میں سورج کی زریں کرنیں کبھی نہیں جھانکتی تھیں۔ پیاری پیاری نازک کرنیں اور رچی ہوئی سنہری دھوپ معمولی سی جھونپڑی میں بھی جان ڈال دیتی ہیں۔ ادیب کو اس بات کا احساس کہاں ہو سکتا تھا مگر جب وہ سوکھے بسکٹ کھاتے کھاتے اور کام کے بوجھ سے دبتے دبتے بیمار پڑجاتا تھا تو اسے کوٹھری میں دن بھر رہنا پڑتا۔ اس وقت اسے اس بات کا تلخ احساس ہوتا کہ اس کوٹھری میں فطرت کے ہلکے سے ہلکے تبسم کی بھی جگہ نہ تھی۔ وہاں ادھر اُدھر گوریا، مینا، ابابیلیں کبھی آکر کھیلتی نہ تھیں۔ ننھی گوریا، پیاری مینا، چونچال ابابیلیں، ادیب کو اپنا گاؤں یاد آتا۔ اور اس کے ویران سے دل میں ان پرندوں کے پیار کا درد سا اُٹھتا۔ پیارے گھریلو پرندے! اس کوٹھری کے اردگرد تو شوخ شریر، پاجی، اُچکّے، کائیں کائیں کرنے والے کوّے بھی نہ پھٹکتے تھے۔ پرانی وضع کے اونچے مکانات سے گھری ہوئی، دوکانوں کے کٹہروں کے عقب میں، گلی کے اندر، نچلی منزل کی ایک کوٹھری، کاش وہاں ایک چوہا ہی ہوتا، مگر جب روٹی کا سوکھا ٹکڑا تک نہ ہو تو پھر غریب چوہا کیسے قسمت آزمائی کرے۔ بیماری میں ادیب اکثر فاقہ کرتا اور جیب ذرہ سکت ہوتی تو وہ اپنے اُسی گھٹیا ہوٹل کا رُخ کرتا یا کسی پھیری والے دودھ فروش سے دودھ کا ایک کوزہ لے لیتا۔ وہ جب اچھا ہوتا تو اسی ہوٹل میں صبح کی چائے پیتا اور رات کا کھانا کھاتا۔ رات کو وہ تھکا تھکایا آکر، پڑکر بے چین سی نیند سو جاتا تھا اور خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ خواب دیکھا کرتا۔ جسمانی کام کی تھکن سے نیند تو اچھی آتی ہے کم از کم، مگر دماغی کام کے بوجھ سے اعصاب جھنجھنا اٹھتے ہیں اور طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا۔ اپنے گاؤں سے نکلتی ہوئی اسے ایک پگڈنڈی نظر آتی تھی۔ وہ پگڈنڈی سبدھی نازو ارمان سے بڑھتی ہوئی اس عظیم الشان شہر تک چلی آئی تھی۔ یہ نازک مگر آرزو مند پگڈنڈی پھیل کر، رچ اور سنور کر انارکلی بن گئی تھی۔ کالج کی زندگی کی انارکلی۔ البیلی، بھرپور، شاداب، اُمنگوں سے بھری ہوئی، ارمانوں میں کھیلتی ہوئی، پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انارکلی جوان ہو کر مال کی ٹھنڈی سڑک بن جائے گی، مطمئن، نازاں، سرشار، پھولتی پھلتی، گرم سیر، مادر ایہ مال وسیع ہوتے ہوتے سارا ہندوستان بن جائے گا۔ گونجتا ہوا ملک! پھر وہ اپنا سفر یاد کرتا۔

جب راوی اور گنگ و جمن کی وادیوں کو روندتا ہوا وہ سارے شمالی ہند کا دورہ کر رہا تھا۔ وہ ہر شہر میں فاتح کی طرح داخل ہوتا تھا۔ ہر شہر اسے اپنا معلوم ہوتا، اپنی ملکیت، سحر آگیں کلکتہ، باغ و بہار لکھنؤ، خوب صورت آگرہ، شاندار دلی، یہ سارے کے سارے اس کے دل کے ایک گوشے میں آباد تھے۔

ادیب کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ رات کی چشم بیدار کے کاجل پر اس کے سفید آنسو ڈھلک کر ایک ملگجی سی پگڈنڈی بنا دیتے، جو نہ انار کلی بن پاتی نہ ٹھنڈی سڑک۔ اسے دکھائی دیتا کہ اس کی تمناؤں کی انار کلی ایک بے درد سے بھول بھلیاں میں الجھ کر گم ہو گئی۔ بہرکیف رات کٹ ہی جاتی اور صبح ہوتے ہی وہ اپنا دن دفتر کی بے کیفی میں غرق کر دینے کو روانہ ہو جاتا۔

اسی طرح پانچ سال سے وہ زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ کو لاحاصل کاموں کی چٹانوں پر رسالے کے آہنی دفتر میں جا کر دے مارتا۔ شام کو ادیب پُر اذیت خلا میں اُلٹا لٹکا ہوا محسوس کرتا۔ دفتر کا ناقابل اختتام کام ختم کر کے خالی خالی وہ گلیوں اور بازاروں سے گذر کر اپنے مخصوص گھٹیا سے ہوٹل میں جاتا، اُکتایا ہوا، بے یقین، بے مقصد، ہر شئے اُسے دھواں دھواں سی، مبہم، غیر حقیقی اور بے معنی معلوم ہوتی۔ وہ زندگی کو چھوڑ کر اپنی زندگی کا ٹھوس احساس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر سارا شہر، ساری کائنات اسے جادو سے بنی ہوئی محسوس ہوتی۔ دیواریں پگھلی ہوئی دکھائی دیتیں۔ مکانات تحلیل ہوتے ہوئے اور قدیم شہر کی بے مہر فصیل بخارات میں تبدیل ہوتی ہوئی سی معلوم ہوتی۔ اسے نفیِ حیات سے سخت دُکھ پہنچتا۔ وہ بڑی بے تابی سے چاہنے لگتا کہ یہ بھری دنیا قائم رہے۔ لیکن جو سماں میں یہ ناچیز کرہ دخانی صورت اختیار کر کے تحلیل ہوتا جاتا۔ وہ اسے بچانا چاہتا، مگر اس کے پھیلے ہوئے نامراد ہاتھ اُٹھے کے اُٹھے رہ جاتے۔ وہ تیزی سے سانس لے کر مٹتی ہوئی زندگی کی ایک ایک رمق کو اپنے اندر جمع کر لینا چاہتا تھا۔ اسی کیفیت میں کبھی کبھی وہ دیر تک بازاروں اور گلیوں میں یونہی آوارہ پھرتا رہتا اور جب یہ احساس دردناک حد تک بڑھ جاتا تو اپنی کوٹھڑی میں واپس آجاتا۔ اس وقت اسے اپنی کوٹھڑی کی فرسودہ و مضمحل گرجانی بوجھی اور محدود فضا زیادہ یقینی اور قابل اعتبار معلوم ہوتی۔ اسے اپنے ساتھی کے خراٹے بھی بھلے لگتے۔ زندگی کے ایک ذرے پر قدم رکھ کر، وہ لامتناہی انتشار سے پھیلے جانے کی پُر الم غیر یقینی کیفیت سے نجات پا جاتا تھا۔

بلندی سے گرتا ہوا انسان ماحول کی اشیاء کو بھی قلابازیاں کھاتے ہوئے اور ٹھوس حد بندیوں کو غیر واضح ہو کر بکھر جانے ہوئے دیکھتا ہے۔ بھرے بازار اور رچی ہوئی دنیا میں ادیب اسی نوع کے فریب نظر میں مبتلا ہو کر اذیت اُٹھانے لگتا تھا، اپنی ایچ پیچ سی بے مایہ کوٹھڑی میں اُس کے تصورات کو ٹیک سی مل جاتی تھی اور نقابلی طور پر سکون سا مل جاتا تھا۔ لیکن پھر صبح ہوتے ہی یہ کوٹھڑی، دوسرے مکانات کی دیواریں اور قدیم شہر کی بے مہر فصیل اس قدر مبالغے کے ساتھ ٹھوس، مستحکم، منجمد اور اٹل ہو جاتیں کہ وہ ان کے درمیان یوں محسوس کرتا گویا وہ ایک چنا ہے اور اوپر کا پاٹ بے چلے ہوئے اسے دبا تا جاتا ہے، وہ اپنی پسلی کی ہڈیاں کڑکتی ہوئی محسوس کرتا اور سر کی کھوپڑی تڑختی ہوئی۔

اس طرح وہ کام کیے چلا جاتا تھا، چھ سال قبل کا خوش باش، دوست دار نوجوان اپنے احباب سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر ہر وقت منجمد سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں یا شناساؤں کو اپنی کوٹھڑی یا رسالے کے دفتر میں لانا اپنی تضحیک سمجھتا۔ وہ اپنی پستی کی تشہیر کرنی پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کا ایک دوست دور دراز علاقے سے ملنے آیا۔ اسے اس ملاقات سے سخت اُلجھن ہوئی۔ دفتر کی کوٹھڑی میں دونوں آمنے سامنے دیر تک بیٹھے رہے۔ کچھ یونہی سی رسمی سی اُکھڑی اُکھڑی باتیں ہوئیں۔ اس کی درد ریز آنکھوں سے آشکارا تھا کہ وہ اِس وقت یہی محسوس کر رہا تھا، گویا کوئی جیتے جی اس کی کھال اُدھیڑ کر اس کی چیر پھاڑ پر تلا ہوا ہے۔ لیکن نگاہوں میں التجا بھی اور کرب، کاش اس کا دوست نہ آیا ہوتا! ایک سال سے وہ اپنے گاؤں نہ گیا تھا، وہ تو اپنے کو مطبع کی مشین کے ایک پرزے کی طرح بنا دینا چاہتا تھا۔ اتنا ہی بے احساس، اتنا ہی نادیدہ، وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ کسی سے نہیں ملتا تھا۔

مگر آج رات کا خواب اس کے احساس کی چنگاریوں کو زندگی کی خاکستر سے کرید کر نکال رہا تھا۔ خود اسے صرف یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مبہم طور پر بے چین ہے۔ کسی کام میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ نہ آئے ہوئے مضامین کی اصلاح و ترتیب ہو رہی تھی۔ نہ ادیبوں کو خط لکھا جا رہا تھا۔ اس نے پیڈ اُٹھایا۔ ملک کے مشہور شاعروں اور افسانہ نگاروں کو خط لکھ کر مضامین اور نظموں کی استدعا کرنی تھی۔ پر وہ ایک سطر بھی تو نہ لکھ پایا۔ اسے غیر واضح سا ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ مضمونِ خط میں کچھ بھونڈا پن در آئے گا، جس سے اس کی سُبکی ہو گی۔ وہ ڈی۔ایچ لارنس

کے ایک افسانے کا ترجمہ کرنے بیٹھا۔ ایک دو جملوں کے بعد اپنی طبیعت کی نارسائی اسے کھلنے لگی۔ پھر اس نے ایک المیہ نظم لکھنے کی ٹھانی۔ دو بند بڑی سرعت سے وہ لکھ گیا۔ تیسرے بند پر آکر جو وہ اٹکا تو دس پندرہ منٹ کے صبر کے بعد اسے وحشت ہونے لگی۔ اس نے ادب وَدب کو تہہ کر کے رکھ دیا اور لگا سالنامہ کے لئے اب تک کے خرچ کا حساب پڑتالنے۔ مگر ہر دفعہ جوڑنے گھٹانے میں غلطی پر غلطی ہوتی جاتی اور بہت سے خرچ کی مدیں یاد نہیں آتی تھیں۔ اس نے اُکتا کر رجسٹر پٹک دیا اور مطبع میں لیتھو کے پتھروں کو دیکھنے چلا گیا۔ کئی پتھروں پر الفاظ کچے جمے تھے۔ ذمہ دار عملے سے اس کی تو تو میں میں ہو گئی۔ چڑچڑا کر وہ شدّ سے باہر گلی میں نکل آیا۔ نلکے پر ایک دس سالہ لڑکی نہا رہی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بھیگے ہوئے کپڑے جسم سے چپک چپک کر بدنما معلوم ہو رہے تھے۔ اس حال میں اُس کا دُبلا پتلا جسم اور نحیف دکھائی دیتا تھا۔ لڑکی کے چپٹے چپٹے سے بدن میں اسے ناگواری و زبونی کا تلخ احساس ہوا۔ وہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں کچھ کمی کا احساس پا رہا تھا۔ وہ پھر دفتر کی کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ اب اس نے پروف دیکھنے شروع کئے۔ ان میں کتابت کی اتنی غلطیاں تھیں کہ وہ سالنامے کی طرف سے مایوس سا ہونے لگا۔ اسے اپنے پر اعتماد نہ تھا کہ وہ اس قسم کے انبار کی تصحیح کر سکے گا۔ پریس کسی سنیما کا اشتہار چھاپ رہا تھا۔ اس کی سمع خراش گھڑگھڑاہٹ ادیب کے لئے دماغ سوز ہونے لگی۔ وہ آپ ہی آپ چڑچڑانے لگا۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ یہاں سے اُن ساری مشینوں کو توڑ پھوڑ کر بھاگ جائے اور بس بھاگتا چلا جائے۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا، اپنا پرانا گرم کوٹ پہن لیا اور پھر کرسی کا پُشتہ پکڑ کر میز پر پڑے ہوئے انبار کو مبہم انداز سے تکنے لگا۔ رات کا سارا خواب اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ اس کے اندر عجیب سی بے چینی شروع ہوئی وہ مطبع کے دفتر سے باہر نکل آیا اور اور تیز قدم اُٹھاتا ہوا، پرانی فصیلوں کی تنگ آغوش سے بھی آزاد ہو گیا۔ بہتوں کے بعد اس نے ایسا کیا تھا۔ کئی ماہ ہوئے کاغذ کی تھوک خریداری کے لئے وہ اس حلقے سے باہر نکلا تھا۔ آج اس کا جی چاہتا تھا کہ ساری ذمہ داریوں کو پھینک کر آزاد پھرے۔ بغیر سوچے سمجھے اس کے دل میں بہت سی واضح و غیر واضح خواہشیں پیدا ہوئیں اور بہت سی نفرتیں بھی جاگ اُٹھیں۔ اس کی حیات کا بند سرچشمہ محبت و نفرت کے دھارے لئے ہوئے آج پھوٹ بہا تھا۔ آج وہ شالامار

جانا چاہتا تھا - انارکلی کی سیر دل بھر کے کرنی چاہتا تھا - ٹھنڈی سڑک پر آدھی رات تک سرگرم نظارہ رہنا چاہتا تھا، اور پھر نہ جانے کیا کیا کرنے کا آرزومند تھا - وہ خود نہیں جانتا تھا کیا کیا - پر ایسا لگتا تھا کہ اور بھی بہت کچھ کرنے کو ہے -

وہ باہر نکلنے سے عموماً اس لئے بھی گھبراتا تھا کہ اس شہر میں ہر جگہ ادیب و شاعر پائے جاتے تھے اور ان ادباؤ شعرا کے درمیان افسرانہ فرقِ مراتب اور تاجرانہ رقابت وساز باز پائی جاتی تھی - یہ اس بچارے ادیب کے لئے بہت روح فرسا چیز تھی - وہ ڈرتا تھا کہ کہیں ان حضرات میں سے کوئی بزعمِ خود اونچا ادیب سرِ راہ نہ مل جائے - مالی طور پر کامیاب ادبار و شعرار نچی منزل والی ہستیوں کو بس ایک رینگتا ہوا کیڑا سمجھتے تھے - کامیاب ادیب بننے کی تمنا اسے ضرور ہوتی رہی تھی مگر اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ کبھی اپنے متعلق کسی مغالطے میں نہیں پڑ سکتا تھا - ہاں وہ یہ ضرور سمجھتا تھا کہ اگر اسے فضا سازگار مل جاتی تو وہ بہتوں سے آگے نکل جاتا - لیکن حالات نے رفتہ رفتہ اُسے ایسا کچلا تھا کہ اب تو وہ اپنے کو بالکل بے وقعت سمجھنے لگا تھا، بے نام و نشان، نیم ادبی و نیم تاجرانہ رسالوں کے دفتر کا حقیر سا ایک ملازم - وہ کبھی کبھی اپنا نام زیرِ لب لیتا، اسے دُہراتا اور کئی بار اس کی تکرار کرتا مگر نام کے کوئی معنی مرتب نہ ہوتے - کوئی شخصیت اُبھرتی نہیں - وہ تو گویا آئینہ دیکھنے سے بھی جھجکتا تھا - دوسرے ادبار سے ملنا ملانا تو اس کے لئے وبالِ جان ہوتا تھا - مگر آج اس کے دل میں تمناؤں کے ساتھ نفرت بھی جاگ اُٹھی تھی - وہ شہر بھر کے شعرار و ادبار سے اتنی نفرت کرتا رہا تھا کہ وہ سارے کے سارے بے وجود ہو کر رہ گئے تھے -

آج وہ ان کو استغنا کے ساتھ نظر انداز کرتا ہوا ان کے سامنے سے گذرنا چاہتا تھا -

اُس کے قدم آگے بڑھتے گئے اور وہ کشاں کشاں لارنس باغ جا نکلا - سہ پہر ہو چکی تھی - دوپہر کی ہلکی سنہری دھوپ لارنس کے درختوں سے اختلاط کر رہی تھی - اِکّا دُکّا لوگ باگ سیر کرنے کے لئے آرہے تھے - اِدھر اُدھر ٹولیاں بھی نظر آجاتی تھیں - یہ باغ اس کے لئے نیا نہ تھا - لیکن اس وقت اسے معلوم ہو رہا تھا - اس کی ہمدردی اور وسعت، اس کی آبادی، اس کا سکون ادیب کے لئے نا آشنا سی مسرت پیدا کر رہے تھے - اس کا جی چاہتا تھا کہ چپہ چپہ پر لیٹ کر سبزۂ بیگانہ کو جو ابھی یگانہ محسوس ہو رہا تھا اپنی آغوش میں لے لے اور خود اس کی گود میں چلا جائے -

وہ بلند و بالا درختوں سے لپٹ جانے کا آرزومند تھا۔ آخر وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس اقدام سے اسے ناقابل بیان سرور حاصل ہو رہا تھا، خاص سرور، ٹیلے کی مدوّر صورت، اس کا بھرپور گداز اور دعوت دینے والی رفعت! اوپر جا کر ادیب لیٹ گیا۔ اور نیلے آسمان میں اپنے تصورات، خیالات اور اپنی آرزؤں کو گھولنے لگا۔ زمین کی کوکھ جلی آغوش اسے اتنی پیاری معلوم ہوئی اور اتنی محبت کرنے والی کہ لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں دردِ الفت اور بہجت و سپاس گذاری کے آنسو اُمڈ آئے۔ آسمان کی آزادی بخش روحانیت، اس کی منزہ و مطہر فضا ادیب کی روح کو اپنی طرف بلند کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آسمان نیلا نہ ہوتا تو فطرت کی کتنی مہربانی ہوتی۔ آسمان کی نیلاہٹ آج اس کے لئے ایک نیا پیام تھی۔ وہ اپنے خواب کو اس کی گہرائیوں میں تحلیل کر کے پھیکا، بے اثر، ہیچ کر چکا تھا۔ فی الحال وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کا ایک جزو محسوس کر رہا تھا اور ان کی عظمت، وسعت، رفعت اور محبت کا شریک، رخصت ہوتا ہوا آفتاب رقص کناں پتوں پر آب زر چھڑک رہا تھا جس کے چھینٹے ادیب پر بھی چھن چھن کر پھوار کی طرح گر رہے تھے۔ وہ ازلی و ابدی لذت و سرور میں گم تھا۔

ایک رسیلی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کی۔ ایک جوڑا ٹیلے کی خاموش تنہائیوں میں مخل ہوا تھا۔ ادیب کو انہیں دیکھ کر دقت کا احساس ہوا۔ اس نے نیلے ساٹن کی شلوار اور سفید استر خوانی اوور کوٹ کو عجیب بکیانہ نظر سے دیکھا اور اس کے اندر ملفوف ہستی کے متعلق جاگتے کا خواب دیکھنے لگا۔ آنے والے بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور مرد اسے چڑچڑائی نگاہوں سے دیکھنے لگا ادیب کو تلخ بیگانگی کا احساس ہوا۔ اس نے پناہ کے لئے لڑکی کی آنکھوں کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ مگر وہاں اسے ایک نمایاں بے توجہی اور دل شکنی بعد و غیریت کا سراغ ملا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگا اور شاید فردوس گم کردہ آدم سے بھی زیادہ تلخ کیفیت میں مبتلا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر بے خبری کے عالم میں لارنس سے باہر نکل آیا۔ کھوکھلی سی روح فرسائی کی تلخیاں لئے ہوئے وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ بالکل غیر شعوری طور پر۔ ٹھنڈی سڑک سے بھی گذر گیا اور اسے اس کا احساس تک نہ ہوا۔

وہ زمان و مکان کے بے رنگ و نور خلا میں ڈوبا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل سینے میں نہیں۔ اس کا دماغ کھوپڑی کو خالی چھوڑ کر فنا ہو گیا۔ سا کن ویرانی، لاانتہا، بے آسرا، مجہول،

راہ میں انار کلی بھی ملی - آباد، پُر رونق، رنگین، رواں دواں، سرگرم، گویا و خنداں انار کلی ؛ مگر وہ گذرتا گیا۔

کون جانے وہ کہاں جاتا - مگر اُسے لاہوری دروازے پر شہر کا ایک اور ادیب مل گیا۔ "کہیے جناب! سالنامے کب نکلتے ہیں؟ مضامین کی آپ کے پاس کمی تو نہ ہو گی؟ کیوں؟"

وہ چونک پڑا، ٹھٹھک گیا - اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے دفتر کی طرف چلا جا رہا ہے - مگر وہ قدیم شہر کی بے رحم فصیلوں، تنگ ظرف گلیوں اور اندھے بہرے، گونگے مکانات کے اندر اپنے کو دفن کرنے سے گھبرانے لگا - وہ پلٹ پڑا۔

وہ ایک بار پھر انار کلی میں تھا - شام جوان اور رسیلی ہو کر رات میں تبدیل ہو چکی تھی - برقی شمعیں جل چکی تھیں - دکانیں دلہنوں کی طرح سجی ہوئی تھیں، جیسے کاجل حسین آنکھوں کو خوش تر بنا دیتا ہے - اسی طرح رات نے انار کلی کو سحر انگیز بنا دیا تھا - زرّیں کلاہوں سے لپٹی ہوئی پگڑیاں، خوش وضع سوٹ، نئی قماش کے سوئٹر، گلوزیب مفلر، چمکتے ہوئے جوتے، لہراتی ہوئی اوڑھنیوں، پھسلتے ہوئے جمپروں، چست شلواروں اور طرحدار گرگابیوں سے ناز و نیاز میں مشغول تھے - دکانیں اپنے خزانے لٹا رہی تھیں اور جیبیں جذبۂ عطائے اُلٹی پڑتی تھیں - گوری گردنیں فراخ بازوؤں کو حمائل ہو جانے کے لیے بلا رہی تھیں - بالا و بلند سرِ ناز دعوتِ نظارہ دے رہے تھے - جسموں کے مد و جزر سے جذبات اور تخیلات میں نقرئی لہریں پیدا ہو رہی تھیں - دائرے اور خطوط، نشیب و فراز، نور اور سائے، صورتیں اور خیال، خندہ ریزیاں اور مسکراہٹیں، گفتگو اور سرگوشیاں، حرکت و سکون سب مل کر زندگی کے تنوع کا ایک مجموعی احساس پیدا کر رہے تھے - تانگے اور موٹریں، ریڈیو کے نغمے اور ہوٹلوں سے آنے والی اشتہا خیز خوشبوئیں - گریزاں دامنوں کی عطر بیزیاں، خوب صورت مہکتے ہوئے بچے اور ان کی گداز سینہ مائیں، جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد - چھلکتے ہوئے پیالوں کی طرح کالج کے بالیدہ نوجوان اور شوخ، چنچل اور رنگین ہوتی تیتریاں - یہ ساری موجیں انار کلی کے ایک دھارے میں وصل ہو ہو کر غلطاں اور رواں تھیں - زندگی کی گرم سانسوں سے سڑک اور دکانوں کی فضا ایسی بوجھل ہو رہی تھی جیسے پر نمو بہار کی سہ پہر کو

دامن چمن۔ ادیب مسحور ہو کر رہ گیا۔

وہ کپڑوں کی دکان میں گیا اور سوٹ کے طرح طرح کے کپڑے نکلوائے، ٹویڈ، سرج، ورسٹیڈ، گبرڈین، فلالین، کشمیرے، استرخان، پشمینے، یہ سب چیزیں نکلوا کر اس نے اس طرح دیکھیں جیسے وہ بہت سی شیروانیاں بنوائے گا، بہت سے سوٹ اور ایک دو چسٹر اور اوور کوٹ، اس نے قمیص کے کپڑے ملاحظہ کیے۔ سوئٹر کے نئے نئے ڈیزائن بہت سنجیدگی سے پسند کرتا رہا۔ پھر وہ جوتے اور ٹوپیوں کی دکانوں میں باری باری گیا اور جدید فیشن کی چیزیں دیکھیں بھالیں۔ بیارچون کی دکان میں اس نے کریم، پاؤڈر، اسنو، سینٹ، پائتابے، ٹائیاں، رومال، بٹنوں کے سیٹ نکلوائے اور ان سب کا اس طرح جائزہ لیتا رہا، جیسے وہ الہ دین ہے اور اسے الف لیلے کے کسی جادوگر نے ایسے باغ میں پہنچا دیا ہے جہاں مرجان کی شاخیں، نیلم کے پتے، زبرجد کی کلیاں، لعل و یاقوت کے پھول پھل ہیں۔ اس پر ایک عجیب حال طاری تھا۔ وہ اس سنجیدگی کے ساتھ دکان دکان پھر رہا تھا، جیسے وہ ان چیزوں سے اپنے دامن کو بھر لے گا۔ مگر وہ ہر دکان سے یہ کہہ کر لوٹ آتا کہ اسے چیزیں پسند نہ آئیں۔

ایک مجسمے نے اس کی توجہ اپنی طرف پھیر لی، وہ دکان کا ایک نمائشی مجسمہ تھا۔ ایک عورت کا مجسمہ۔ مگر اسے سچ مچ کی خوب صورت ساڑی پہنائی گئی تھی۔ اس کی طبیعت میں گداز پیدا ہوا۔ دل میں درد اٹھا، ہلکا، مگر قلب کی گہرائیوں تک پیوست۔ بے ساختہ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ اس مجسمے سے لپٹ کر رونے لگے۔ وہ اس مجسمے کو پہچان سا رہا تھا، جیسے وہ ایک بچھڑی ہوئی عزیز ہستی سے سر راہ زمانے کے بعد ملا ہو۔ ادیب کے جی میں اچانک ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ انارکلی کی ساری چیزیں اس حقیقی مگر موہوم وجود کے قدموں پر لا کے ڈال دینا چاہتا تھا۔ اسی جذبہ کے ماتحت اس نے پھر دوکانوں میں ساڑھیاں، بلاؤز کے کپڑے، گرگابیاں اور زنانہ سوئٹر دیکھنے شروع کیے۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے ساڑھیاں، بلاؤز، گرگابیاں گھر میں کافی ہوں اور فی الحال ضرورت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم سوئٹر کوٹ ہو۔ اس نے دس بارہ ڈیزائن دیکھنے کے بعد ایک سرمئی رنگ کا فردار زنانہ سوئٹر کوٹ پسند کر لیا۔ دوکاندار سے مول تول بھی ہوا، بات طے ہو گئی۔ پیکٹ بندھ گیا اور اسے خریدنے کی لذت بھی حاصل ہونے لگی۔

قیمت ادا کرنے کے لیے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، پرس نکالا، اسے کھولا، اس کے اندر صرف چند آنے پیسے تھے۔ اسے خود بھی جیسے تعجب سا ہوا۔ "اچھا! او ہو! بڑی غلطی ہو گئی۔ میں کافی روپے ساتھ نہیں لایا۔" اس نے بغیر جھجک، بلا حجاب دوکاندار سے معذرت کی۔

"کوئی حرج نہیں۔ میں آپ کی پسند کی ہوئی چیز ایسے ہی رہنے دیتا ہوں۔ آ کر لے جائیے گا۔" دوکاندار نے جواب دیا۔

وہ دوکان سے باہر چلا آیا۔ اس نے گویا سوچا کہ ایک کام رہ گیا ہے۔ اسے کرتا ہی چلے۔ کھلونوں کی دکان پر جا کے اس نے تین آنے کی ایک گڑیا لی۔ اور دو آنے کا ایک باجا۔ وہاں سے سیدھا اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا، جیسے واپس آ کر اسے فوراً سوئٹر کوٹ لے جانا ہے۔ کوٹھڑی کے دروازے پر اسے رسالوں کے دفتر کا ایک کاتب ملا۔ کہنے لگا:

"آپ کی تلاش ہو رہی تھی جی۔ پتہ نہیں آپ کہاں چلے گئے تھے۔ مولوی صاحب ناراض ہو رہے تھے۔ کئی آدمی آپ کو ڈھونڈنے آئے۔"

ادیب کو ایسا معلوم ہوا جیسے اچانک وہ دوسری دنیا میں آ گیا، جو بے حد جانی بوجھی ہوئی اور قاتل ہو جانے تک گلوگیر تھی۔ اسے انتھاہ، ڈبو دینے والی تکلیف کا احساس ہوا۔ وہ دفتر نہیں گیا۔ بلکہ کوٹ پہنے ہوئے بستر پر اسی حالت میں دھم سے گر کر لیٹ گیا۔

اس نے سوئٹر خرید لیا تھا۔ اسے لے کر وہ گھر واپس لوٹا۔ وہ جانی پہچانی ہوئی عزیز ہستی جو اب اس کی رونق کا شانہ ہو چکی تھی، اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ بہت سے گلے شکوے ہوئے اور بہت سی پیار کی باتیں۔ سوئٹر، جدید وضع کا سرمئی سوئٹر، اور اس پر گہرا سیاہ فر۔ اس عزیز ہستی نے سوئٹر پہن لیا۔ گوری گوری گردن پر سیاہ فر، جیسے رات کی آغوش میں چاندنی مچل رہی ہو۔ وہ کتنی حسین، کتنی وفا شعار، کتنی محبت کناں تھی۔ ادیب کی دنیا کیسی کامران، کیسی شاداب، کیسی خوش آئند تھی۔ اس نے اپنی نازش حیات کو گلے سے لگا لیا، جیسے وہ بالکل بھول گیا تھا۔ اچانک اپنی جیب سے اس نے کھلونے نکالے اور اپنے بچے کے لیے بھی تحفہ دینے لگا۔ اسے اپنے بچے کا کتنا خیال تھا، پیارا سا ہمکتا ہوا بچہ، پر بچہ سامنے نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بچہ بھی سامنے ہوتا اور ماں بچے کو گڑیا لے کر ہنستی دیکھتی تو اور زیادہ خوش

ہو جاتی ۔ مگر جب وہ اپنی سرمایۂ زندگی کو بچے کے کھلونے دینے لگا تو وہ رنجیدہ ہو کر ہٹ گئی ، مغموم ، دل شکستہ ، دردناک ، وہ سرد آہیں بھرنے لگی ۔ اس نے نہایت ہی اداس لہجے میں کہا۔

"بچہ ؟ مجھے بچہ کہاں ؟"

اب وہ جانی پہچانی ہوئی عزیز ہستی مجسمہ بن گئی ۔ بالکل مجسمہ ، ساکت ، بے حس ، بیجان ، دکان کا نمائشی مجسمہ !

ادیب بے تاب ہو گیا ۔ اتنا بے تاب کہ اس کی نیند ٹوٹ گئی ۔ وہ بیدار ہو گیا ۔ اس پر اذیت ، تلخ اذیت کا احساس طاری تھا ، کوٹھری میں اُس کا ساتھی خراٹے لے رہا تھا اور وہ کوٹ کی جیب سے کھلونے نکال کر گڑیا کی ٹانگ اور ہاتھ اکھیڑ رہا تھا ۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ اُس نے یہ دوسرا خواب دیکھا تھا ۔

"انار کلی اور بھول بھلیاں"

کواڑ کی اوٹ سے ......

چلتی ہوئی سڑک کی جنوبی جانب ایک چھوٹی سی دکان سے ملحق فٹ پاتھ پر مرمت طلب سائیکلوں کے پہیوں اور سلاخوں کے متوازی دائرے، خطوط اور مکڑی کے جالوں کی سی کمانیاں رہروؤں کی نگاہوں کو الجھا لیتی تھیں۔ دکان کے اندر چھت سے لٹکی ہوئی کوئی سائیکل ہوتی۔ اس پر ایک پست قد چندلا دکاندار اپنا عمل جراحی کرتا رہتا تھا۔ کاٹھ کے تختوں اور حلقوں سے بنی ہوئی ایک شکستہ و گریزاں سی شئے، جسے حسنِ تخیل کی پرواز کے کسی اچانک دورے کے وقت ہی الماری کہا جا سکتا تھا، کبوتروں کے ڈربہ کی طرح دیوار سے لگی شاید ازل سے وہیں کھڑی تھی۔ اس ڈربہ نما چیز کے اندر کٹ کے خالی ڈبے، ربڑ کے ٹکڑے، ٹین کے چھوٹے کنستر، لوہے کے زنگ آلود اوزار، پرانے پرزے، ٹوٹے ہوئے پمپ، ٹائر اور ٹیوب، اپنے زوال و انحطاط کی مختلف منزلوں میں اور سوتی چیتھڑے داغ دھبوں، میل کچیل سے اٹے ہوئے، پڑے رہتے تھے۔ یہ سب چیزیں یوں رکھی رہتی تھیں جیسے مداری کی جھولی میں جنتر منتر کی گڈمڈ ہو۔ فرش پر کیل کانٹے بکھرے ہوئے اور عرش پر جھول جھکڑ کے تانے بانے، گوشے میں صنادید عجم کے وقت کی لوہے کی بنی ہوئی ایک عبرت خیز کرسی اور دیواروں پر گڈ ایئر، ڈنلاپ، مجلین کے اشتہاری پلیٹ آویزاں۔

چندلا دکان دار ہر وقت اپنے کام میں منہمک نظر آتا۔ وہ گاہکوں سے بڑی نرمی سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کی آواز میں نمایاں لکیاہٹ کے ساتھ مردہ سی خاکساری تھی۔

سائیکل کی دکان کے ہمسائے میں بہت سی ٹھٹھیروں کی دکانیں تھیں۔ ہر وقت کاریگروں کے ہاتھ اوپر اٹھتے اور نیچے گرتے رہتے تھے۔ ٹھائیں ٹھائیں ہوتی ہی رہتی۔ ننگے بدن سب کے

سب مشینوں کے لیور کی طرح اپنے ہاتھ اوپر اُٹھاتے اور ہتھوڑے کو چوٹ دیے جاتے، دیے جاتے، مسلسل، یکساں، دھوتیاں جانگھوں تک اُٹھائے، پیٹھ اور پوکھڑے ہنہوڑائے، گردن اور آنکھیں جھکائے، ٹھٹھیرے خدا کی جاندار اور حساس مخلوق نہیں معلوم ہوتے تھے، بلکہ کسی بڑے ماہر سائنس انجنیر کے بنائے ہوئے "روبٹ" دکھائی دیتے تھے۔

چندلا سائیکل والا کٹھ پتلی نظر آتا اور اس کی دُکان کے اغل بغل قد آدم گدّے ٹھلائے ٹھائے، کھٹ کھٹ کئے جاتے۔ پوری فضا پر بے جان سی کیفیت طاری تھی۔ حرکت میکانکی اور سکون بے رُوح۔

مگر جب چندلے کے بے برگ و گیاہ، سپاٹ اور اُداس سر سے غیر مطمئن نظریں پھسل کر دُکان دار کے عین متصل الکترے کی رنگی ہوئی سیاہ کواڑ کی اوٹ میں جا پڑتیں تو وہاں دو جاندار، روشن اور گویا ہستیاں دکھائی دیتیں۔ جیسے ریگستان میں پانی کا چشمہ۔ اُکتائی ہوئی طبیعت کو سکون سا ہوتا اور مستفسرانہ دل چسپی۔ اس سارے ماحول کی بے رنگی و بے کیفی کو وہی چمکتی ہوئی ہستیاں دور کر سکتی تھیں۔ کوئلے کی کان کے اندر جیسے چمیلی کے پھول کھل جائیں، یا لوہے کے کارخانے کی گھڑگھڑاہٹ کو خاموش کر کے کوئی بانسری بجانے لگے۔ بس اسی طرح کا روح افزا اور جذبات خیز احساس ان کے مشاہدہ سے ہوتا تھا۔ وہ دو آنکھیں کتنی افسانہ خواں تھیں: کتنی پُر کشش! آتشیں شیشہ کی طرح روح اور دل کے نور و حرارت کی شعاعوں کو مرتکز کر کے وہ دوسرے دلوں کو بھی برما دیتی تھی۔ اتنی زندہ آنکھیں، اتنی بے چین و متکلم ریزنگاہیں اس یکساں طور پر لڑھکتی ہوئی بڑی سی گیند، یعنی دنیا کی سطح پر شاذونادر ہی نظر آتی ہیں۔

کواڑ کے پٹ سدا نیم وا رہتے اور اندر سے سفید ملگجی ساری کے کچھ حصّے دکھائی دیتے۔ پٹ کے پیچھے کوٹھری تاریک معلوم ہوتی اور اس تاریکی سے دو ستارے صبح طلوع ہوتے اور شام تک وہیں دمکتے رہتے۔ مستقل مظاہر فطرت کی مانند یہ بھی دائمی مظہر حیات تھے۔ سالوں سال کواڑ کی اوٹ سے یہ چمکتے رہے تھے۔ دونسلوں نے دیدۂ انجم کو اسی برج میں کھلا دیکھا تھا۔ روشن دیدے لازوال ٹکٹکی کے ساتھ گذرگاہ کو نصف صدی سے تکتے رہے تھے اور اب تک ابوالہول مصر کی طرح تکتے جاتے تھے۔ راہ گیر اُن زندہ آنکھوں کی کرنوں کی قوت محسوس کرتے اور

گذر جاتے مگر وہ آنکھیں نگراں ہی رہتیں۔

وہ آنکھیں ایک بوڑھی عورت کی آنکھیں تھیں جس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ مگر جس کی حیا گلاب کی ایک تازہ پنکھڑی کی طرح بے شکن تھی۔ اس کا گھونگھٹ کبھی نہ چھوٹا اور کواڑ کے پٹ ہمیشہ نیم وا ہی رہے۔ بوڑھی عورت پسِ پردہ جھانکتی رہتی تھی۔ جوانی اب دور کی گونج بھی نہ رہی تھی۔ شباب کیا، رمقِ حیات بھی مٹتی جاتی تھی۔ مگر اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی پامال حسرتوں کو گرہ باندھ کر رکھا تھا۔ انتظار ایک ابدی انتظار میں آنکھیں سرشار رہتیں، اور ان آنکھوں کے سوتے ایک ایسے دل سے ملتے تھے جو وفا، صبر، تمنا اور درد و غم کی ایک کائنات تھا۔

وہ سولہ سال کی تھی تو اس کی شادی ہوئی۔ اُس کا شوہر بھی ایک ٹھٹھیرا تھا۔ مگر وہ اس کام سے آزردہ ہی رہا۔ بیس سال کا ملتس مکھ چونچال نوجوان یوں بُت بن کر کام کرنے چلے جانے سے گھبراتا تھا، شاید اس کی رگوں میں عام ٹھٹھیروں کی طرح پگھلا ہوا سیسہ نہیں تھا، بلکہ چھلکتا ہوا پارہ۔

باپ چاہتا تھا کہ صدیوں کی خاندانی روایت کے جمود کے وارث بیٹے کو بھی میخ کی طرح دُکان میں ٹھونک دے۔ ٹکلے ناچتے رہیں، ہرخی چلتی رہے، لوہے کی چھینیاں دھاتوں کو کترتی جائیں، ہتھوڑوں کی ٹھائیں ٹھائیں جاری رہے اور بھاتی پھنکارتی جائے۔ مگر بیٹا رانگا، سیسہ، جستہ، تانبا، پیتل بننے سے انکار کرتا تھا۔ وہ الوکھا تھا، نرالا، بالکل اَن گھڑ۔ خاندانی سانچے پر نہ ڈھلنے والا، ننگِ خاندان، چھوٹا سا باغی، لڑکپن میں تو مارے باندھے دکان کی مشین کا پرزہ بنا، مگر عنفوانِ شباب سے ہی سینگ پھوٹتے، زور آور بچھڑے کی طرح رسّی توڑ کر بھاگنے لگا۔ لاکھ کھونٹے سے باندھیے۔ مگر اسے تو کلیلیں بھاتی تھی۔ موقع ملا اور نرارے بھرنے لگا۔ وہ آزادی کا رسیا بیاہ کے رشتے میں باندھا تو گیا پر جکڑا نہ جاسکا۔ شادی کو ابھی سال بھی نہ لگا تھا کہ وہ اپنے شہر کی تنگ دامانی چھوڑ کر کلکتہ بھاگ گیا۔

نوجوان بیوی نے پہلے تو سمجھا کہ ترنگ ہے، من کی موج کا جوار ختم ہوتے ہی وہ واپس آجائے گا۔ ابھی تو وہ ایک دوسرے کو سمجھتے بھی نہ تھے۔ جسم کی مملکت کے انکشاف کی کشش کم بھی ہو جائے گی مگر دل کی اقلیم کے راز ہمیشہ نت نئی دل چسپیاں پیش کرتے رہیں گے۔ اس کی

محبت کے بھید تو اَن گنت تھے۔ اس کے دل کا ساگر تو اتھاہ تھا۔ ابھی تو وہ پریم کے بے شمار انمول موتی اپنے سوامی کے قدموں میں رول سکتی تھی۔ مگر پردیس سدھارنے والا واپس نہ آیا۔ کلکتے سے خطوط آتے رہے اور روپے بھی، پر وہ خود کبھی نہ آیا۔

ایک معجزہ رونما ہونے والا تھا۔ اس معجزہ کی کرامت پر عورت کو اعتبار تھا، کامیابی کے تصور میں وہ گم تھی۔ اُسے یقین کامل تھا کہ اس نے مرد کی روح کو پریم کے جادو کے زور سے اپنے اندر مقید کر لیا ہے اور اب وہ جلد بہت جلد، چند مہینوں کے اندر کشاں کشاں چلا آئے گا۔ اس کے اندر جادو جاگ رہا تھا، بالیدہ تر ہوا جاتا تھا اور اسی پیمانے سے اُس کا اعتماد — وہ حاملہ تھی۔ اس کے جسم کے ذرّے ذرّے میں ایک عظیم الشّان انقلاب ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ اس کی رگ رگ میں حیات کی موجیں مچل رہی تھیں۔ عورت نے اپنے جذب و کشش، اپنی محبت، اپنی امید، اپنے شباب و زندگی کے اعتماد کا سرمایہ اسی معجزہ کی پرورش میں صرف کر دیا۔ وہ اپنی حیات سے ایک حیاتِ نو کی تخلیق کر رہی تھی۔

اسے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ عورت کا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک شُبہہ، ایک جگر خراش تمک، اسے توہمات نے آگھیرا۔ شاید اس کا جادو پورا نہیں اترا۔ مرد کا پتلا تیار نہیں ہوا۔ اب جوگ کیسے جاگے۔ عورت آس اور نراس کے درمیان گُھلتی رہی۔ کلکتے اطلاع بھیجی گئی۔ مگر معجزہ بے اثر نکلا۔ اس کا دل چُور چُور ہو گیا۔ بنگال کا جادو جیت گیا، وہ ہار گئی۔

اسی طرح کئی سال بیت گئے۔ ایک روز خبر آئی کہ بھگوڑا واپس آرہا ہے۔ مگر عورت کے لئے وہ بھگوڑا نہیں روٹھا ہوا دیوتا تھا۔ اب وہ آرہا تھا۔ من مندر کے سب دیئے جلا لئے گئے۔ اور اس کی دہلیز پر دو روشن چراغ پپوٹوں کی اوٹ سے راہ تکنے اور محبت کی شعاعوں کے بلاوے بھیجنے لگے۔ وہ انقلابی گھڑی تھی۔ جب پردیسی کے آنے کی خبر آئی۔ عورت اپنی بیٹی کو لے کر، الگنڑے سے رنگی ہوئی سیاہ کواڑی پٹوں کو نیم وا کر کے بیٹھ گئی چشم براہ، پُر امید، بیتاب، وہ دن بھر اسی طرح بیٹھی رہی اور بہت رات گئے تک سڑک کی تاریکیوں کو اپنی نگاہوں سے پرے ہٹاتی اور اُلٹ پلٹ کرتی رہی۔ آخری راہگیر کو بھی رات نے نگل لیا۔ ٹمٹمیں کھڑکھڑاتی ہوئی تھیں، اور دل میں رُک رُک کے انتظار کے ہچکولے پیدا کر دیتیں اور پھر؟ پہیوں کی آخری گردش

سیاہی میں گھل جاتی۔ اس کی منتظر آنکھوں کا کاجل آنسوؤں سے دُھلا جاتا تھا اور سر کے سیندور کی لکیر زخم کے کٹاؤ سے زیادہ درد خیز تھی۔ اس کا سارا ساج اکارت ہوا جاتا تھا۔ رات بھر وہ سسکیاں لیتی رہی، پر کوئی نہیں آیا۔ صبح تڑکے ٹھٹھیروں کے ہتھوڑوں کی ٹھائے ٹھائے سنائی دینے لگی، تب اسے احساس ہوا کہ رات بیت چکی ہے۔

اب یہ اس کا معمول ہو گیا کہ ہر صبح وہ کواڑ کی اوٹ سے راہ تکتی رہتی، ایک ارمان و امید سے لبریز۔ شاید اس میں اس کی زندگی سکڑ کر بیٹھ گئی تھی، بنی سنوری، گھونگھٹ نکالے، وہ سڑک کو، فضا کو، بھیڑ کو، گاڑیوں کو نظر سے کریدتی رہتی۔ ہزاروں، لاکھوں یار دن بھر سیدھی سڑک پر اس کے کالے لرزاں لرزاں دیدوں کا پہیا چل جاتا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی سواری میں بیٹھ کر اسکا اپنا مسافر گھر کے دروازے پر نہ آیا پر نہ آیا۔ ان گنت لے درد دنوں اور بے شمار بجھے ہوئے کوئلوں جیسی سیاہ راتیں مل مل کر وبالِ جان سالوں کے گلا گھونٹنے والے لچھے بنا گئیں۔ عورت انتظار کے لمبے، اور بے چھور دھاگوں سے امید و یاس، محبت و نفرت پر سوز اضطراب اور غم جاوداں کے تیئے تیئے قماش بُنتی رہی۔ سورج کی سنہری گرم کرنوں، نرم خرام اور سنکتی ہوئی ہواؤں، زیر لب گنگناتی ہوئی چاندنیوں، اُمڈتی سرسبز برساتوں، دل آویز جاڑوں اور پاگل گرمیوں نے اس کی بچی کو جوان اور اسے ادھیڑ کر دیا۔ وہ چونتیس سال کی ہو گئی اور اس کی بیٹی سترہ سال کی۔ دنیا بدل گئی لیکن اس کا معمول نہ بدلا۔ الکترے سے رنگی ہوئی کواڑ کی اوٹ سے وہ گھونگھٹ نکالے منتظر ہی رہی۔

عورت کا سسر دھانوں کو گلاتا، تھوکتا تھاکتا، ریتتا مر گیا۔ اس نے شوہر کو خط لکھوایا کہ اس کا باپ گذر چکا اور اس کی بیٹی بیاہ کے قابل ہو گئی ہے۔ پر یہ خط منزل مقصود تک کبھی نہ پہنچا۔ ایک سال کے بعد اچانک آسام کے چائے کے باغات سے شوہر کا خط آیا کہ کلکتہ میں اس کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ آسام چلا آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے بیٹی کی ذمہ داری کا خیال ہے۔ اس کی شادی کے لئے وہ کافی روپئے جمع کر لے تو آئے۔ عورت کے دل میں اُمید کی ایک نئی پھلجھڑی چھوٹی، مگر کچھ عرصہ میں وہ بھی راکھ بن گئی۔ وہ آخری خط ثابت ہوا۔ پھر کوئی اطلاع نہ آئی اور نہ وہ خود ہی آیا۔

بوڑھے ٹھٹھیرے نے اتنا ہیں اندازہ چھوڑا تھا کہ اس کی پوتی کی شادی ہو گئی۔ مگر داماد کو

ساس نے گھر میں بسا لیا۔ اور اسے ٹھیرا ہونے بھی نہ دیا۔ بلکہ سائیکلوں کی مرمت کی دُکان کھلوا دی۔ اسے اس پیشے سے نفرت اور خوف ہو گیا تھا۔

بیٹی کی شادی کے بعد اس کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کا چند لاوا ماوزخمی سائیکلوں پر اپنا عمل جراحی کرتا رہتا اور وہ خود الکترے سے رنگی ہوئی سیاہ کواڑ کی اوٹ سے سڑک کو تکتی رہتی۔ پھر ہم۔ صرف اتنی تبدیلی ضرور ہوئی کہ اب وہ کاجل اور سیندور نہیں لگاتی، ساج نہیں کرتی تھی، مگر کواڑ کبھی پوری نہ کھلی۔ اور گھونگھٹ کبھی نہ چھوٹا۔ وہ اس فضا کی ایک مستقل، غیر مبدل جز ہو کر رہ گئی تھی۔ زمانہ بدلتا جاتا لیکن وہ اٹل تھی۔ اس کی جاگتی ہوئی آنکھیں عمیق اضطراب کے ساتھ رات رات تک تاریکیوں کے پردے چاک کرتی اور اپنے آنے والے مسافر کو ڈھونڈتی رہتیں۔ کوئی موسم ہو، کوئی رُت بدلے مگر راہگیر کواڑ کی اوٹ سے دو شدید طور پر زندہ آنکھوں کو نگراں ضرور دیکھے۔

وہ آنکھیں سڑک کی پیٹھ کے ہر نشیب و فراز سے بڑی یگانگت کے ساتھ واقف ہو گئی تھیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈیاں اور پسلیاں دن بھر ان کے سامنے کڑکتی رہتی تھیں۔ وہ اس کے ہر پہرے سے ہم آغوش ہو ہو کر تھک چکی تھیں مگر پسپا نہ ہوئی تھیں۔ سامنے کی نالی سے خس و خاشاک بہہ بہہ کر سالوں سال گذرتے رہے۔ اور اسی طرح آدمیوں کا بے معنی ہجوم سڑک پر رواں دواں رہا۔ سڑک کے کالے بھورے، پھٹلے گُتے، اُن کی ٹیڑھی بیڑھی دُم، محلے کے لوگ باگ، ان کا ناک نقشہ، ان کی بولی ٹھولی، ان کی لڑائیاں، ان کی صلح، ان کا فقر و فاقہ، ان کی خوش حالیاں، شادی بیاہ، پیدائش اور موت، یہ سب اس گھونگھٹ کی دُنیا میں یکساں داخل ہوتے اور پھر زندگی کی یہ ساری تحریکات عورت کے حساس دل میں جذب ہو کر اس کی منتظر آنکھوں میں سلگ اُٹھتیں۔ الکترے سے رنگی ہوئی کواڑ کے سامنے چھوٹے چھوٹے مکانات توڑ دیئے گئے۔ اور ان کے عقب کے گوبھی کے کھیتوں میں فُٹ بال کا میدان اور کالج کی عظیم الشان عمارتیں اُگ آئیں۔ شہریوں کی صورتیں، ان کا سج دھج، ان کی بول چال بدل گئی۔ "ہندو مسلم بھائی بھائی"! "بھارت آزاد"! اور "انقلاب زندہ باد!" اور لال پیلی ہری جھنڈیوں کے ساتھ آسمانوں کو سر پر اُٹھا لینے والے جلوس منتظر عورت کی راہ میں بچھی ہوئی آنکھوں اور تشنہ کانوں میں خراش پیدا کر کے تاریخ کے مقبرے میں دفن ہو گئے۔ سڑک کی کھال اُدھڑ گئی، مگر افتادہ حالوں کی طرح اُسے روندا جاتا ہی رہا۔ ٹمٹموں اور بگھیوں کی جگہ موٹریں اور لاریاں

آگئیں۔ وہ فراٹے بھرتی، دھول اڑاتی، ہوا کے جھکڑ کی مانند دندنانے لگیں۔ مگر جس مسافر کی راہ سالہاسال سے دیکھی جارہی تھی وہ اس باد پا سواری پر بھی نہ آیا۔ سڑک کی کیچلی بدل گئی، الکترے کی سیاہ تہہ بچھا کر روڑوں اور بالوؤں کو کوٹ دیا گیا، تاکہ وہ فتادگی کا بار آسانی سے اُٹھا سکے۔ بجلی کے تار اور قمقموں سے شہر کی پیشانی دمک اٹھی۔ مگر کواڑ کی اوٹ میں وہی دوازلی چراغ جلتے رہے۔ پرانے رفیق روڑوں اور شناسا کنکریوں کے مٹ جانے سے منتظر عورت کا دل دکھ گیا۔ وہ تو درودیوار کے ادنیٰ سے داغ دھبّے کو بھی مٹنے دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ وقت کی رو کو اس گھڑی تک ساکت کر دینا چاہتی تھی جب کوئی روٹھا ہوا پردیسی واپس آجائے لیکن بے درد زمانہ تیزی سے اس کے جسم کو اور جسم کے ماحول کو بدل رہا تھا۔ وہ اب بوڑھی ہوتی جارہی تھی۔ کاش بوڑھاپا ایک لانبی ڈگ بڑھا کر ہی اچانک آجاتا مگر وہ تو رینگتا ہوا آیا تھا، جنّت کے سانپ کی طرح، عورت کو ہر آن شکست کھاتی ہوئی جوانی کا تلخ احساس ہوتا رہا تھا۔ جب وہ آئے گا، تو اس کے سامنے کیا تحفہ پیش کرے گی۔ بیٹی کی شادی کے بعد وہ الم انگیز طور پر تنہا ہو گئی تھی۔ زمانہ اُسے صلیب پر چڑھانے والا تھا۔ اور اپنی صلیب وہ خود سے سر پر اُٹھائے ہوئے تھی، اکیلی، بے سہارا، ایک ہاری ہوئی آس کے ساتھ، مجبور۔ سب کچھ بدل رہا تھا۔ لیکن اُس کا دل اور اُس کی نگاہیں ویسی ہی تھیں، جیسی اُس کا شوہر انھیں چھوڑ گیا تھا۔ صرف دیا کی لَو کبھی کبھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ زلزلے آئے، شہر کانپ کانپ اُٹھا، عمارتیں ملیا میٹ ہو کر پھر بنیں، جنگیں چھڑیں، بغاوتیں ہوئیں، تماشہ دل باغیوں نے، بریکیڈ بنا بنا کر سڑک کا دل چھلنی کر دیا۔ بجلی کے تار توڑ مروڑ کر سڑک پر بکھیر دیئے گئے۔ دو آنکھیں کواڑ کی اوٹ سے اس ماجرا کو دیکھ کر خوش ہوئیں، کیونکہ ان ساری جدید چیزوں سے انھیں نفرت تھی۔ یہ بیگانہ تھیں نا۔ ان کی اپنی پرانی چیزوں کو فنا کر کے ان نئی چیزوں نے سر اُٹھایا تھا۔ مگر جب اسے راستہ رک جانے کا احساس ہوا، اور جب ریل کے بند ہونے کی خبر ملی تو کواڑ کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی عورت کانپ کانپ گئی۔ پھر وہ کیسے آئے گا، جس کے انتظار میں ایک عمر گذر رہی ہے۔ عورت کو مائل بہ تخریب باغیوں سے بے پناہ نفرت ہوگئی۔ جیسے وہ اس کا کلیجہ کاٹ رہے ہوں۔ پھر ٹڈی کی طرح فوجی لاریاں آئیں اور ٹامیوں نے سڑک پر فوجی بریگیڈ لگائے۔ گولیاں چلیں اور پکڑ دھکڑ مچی۔ کواڑ کی اوٹ میں دل بھر لرزا۔ کہیں پردیس سے آنے والا گولی

کا شکار نہ ہو جائے، کہیں کر نے اسے روک نہ لیں۔ اُدھر دونوں ٹھٹھیروں کی سب دکانیں بند رہتیں مگر الکترے سے رنگی ہوئی کواڑ کے پٹ ضرور کھلتے۔ اور اس کی اوٹ میں آنکھوں کا دیا گھونگھٹ تلے جلتا ہی رہتا۔ ان آنکھوں میں باغیوں اور گوروں دونوں سے نفرت کی آگ سلگ رہی تھی۔

سب کچھ گذر گیا۔ تبدیلیاں، زلزلے، بغاوتیں اور ان کے ساتھ نصف صدی۔ مگر کوئی طوفان منتظر آنکھوں کا چراغ گل نہ کر سکا۔ عورت کے چندلے داماد کے بہت سے لڑکے لڑکیاں ہوئیں۔ لیکن عام بوڑھی عورتوں کی طرح نانی نتنیوں سے اُسے وہ دلچسپی نہ ہوئی جو عموماً ہوتی ہے۔ لڑکے پھڑکے آتے۔ اُنھیں بھی وہ کواڑ کی اوٹ میں بٹھالیتی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ اُکتا کر بھاگ جاتے۔ عورت اپنی ادھیڑ بیٹی سے طعنے سنتی۔ چندلا داماد نکیا نکیا کر بگڑتا رہتا پر سب بے اثر۔

پھر ایک واقعہ ہوا۔ جب وہ پینسٹھ سال کی ہوئی تو اس کی نتنی کی شادی ہوئی۔ نتن داماد کے بارے میں اسے خبر ملی کہ وہ کلکتہ میں کماتا ہے۔ کلکتہ کے نام سے ایک فوری خوف اس کے دل میں پیدا ہوا مگر جب نتن داماد کا پہلا خط آیا تو اُس کی آنکھیں نئی روشنی سے دمک اُٹھیں۔ اس کی نتنی کوٹھری میں چھپ کر خط پڑھ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں وہاں پہنچی اور چپ چاپ پلنگ کے نیچے نوعروس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ لڑکی ہاتھ میں خط اُٹھائے پڑھنے میں منہمک تھی اور کبھی کبھی وہ جملے زور سے ادا کر دیتی۔ دلہن کے نوجوان وفا شعار دل کا چونچال خونِ محبت اور آرزوؤں کی آنچ سے لو دینے لگتا، اور بوڑھی عورت کی متمنی و نگراں آنکھیں دل کی ویرانی کی آگ سے تابندہ تھیں۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ خط اس کے گم شدہ شوہر کا ہے اور وہ اسے اپنی نتنی سے پڑھوا کر سن رہی ہے۔ وہ کھسکتی ہوئی خط پڑھنے والے کے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ جب اُس کے ہاتھ دُلہن کے پاؤں سے مس کر گئے تو دُلہن چونک اُٹھی اور شرم سے عرق عرق ہو گئی۔

پھر تو ہر بار یہی ہونے لگا۔ بوڑھی عورت کواڑ کی اوٹ سے ڈاکیہ کا انتظار کرتی رہتی۔ کلکتہ سے آنے والے وہ پیارے لفافے! ڈاکیہ بھی کتنی رومانی ہستی ہے۔ اس کے قدموں سے کتنی بیتاب نگاہیں لپٹی رہتی ہیں، اور اس کی آہٹ سے کتنے دل دھک سے کر اُٹھتے ہیں۔

نوجوان دُلہن قاصد خوش خرام، کا انتظار کرتی اور کبھی کبھی بے چینی میں وہ بھی الکترے کی رنگی ہوئی سیاہ کواڑ کی اوٹ میں کھڑی ہو جاتی۔ مگر بوڑھی عورت کا انتظار بادۂ رسا کی طرح

تھا۔ سکر مکمل عطا کرنے والا۔ اور نوجوان لڑکی اس ہرن کی طرح تھی جس کے نافہ میں ابھی ابھی مُشک پیدا ہوا ہو۔ لڑکی بیتاب زیادہ تھی نکہت نوجوانی کے مانند۔ بوڑھی عورت بحر الکاہل کی مثال اتھاہ تھی۔ اُسے صرف انتظار تھا۔ مجرد مطلق وابدی۔ نو عروس اپنی خودبین و خود آراجوانی کی طرح نگراں ہونے کے نتیجے میں پیام یار کا انتظار کھینچتی تھی۔ پورب دیس کلکتہ سے آنے والا محبوب لفاف کبھی کبھار ہی لڑکی کے ہاتھ میں پڑتا۔ یہ جنس گراں مایہ بوڑھی نانی کے ہاتھ لگتی۔ لامتناہی صبر کے ساتھ کواڑ کی اوٹ سے لگا ہوا اور کون بیٹھ سکتا تھا۔ وہ خط لے کر رازدارانہ مگر نشاط انگیز انداز میں اپنی نتنی کی کوٹھری میں جاتی اور اس کے ہاتھ میں خط دے کر امیدوار بیٹھ جاتی۔ نانی کا دبے پاؤں تیزی سے دُلہن کی کوٹھری کی طرف جانا اس بات کی علامت ہوتی کہ بنگال کا جادو جاگ گیا ہے۔ لڑکی اگر اپنی کوٹھری میں نہ ہوتی تو نانی کو اُس طرف جاتے دیکھ کر فوراً بے تابانہ اس جانب دوڑ پڑتی۔ پہلے تو اسے نانی سے نفرت سی ہوئی، رقابت و حجاب کی پروردہ نفرت، مگر رفتہ رفتہ مصالحت ہو گئی۔ امداد باہمی کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ نانی بے چوک لڑکی کے ہاتھ میں خط لا کر دیتی اور لڑکی سوائے چند جوان فقروں کے سبھی کچھ سُنا دیتی تھی۔ بوڑھی عورت خوش ہوتی۔ اسے روحانی اطمینان حاصل ہوتا۔ وہ یوں سمجھتی کہ خط اُسی کے نام کا ہے۔ انسان کی نفسی گہرائیوں میں زمان و مکان ڈوب کر تحلیل ہو جاتے ہیں نصف صدی بوڑھی عورت کے دماغی بھولے پن میں فنا ہو گئی۔ کلکتہ سے آنے والا ہر خط اُس کے اپنے بسرے ہوئے پردیسی کا خط تھا۔ وہ تو اپنی نواسی سے گویا صرف پڑھوا کر سنتی تھی۔ بوڑھی عورت خط سن کر ایک مدہوش مسرت میں کھو جاتی۔ کئی دنوں تک اس پر یہ عالم طاری رہتا۔ اور ہر روز وہ کواڑ کی اوٹ میں صبح ابدی انتظار میں محو رہتی۔

ایک خط آیا۔ اطلاع تھی کہ دُلہن کا دُلہا آرہا ہے۔ عروس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ بوڑھی عورت پر سنجیدگی کے بادل منڈلانے لگے۔ پھر اسے ہسٹریا سا ہونے لگا۔ وہ اپنی نواسی سے دن میں کئی کئی بار خط پڑھوا کر سنتی۔ رہ رہ کر تاریخ اور وقت کے بارے میں پوچھتی اور بھول جاتی۔ اور پھر کواڑ کی اوٹ میں جا بیٹھتی۔ کبھی اس کا چہرہ ایک مردہ چہرے کی طرح پُراسرار بن جاتا، ساکت مگر علامتی، گہرا اور تاریک، اور کبھی تاثرات و جذبات اُس کے چہرے کی سطح پر آکر اپنے

تانے بانے بُننے لگتے - وہ گاہ بیحد شاداں نظر آتی اور گاہے انتہائی رنجیدہ۔

آخر وہ دن آگیا - دُولہا کلکتہ سے تین بجے شب کی گاڑی سے آنے والا تھا - بوڑھی عورت حسب معمول علی الصباح کاروبار شروع ہونے سے بہت پہلے بلاکش انتظار ہوگئی - اس کی آنکھوں میں نئی امید چمک رہی تھی، اس کا انتظار ایک تازہ کسمساہٹ لیئے ہوئے لرزاں تھا - نگاہوں میں البیلے بھاؤ اور رس نفر نفراتے تھے - اس دن اس نے کھانا بھی نہیں کھایا - بس وہ کواڑ کی اوٹ میں لوہے کی میخ کی طرح جڑی رہی - دوپہر گذری اور پھر رات اپنی انجان گہرائیوں کے ساتھ طاری ہوگئی - لیکن بوڑھی عورت وہاں سے اُٹھانے پر بھی نہیں اُٹھی - کواڑ کا ایک پٹ اس کے منتظر دیدوں کی طرح بے خواب ہی رہا - رات بھیگ گئی، سب لوگ سو رہے اور وہ رات کی تاریکی میں گھل کر اس کی خاموش ابدیت کا جزو بن گئی - جب سناٹا چھا گیا تو وہ اچانک اٹھی اور اپنی نتنی کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوئی - نوجوان عورت اپنے ہی بار سے تھکی ہوئی جوانی کی نیند میں ڈوبی ہوئی تھی - بوڑھی عورت نے سنگار بکس سے سیندور کی شیشی نکالی اور آئینہ کی مدد سے اپنی مانگ میں سیندور اچھی طرح سے بھر لیا - پھر وہ بہ عجلت تمام واپس لوٹی اور کواڑ کی اوٹ سے لگ کر بیٹھ گئی - اب وہ زیادہ مطمئن تھی - سڑک پر صرف جاڑے کی ہوا چل رہی تھی - بوڑھی عورت کے جذبات موسم سرما کی خشک مگر برچھی کی انی کی طرح تیز ہوا کی مانند تھے - پھر بھی وہ سکون جس کی گود میں لامتناہی درد ہو، اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ اس پر طاری تھا۔

اس کا نتن داماد آیا، ٹھیک وقت پر آیا - لیکن جاڑے کی رات زیادہ بیتنے کی وجہ سے وہ سڑک والے دروازے پر نہ آیا - وہاں سے زنانہ دروازہ دور پڑتا تھا - اس نے خیال کیا کہ اتنی رات گئے اس طرف دروازہ کھولنے کون آئے گا - پہلو کی گلی کی طرف جو دروازہ تھا وہ آنگن میں کھلتا تھا، اور وہاں سے آواز کا اندر پہنچنا آسان تھا - چار بجے بھور کو نوجوان دُلہن نے آنگن والا دروازہ کھولا، اور آنے والا اندر داخل ہوگیا - نوجوان عورت آدھی رات سے بیداری اور نیند کے درمیان لذتِ انتظار حاصل کر رہی تھی - وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں بوڑھی عورت کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ابتدائے شب میں گرے ہوئے سیندور اب تک بکھرے ہوئے تھے۔

بوڑھی عورت کواڑ کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی، انتظار کرتی، انتظار کرتی، انتظار کرتی رہی۔ لیکن کسی نے آواز نہیں دی، کوئی نہیں آیا۔ صرف سرد ہوائیں کھلے ہوئے پٹ کے اندر سنسناتی ہوئی داخل ہوتی رہیں۔ اور نظر و دل کے علاوہ بوڑھی عورت کی ہڈیاں بھی خلش انتظار خوشی سے برداشت کرتی رہیں۔

رات بیت گئی۔ صبح ہوئی۔ سڑک جاگ اٹھی۔ دولہا دلہن جاگ اٹھے، مگر بوڑھی عورت کواڑ کی اوٹ سے لگی بیٹھی رہی۔ سبھوں نے دیکھا۔ منتظر آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی تھی۔ نگاہیں لازوال ہو گئی تھیں اور اس کا انتظار اتھاہ، اٹل، امٹ تھا۔

"انارکلی اور بھول بھلیاں"

سپنوں کے دیس میں

میں ایک کہانی لکھنے لگا ہوں۔ کہانی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کہانی کہنے سے، اپنے آپ اور اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یا کم از کم مجھے تب معلوم ہوتا ہے کہ دھندلکے صاف ہو رہے ہیں، لکیریں اُبھر رہی ہیں، ہیولے صورتیں اختیار کر رہے ہیں اور صورتیں جہت در جہت ناچتی ہوئی کیفیتوں اور معنوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ یہ رقص ویز تک ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کیف و معنی کو محسوس کرنے اور سمجھنے والی حالت بھی مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ شاید کہانی کا یہی نقطۂ انجام ہوتا ہے۔ لیکن کہانی پھر بھی لمبی معلوم ہوتی ہے۔ حلقۂ دامِ خیال کی ان گنت آنکھیں خواب عدم سے بیدار ہونے لگتی ہیں اور تماشائے عالم کرتی ہیں۔ عدم خواب تھا یا یہ زندگی خواب ہے، کون جانے:

سوتا سنسار، جاگتا پروردگار۔ زمان و مکان کی حدوں سے آزاد خلا میں ایک بسیط و عظیم دماغ نے اپنی بیکراں بیداری میں تنوع پیدا کرنے کے لئے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ جلد، جلا محدود روشنی سے پُر تھی، اتھاہ اندھیرے سے بھر گئی۔ ہر سو خواب چھا گیا۔ خواب جو لامحدود کو محدود دائرہ میں لاتا ہے۔ خواب جو دریائے رواں کو کوزہ میں بند کر دیتا ہے۔ خواب جو ازل و ابد کو ایک لمحے میں تبدیل کرنے پر قادر ہے۔

عالم خواب میں سکون مطلق تھا۔ شدہ شدہ سکون میں تناؤ پیدا ہوا۔ ایسی کیفیت تھی، جیسے سکون ذہن پر تنا ہوا ہے۔ بے جھول، صاف، بے شکن، مکمل سکون، اپنی انتہا پر پہنچ کر ڈھول کی جھلی کی طرح تناؤ کی شدت سے پھٹ سا گیا۔ خلا میں لہریں پیدا ہوئیں۔ لامکان ان خواب ناک لہروں سے بھر گیا۔ لامتناہی لہریں، پیچیدہ لہریں، متصادم لہریں۔ اندھیرے میں بجلیاں سی کوندنے لگیں عظیم

خواب کے دھندلکے میں کائناتیں رقص کرنے لگیں۔ بسیط خواب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کچھ روشن اور نیم روشن دائرے بنے۔ عظیم و لامحدود دماغ کی خوابناک فضا میں کچھ دائرے شعلہ بداماں ہو کر بھڑکے اور فنا ہو گئے۔ کچھ پھیلا گئے اور عالم عالم میں روشنیوں کے ساتھ ملی جلی کجلاہٹیں بھی پھیل گئیں۔

اب اوٹ پٹ سپنے کی کہانی کون کہے۔ سپنے تو سپنے ہی ہیں۔ ان کا اور نہ چھور۔ اس دنیا میں انہونی ہوتی ہے۔ سپنے میں کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ سپنا ہے اور عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ سپنا سچ مچ کی دنیا معلوم ہوتا ہے۔ میں سپنے کے ایک سنسار کی کہانی کہتا ہوں۔ محض ایک سنسار بکراں سپنے میں ایک حقیر نقطے سے بھی حقیر تر ہے۔ مگر بند دار بربما کی حقیقت کوئی نہیں پاسکا۔ تاراں کے سپنے کے ایک نقطہ پر کیا گذری سنیئے :۔

سپنے کا ایک نقطہ ابھرنے لگا۔ ابھر کر پھیل گیا۔ بالائی جانب سے ایک عریض پردہ سا لہراتا ہوا گرا۔ پھر پردہ ساکن ہو گیا اس پر کچھ لکیریں۔ زاویئے، دائرے، مثلثیں، قوسین بیضوی دائرے، متوازی خطوط، بھلبیاں، ہیئتیں، ان گنت قاشیں آہستہ آہستہ رونما ہونے لگیں۔ یہ ساری قاشیں بنتی بگڑتی، ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتی رہیں۔ ہوتے ہوتے با ضابطہ اجسام، شکلیں اور صورتیں پردے پر منقوش ہو گئیں۔ سپنے کا پردہ بڑا گنجان اور آباد ہو گیا۔ اچانک نقوش خواب میں جنبش پیدا ہوئی۔ صورتیں اور اجسام آنکھیں جھپکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں تہ داری، دبازت اور ابعاد ظاہر ہوئے۔ سپنے کے پتلے طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگے۔ پہلے تو ایسا ہوا کہ پتلوں کی حرکت کسی ڈور کے سہارے ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بعد ازاں پتلوں کی آنکھوں میں گہری چمک سی رونما ہوئی اور بڑی پر معنی ہیک۔ پتلے ایک دوسرے کی آنکھوں کے شیشے میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ اندر کی دنیا عجیب و غریب تھی۔ پیچیدہ، پاتال تک گہری، اتھاہ۔ اس داخلی دنیا کو دیکھ دیکھ کر پتلوں کا سر چکرا گیا اور وہ بے خودی میں ناچنے لگے۔ ناچتے ناچتے ساری ڈوریں ٹوٹ گئیں۔ سب پتلے اوندھے سیدھے گر پڑے اور آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے، کچھ اٹھ بیٹھے، کچھ اٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے۔ ہمیں ایسا لگا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر کمی گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اس گھبراہٹ سے انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک جیتے جاگتے وجود ہیں۔ گھبراہٹ کے ساتھ آزادی کا احساس بھی تھا۔ پتلوں کی داخلی دنیا اضطراب؟

اذیت اور لذت سے بھر گئی۔ اس خلفشار اور کش مکش سے ایک اور حیرت خیز کیفیت سر اٹھانے لگی۔ خواب کے پتلے سوچنے لگے۔ یہ عجیب تجربہ تھا۔ اذیت خیز مگر ناگزیر۔ کچھ پتلے اس درد آگیں بوجھ سے بچ گئے، سوچنے کے بوجھ، فکر کے وزن سے یہ پتلے بڑے معصوم اور مسرور نظر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی صورتیں مسخ ہونے لگیں اور بے فکرے پتلے دوسری ہیئتوں اور شکلوں کے ان گنت پتلوں میں جا شامل ہوئے۔ فکر مند پتلے ابھرنے لگے، بڑھنے لگے، پھیلنے لگے۔ مگر اشک و آہ کی وادی میں، تبسم و خندہ کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے، سوچ کی مشعل سے پگھلتے ہوئے، روشنیاں پھیلاتے ہوئے یہ پتلے آزادانہ آگے بڑھنے لگے۔ پرخطر منزلیں آئیں تو ان کی ٹولیاں جتھے اور جماعتیں بن گئیں۔ پتلوں کا کارواں گرتا پڑتا آگے بڑھتا رہا۔ کبھی یہ جتھے اٹوٹ معلوم ہوتے اور کبھی ہر پتلا یکسر آزاد و خود کار محسوس ہوتا۔ اس سفر میں ایک ایک پتلے کے اندر کیفیات، واردات، محسوسات اور تخیلات کی تہ بہ تہ شکلیں پیدا ہوئیں، بے نام تجربے، نام تو بہت بعد، بہت بعد رکھے گئے۔ پتلوں کی حرکت و سکون، اعمال و افعال دائرۂ تعینات کے اندر آنے لگے۔ ایک سنسنی خیز بات یہ ہوئی کہ پتلے جوڑا جوڑا ہو گئے۔ جوڑے میں ایک مضبوط و تنومند اور دوسرا نازک و لطیف۔ ان جوڑوں میں ایک دوسرے کے لئے بے پناہ کشش تھی۔ مقناطیسیت، برقیت۔ پتلوں کے جوڑے ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ یہ چمٹتے، الجھتے، ایک دوسرے کو بھینچتے، ایک دوسرے میں سماتے، چسپاں ہوتے اور ہم آہنگ حرکتیں کرتے۔ دو طرح کے پتلے تو پہلے بھی تھے۔ ان میں اتصال و انفصال بھی ہوتا رہتا تھا۔ ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی تھی۔ لیکن ان کے الگ الگ جوڑے نہیں بنے تھے۔ اور اب جوڑے بن گئے اور ان جوڑوں کے وصال سے اور پتلے پیدا ہونے اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ ننھے ننھے پتلے، پیارے پیارے پتلے، بدلے ہوئے حالات نے بدلنے ہوئے مزاج پیدا کر دیئے۔

پتلوں میں روح تو اسی وقت پھنک گئی تھی جب پتلے اٹھ بیٹھے تھے۔ اور اس لیے سفر کی لغزش و افتاد اور مقابلہ و تعاون نے پتلوں کی روحوں کو اور بالیدہ و پیچیدہ بنا دیا۔ روح کے ہر پیچ میں نت نئے تجربوں کے عکس مرتسم ہوتے جاتے تھے اور ان سے روحوں کی تہ داری بڑھتی جاتی تھی۔ نئے تجربوں کی آزادی نے پتلوں میں بڑا اپنا پن پیدا کر دیا۔ ہر پتلا ایک فرد بن گیا۔ پہلے وہ محض ایک وجود تھا۔ پتلوں سے جب جوڑے بنے اور ان جوڑوں سے جب خاندان پیدا ہوئے تو پتلوں

کی انفرادیت اور بڑھ گئی۔ ان کے وجدان و ذوق کی یک گونہ یکسانیت کے باوجود ان کے احساسات وجذبات کے محور بدل گئے۔ ان کے ارادوں اور عزائم کی منزلیں بدل گئیں۔ اُن کے تخیل اور فکر کی سمتیں نیرنگ ساماں ہو گئیں۔

—— اور جب منفرد پتلوں کے دماغ بیکراں تجربوں کی بجلی سے بھر گئے تو بولی پیدا ہوئی۔ ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ یہ پتلے، یہ افراد فرد فرد ہوتے ہوئے بھی خاندانوں، ٹولیوں، جتھوں، قبیلوں اور جماعتوں میں منظم ہوتے رہے۔ بولیاں زبانیں بن گئیں۔ پتلوں نے خوش ہو کر اپنے اور ماحول کی ہر شئے کے نام رکھ لیے۔ ان کے دل ہلکے ہوئے اور دماغ پرواز کرنے لگے۔ خواب کے پتلے ایک نئے عالم اظہار میں داخل ہو گئے۔ حیرت فزا، طلسمی عالم در عالم۔ لب اور زبان رکھنے والے بھی گونگے ہوتے ہیں۔ اور کان والے بھی بہرے۔ ایسے گونگے کہانی نہیں کہتے۔ ایسے بہرے کہانی نہیں سنتے۔ مگر پتلے بولنے لگے۔ مفہوم و معنی پیدا ہوئے۔ اور کار بیکراں الفاظ میں ڈھل گئے۔ یہ نہ ہوتا تو آپ یہ کہانی نہ سن پاتے۔ لفظ قوت ہے۔ بیان الوہیت ہے۔ برہما نے اپنے سپنے کی مالا پہن لی۔ مالا کا ہر موتی ایک شبد تھا۔ موتیوں کے ہار سے کتھائیں بن گئیں۔ دیو مالا کی جھنکار، سپنوں کا بولتا ہوا سنسار!

خدا کے خواب کا اور نہ چھور۔ وہ خود ازلی اور ابدی۔ اس کے خواب پر بھی ازل و ابد کا پرتو۔ حق در حقیقت ایک ہے۔ خواب اور تعبیریں ان گنت۔ برہما کے سپنے کے ایک بندو کی کہانی ہے۔ بندو ایک عظیم دائرہ بن گیا۔ دائرہ ایک سنسار۔ دائرہ کے پتلوں نے سنسار کے کونے کونے کے نام رکھ دیئے۔ ہر کونے کے ہر نقش کے نام رکھ دیئے۔ ذرّے ذرّے نامدار ہو گئے۔ چپن چپن تابدار ہو گئے۔ خواب کے پتلوں نے اپنی ایک کائنات گھیر لی۔ سورج، چاند اور تاروں سے اسے سجایا، شمع بنایا۔ زمانہ کو ڈور میں باندھا۔ پتلوں کا کارواں چاند تاروں کے ساتھ، مہر و مہ پاروں کے ساتھ زمان و مکان میں سفر کرتا ہی گیا۔ بندو ناچتا رہا۔ بندو پر پتلے ناچتے رہے۔ ساری کائنات ناچتی رہی —— پتلوں نے بندو پر بہتیری کہانیوں کے چتر بنائے۔ پھر ان انوں کو جیتا جاگتا بنا دیا۔ پتلوں نے بہت بہروپ بدلے۔ بہت سے منچ سجائے۔ بہت سے ناٹک کھیلے۔ ہر پتلے کا اپنا اپنا کام، اور کام کے بھی نام رکھے گئے۔ کوئی بھلا کام، کوئی برا کام۔ پتلوں

میں اچھے بُروں کی تمیز اُبھری۔ نیک و بد، خوب صورت اور بدصورت کا امتیاز پیدا ہوا، محبت و نفرت نے بڑی پیچ دار شکلیں اختیار کیں۔ پتلوں کے وجود میں گتھیاں پڑیں۔ گرہیں ابھریں۔ انفرادیت شخصیت بن گئی۔ پتلوں کے روپ انوپ تو تھے ہی، اب ان کی شخصیتیں انیلی، نرالی نرالی ہو گئیں۔ اور اب پتلے سوچتے سوچتے نئے سنساروں کے سپنے بھی دیکھنے لگے۔ خواب در خواب!

وہ عظیم خواب ان اجزائے خواب یعنی پتلوں کو حقیقت ہی معلوم ہونے لگا۔ خود ان کے دماغ میں ان گنت ننھے ننھے سپنے جنم لینے لگے اور حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ سماجیں بنیں۔ تمدن رچے گئے۔ تہذیبیں سانس لینے لگیں۔ پل پل کی تاریخ بن گئی اور تاریخ جھلجھلیلی!

ہمالہ نے برف آلود ٹھنڈے کہرے سے جھانک کر دیکھا۔ سندھو لہرا رہا تھا۔ برہم پترا بل پہ بل کھا رہا تھا۔ گنگا، جمنا، نربدا، تاپتی، کرشنا اور کاویری تھرک رہی تھیں، ناچ رہی تھیں۔ وندھیا اور ست پڑا مہک رہے تھے۔ سُندربن گا رہا تھا۔ نلگری سنگیت الجا رہا تھا۔ اور نیلے سمندروں میں نہائے ہوئے بادل مستی میں اپنی لٹ بکھرائے ڈھول بجا رہے تھے۔ اس سنگیت سبھا کو ہمالہ نے اپنا سن سفید سر اور پُرشکن پیشانی جھکا کر دیکھا۔ اس نے دیکھا پورب، دکھن کے ٹاپوؤں سے چوڑی ناک، چوڑے جبڑے اور چوڑے چہرے والے پتلے ایراوتی اور برہم پترا کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے اس کی شرن میں آ گئے۔ ان کا رنگ تانبا جیسا تھا۔ پھر پچھم دیس سے کالے کالے پتلے، ابھرے ناک نقشے والے پتلے رقص کرتے، دھومیں مچاتے آئے اور اس کے دامن سے لے کر نلگری اور نیلے سمندر تک چھا گئے۔ لوہے جیسے پتلے اور تانبے جیسے پتلے آپس میں ٹکرائے۔ اس ٹکر سے آگ پیدا ہوئی۔ شعلے بلند ہوئے اور پھر مجسم ہو کر ناچنے گانے لگے۔ اپنی سنگیت سے سیمے کو راگ کے تاروں میں باندھنے اور تاریخ کے گھروندے بنانے لگے۔ موہنجو داڑو اور ہڑپا جیسے بہتیرے گھروندے بنا ڈالے۔ ہمالہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھم سے اور پتلے آئے۔ تیر کمان سنبھالے ہوئے، گھوڑوں پر سوار، طوفان کی طرح آئے، بادل کی طرح گرجے، بجلی کی طرح کوندے۔ کالے، مٹیالے اور بھورے پتلوں پر ٹوٹ پڑے اسی سمے پورب اتر سے بھی حملہ ہوا۔ چپٹی ناک، چھوٹی آنکھوں اور پیتل جیسے رنگوں والے پتلوں نے بارہ سنگھوں اور ٹٹوؤں پر سوار ہو کر دھاوا کیا۔ سندھو میں سیلاب آیا۔ برہم پترا

میں طوفان ۔ گورے اور پیلے پُتلوں نے کالے پُتلوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔

گورے پُتلوں میں ایک بہت ہی جیالا پُتلا تھا۔ اس کا نام اندر تھا۔ وہ بڑا پھرتیلا اور چونچال تھا۔ سیر و شکار میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ کالے پُتلوں کا جیتا جیتا خون بہا کر اسے سرور حاصل ہوتا۔ آگ کے شعلوں کے سامنے برق رفتار گھوڑوں کی قربانی اور گائے کے جوان بچھڑوں کے پھڑکتے ہوئے لوتھڑوں کا بھُنتا اندر کو مرغوب تھا۔ خون اور گوشت کی بو سے اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے تھے۔ اس نے گورے پُتلوں کو بہت بڑے جتھے میں منظم کیا اور کالے پُتلوں اور ان کے کھلونوں کا شکار کھیلنے کھڑا ہوا۔ وہ کالے پُتلوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ وہ تماکہ اور دندھیاچل کی ترائیوں میں کالوں کو اپنے خون آشام تیروں کا نشانہ بناتا رہا اور اس نے اپنی اولاد کو بھی یہی وصیت کی۔ مگر کالے پُتلے ان گنت تھے۔ گوروں سے بہت زیادہ۔ صدیاں بیت گئیں۔ مگر گوروں اور کالوں کی جنگ ختم نہ ہوئی۔ آخرش ایک بڑا گیانی گورا پُتلا آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں نہ تیر تھے نہ تلوار تھی۔ اس نے قانون بنائے، ودھان پیش کیا۔ اس گیانی کا نام منو تھا۔ اس سے پہلے پانینی اور پاتنجلی بھی بڑے گیانی گذرے تھے۔ لیکن انھوں نے شبدوں کے موتی بیندھے تھے۔ اُن کی مالا گوندھی تھی۔ شبد بڑے شکتی وان تھے۔ انھیں دونوں گیانیوں نے ودیا اور ویاکرن کی زنجیر میں باندھ دیا۔ مگر منو نے کالے پُتلوں کے دل چھید دیئے اور ان کے ذہنوں، خیالوں، ارمانوں اور امنگوں کو قانون کی کڑی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ منو کا بان اندر کے تیر سے زیادہ مہلک اور جاں سوز نکلا۔ کالے پُتلے روندے گئے، کچلے گئے، مٹی میں ملائے گئے۔ جیتے رہے۔ مگر مقابلہ کے میدان سے بھاگ گئے۔ منو کا جادو چل گیا۔ اور کالے پُتلے گورے پُتلوں کے داس بن کر کراہتے رہے۔ منو نے کہا، کالے اسی قابل ہیں۔ پہلے جنم کے پاپ کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ کرموں کا پھل۔ شودر کو سیوا۔ برہمن کو گیان۔

——— اور دھرتی کانپتی رہی۔ جمنا روتی رہی۔ گنگا آنسو بہاتی رہی۔ پھر مہینے کے ایک دوسرے سنسار سے مدھر بانسری کی لے اُبھری۔ ہوا یہ کہ برہما اپنے خواب کے اس بھیانک حصہ سے گھبرا اُٹھا۔ اس نے ایک کالے کنہیا کو اتنی شکتی دے دی کہ وہ اپنے نغمہ کی آنچ سے سخت دلوں کو گداز بنا دے اور کالوں کا درجہ گوروں کے برابر کر دے۔ برائی سے لڑو خواہ تمھارا مخالف

کالا ہو یا گورا۔ حق و صداقت کے سوا سب کچھ ہیچ ہے۔" شیام مُرلی والے کی لے پر روح کی راؤھائیں ناچیں۔ گوپال کے ساتھ گوپیاں رقص کرتی رہیں۔ پاپ مٹتا رہا۔ جمنا آنند سے بہتی رہی۔

مگر ہائے برہما کا خواب۔ بھگوان ہمیشہ بے چین ہی رہا۔ جب سے پتلوں میں جان آئی۔ برہما کی نیند زیادہ تر کابوس ہی بنی رہی۔ کون جانے اس خواب کا انت کیا ہے۔ بھید کیا ہے! اور پھر ایسا ہوا کہ اندھیرے نے اُجالے کو شکست دے دی۔ ہمالہ نے دیکھا چو اور گھٹاٹوپ پاپ ہی پاپ تھا۔ نیکی ضمیروں میں روپوش تھی۔ راون کا راج تھا۔ دس سروں والا نہایت ہی عقل مند برہمن دانشور۔ دس گنا بڑھی مان۔ بیس ہاتھوں والا طاقتور پہلوان۔ عاقل مگر ظالم۔ دانا لیکن دنی۔ سیتائیں دکھی تھیں۔ کالے پتلے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان جیسے اور پتلے غلام بنا لئے گئے تھے۔ سیتا کے آنسوؤں نے رگھومنس کے سپوتوں کو غیرت دلائی۔ رام جہاد کے لئے نکلے۔ برہمن کے خلاف یُدھ کرنے۔ کالے پُتلوں نے ان کی مدد کی۔ کالے پتلے مہابیر تھے۔ ان کے دل اُجلے تھے۔ رام کی نگاہ نے انھیں اور اُجلا بنا دیا۔ راون، پاپی برہمن، اور اس کا سارا پاپ نذر آتش کر دیا گیا۔ نیکی ضمیروں کی پناہ گاہ سے نکل آئی۔ اور میدان عمل میں چھا گئی۔ ہمالہ نے سنا۔ راجہ رام کی جے! مہابیر کی جے! رام راج کی جے!

اور پھر ایک بار اندھکار چھا گیا۔ سپنے کے اندھیرے اُجالے! تار حریر دو رنگ! اور یہ ہوا کہ لوگوں نے سونے کے بُت بنائے اور سونے کو ہی دیوتا بنا لیا۔ پتلوں کی روحیں سونے سے مڑھ دی گئیں۔ پریم کے سوتے سوکھ گئے۔ سونے میں جکڑی ہوئی روحوں کو عیش و عشرت کے دیوتا کے سامنے سجدے کرنے پڑے۔ ہر طرف ظلم تھا، ہر سو لوٹ کھسوٹ، روحیں سونے کی قید میں گھٹتی رہیں اور بدن موٹے ہوتے رہے۔ موٹے پتلوں نے دُبلے پتلوں کو کھانا شروع کیا اور خوب موٹے ہوتے رہے۔ اچانک ہمالہ کی ایک وادی میں سونے سے مڑھی ہوئی ایک روح مضطرب ہو اُٹھی۔ روح کی آنچ سے سونا پگھلنے لگا۔ سنہرے خول کی پرتیں گرنے لگیں۔ روح آزاد ہو گئی۔ اس مہاآتما نے طلائی زنجیروں کو کاٹا اور زریں دیواروں کو ڈھا دیا۔ عظیم روح نے خواب کے پردوں کو اُٹھا کر ماورائے خواب دیکھا، جہاں دُکھ نہ تھے، بڑھاپا نہ تھا، موت نہ تھی۔ جہاں زندگی کا خواب نہ تھا، عدم کی حقیقت تھی، یزداں تھا، سچدانند تھا۔

لیکن جب عظیم روح اس سراپا بُدھ پتلے کو چھوڑ کر چلی گئی تو لوگوں نے رفتہ رفتہ خواب کی

حقیقت کو بھلا دیا اور غفلت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے صدیوں چھائے رہے۔ لمحہ کو ابد سمجھا گیا اور اس کج فہمی کے نتیجہ میں ظلم اور خون آشامی ہر طرف پھیل گئی۔ اور ہمالہ نئی صبح کے پرکاش کے انتظار میں کھڑا رہا۔ ساکت، جامد، چشم براہ!

الوہی خواب کے دھوپ چھاؤں کی ایک اور کہانی سنئے۔ یہ قصہ در قصہ ہے قصوں کے لچھے۔ خواب کی کہانی مربوط نہیں ہوتی۔ خواب منظم نہیں ہوتے۔ خواب ناک زندگی میں تنظیم و ربط نہیں۔ تراشیدگی نہیں۔ تعمیری ہم آہنگی نہیں۔ بس موج در موج کہانیاں ہی کہانیاں۔ ازل و ابد کی مرتعش لہریں۔ نشیب و فراز، رات اور دن، زوال و عروج، موت و حیات! ہمالہ نے اپنے عقب میں جھانک کر دیکھا۔

لق و دق کوہستان، صحرا، ریگستان، میدان و سبزہ زار، کاہستان و کشت زار، برفستانوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ سین وطاسین، کی دنیا، غدار دنیا۔ ہمالہ کو سکتہ سا لگ گیا۔ صرف ناک کی سیدھ میں دیکھنا کتنا پُرفریب ہوتا ہے۔ ہمالہ نے سمجھا کہ وہ تو صرف ایک بلند مینار مشاہدہ ہے۔ عالم شہود چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ وہ عالم کتنے جاہل تھے، جنھوں نے گنگ و جمن سے آگے نہیں دیکھا اور کنوئیں کو سمندر سمجھ لیا۔ برہما کا خواب جہانگیری نہیں، کائنات گیر ہے اور کائناتیں ان گنت ہیں۔ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہمالہ نے دیکھا کہ عالم شمالی بھی پتلوں سے بھرا ہوا ہے۔ زرد پتلے اور سرخ و سفید پتلے۔ ڈھال کی طرح چپٹے چہروں والے پتلے اور تلوار کی طرح تراشیدہ اور کٹیلے پتلے۔ اتری دیش میں بھی رستخیز اور لغزش و افتاد کے ہنگامے بپا تھے۔ وہاں بھی شائستہ و ناشائستہ کی جنگیں تھیں۔ وہاں بھی خون بہتے تھے۔ مگر وہاں بھی کوئی ذوالقرنین امن و سلامتی کے لئے مضبوط ظاہری و باطنی سد بناتا تھا۔ ہمالہ نے دیوارِ چین کو مڑ کر دیکھا اور اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ہمالہ نے تاؤ اور کنفیوشس کے نغمے بھی سُنے اور اس نے محسوس کیا کہ کرشن کی بانسری ہر جگہ بجتی ہے۔ رام راکشش سے ہر جگہ لڑتا ہے۔

چین کے پیلے پتلے شہد کی مکھیوں سے زیادہ محنتی اور ذہین نکلے۔ انھوں نے نئی نئی ایجادیں کیں

کیں اور تہذیب و تمدن کو کاغذ کی ایجاد سے پر لگا دیئے۔

ہالہ نے دیکھا ۔ چینی تہذیب پورب، پچھم، اُتر، دکھن تمام پھیل گئی ۔ اس سے سورج کے گھر، پوربی ٹاپو، جاپان میں بھی اُجالا ہوا اور پچھم کا لاسا گر تک سبھی دیش روشن ہوئے ۔ منچو اور منگول بھی شائستہ ہونے لگے ۔ روس کو بھی فیض پہنچا ۔ ایران و توران کے علاوہ ہندوستان نے بھی حکمتِ چین سے گیان سیکھا ۔ گیان اور عرفان ! برہما کے سپنوں کے گورکھ دھندے ! حُسن کی خود بینی ! نقاب کے اندر اپنی آئینہ داری آپ ! سپنے کے حجاب ! کبھی اپنے آپ سے بھی چھپ کر آرائشِ جمال کے لئے دز دیدہ نگاہی !

——— اور چین نے بھی ہند سے گیان سیکھا ۔ چین کا دل بھی بڑا ہے اور دماغ بھی عظیم ۔ چین نے بودھ کے پرکاش کو اپنے سینہ میں سمیٹ لیا اور اس کے ایک خاقان نے ملک کی سرحدوں سے باہر جھانکا اور دیکھا کہ برہما کے خواب کی پہنائی زمان و مکان کی حد بندیوں سے آگے ہے ۔ چین کے آگے بھی ایک بڑا چین ہے ، 'طاسین' ۔ یعنی عالم غرب میں رومتہ الکبریٰ کی عظیم قیصریت ۔

ہالہ دنیا کا بلند ترین مینار مشاہدہ ۔ ہالہ نے چین اور روما کی شہنشاہیتوں سے پہلے بھی حیرت خانۂ ہستی کو دیکھا تھا ۔ اس نے بابل و مصر کی سحر سامانیوں کا مشاہدہ بھی کیا تھا ۔ اُس نے دیکھا تھا کہ برہما کے خواب کے کئی پتلے اتنا پھولے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ساری کائنات سمجھ لیا ۔ اتنا سر اُٹھایا کہ بلا خواب و خیال پر نقش فنا ہونے کے باوجود خود کو برہما ہی سمجھ بیٹھے ۔ نمرود و فراعنہ برہما تو خود ستد رتا ہے ، روشنی ہے ، حسن کامل ہے اور حمد کامل کا مستحق ۔ وہ خود معیارِ حسن و حمد ہے ۔ لیکن اس کے خواب کے پتلے عجیب و غریب ہیں ۔ نفسی پیچیدگیوں میں مبتلا ، وہ ذہنی گتھیاں سلجھاتے ، جذباتی عقدے حل کرتے اور احساسات و حواس کی گرہیں کھولتے رہتے ہیں ۔ وہ خود مخلوقاتِ خواب ہیں اور تعبیرِ خواب میں مشغول بھی ۔ کہانیاں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں ، علوم و فنون اسی ڈھنگ سے جنم لیتے ہیں ۔

ہالہ نے دیکھا — نمرود محض نفسِ امارہ کی ایک سرکش لہر تھا اور ابراہیم نفسِ مطمئنہ کا مظہر ، برہما کا اوتار ۔ ابراہیم نے دجلہ و فرات کی وادی میں اُبھرنے والے پتلوں کے نفسِ لوامہ کو بیدار کر

کہ انھیں آزادی اور جنت کی راہ دکھانی چاہی - ابراہیم بہت ہی پیارا، بہت پیار کرنے والا، نہایت مخلص، بڑا ذہین اور مستقل مزاج تھا۔

ابراہیمؑ کی چار کتھائیں - وہ سندرتا اور سچائی کا کھوجی تھا - اس کے دیس والے چاند تاروں اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔ مگر اُس کی نظر ستاروں سے آگے دیکھتی تھی - آئینہ کو نہیں، محبوب کو دیکھتی تھی۔ ٹمٹماتے ہوئے تاروں نے اسے اشارے کیے - وہ پیارے پیارے، اونچے اور چمکیلے تھے - ابراہیمؑ نے محسوس کیا کہ یہ بہتوں کا دل موہ لیں گے - مگر اس کی ذہانت نے پایا کہ ان کی روشنی کامل نہیں - چاند نے جب اپنی جوت جگائی تو تارے ماند پڑ گئے۔ چاندنی کا جادو چل گیا - ابراہیم کے ذہن نے سوچا کہ یہ بھی حسن سرِ راہ گذر کا فریب ہے اور حسین فریب چل جاتے ہیں - ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسی دمکتے ہوئے چاند کو لوگ حقیقت منتظر سمجھ بیٹھیں - لیکن چاند کی چاندنی بھی ماند پڑ گئیں - اور اس کی تنک تابی نے مہرِ درخشاں کا پیام دیا - آفتاب نکلا اور باآب و تاب نکلا - اس کی جہاں تابی خیرہ کن تھی - حرارت و حیات کا منبع سورج ؛ ابراہیم کے فکر نے پرواز کی - اسے خیال آیا کہ نارسا ذہن چڑھتے ہوئے سورج کے سامنے سپر نوا بیٹھیں گے۔

اس نے سوچا کہ شکر ہے سورج ڈوبتا بھی ہے، وہ حاضر و ناظر نہیں، وہ مجبورِ زوال ہے - وہ سرچشمۂ قوت و حیات کس طرح ہو سکتا ہے ؟ ابراہیم کے ذہنِ رسا، فکرِ بلند اور نگاہِ دور بیں نے نور الانوار کو حجاباتِ نور کے اندر دیکھ لیا - اور اس کی روح رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔

ابراہیمؑ ایک دانشور تھا - وہ ذوقِ سلیم اور مذاقِ لطیف رکھنے والا بھی تھا - اس کی حکیمانہ باتوں میں مزاح و طنز کا عنصر پایا جاتا تھا - اس کا گھر صنم سازوں کا خانوادہ تھا - اس نے بکری کے دیوتا دیکھے اور ہنس پڑا - ایک دن اُس نے چند چھوٹے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا - دیوتا کی دوکان میں خلفشار رچا - دیوتا کو کس نے توڑا؟ ابراہیمؑ خاموش تھا - لوگوں نے کہا، اسی نے بت شکنی کی ہو گی - اس کے ایسے چھچھن ہیں - گھر کے بزرگوں نے ڈانٹ کر پوچھا - ابراہیم نے ہنس کر جواب دیا : "بڑے بُت سے پوچھ لو، اسی دیوتا نے چھوٹے دیوتاؤں کو بھسم کر دیا ہو گا!" سب لاجواب ہو گئے۔ گونگے اور بے بس دیوتاؤں کی کثرت کتنی مضحکہ خیز چیز ہے!

پہلے ابراہیم کا دماغ جاگا اور پھر اس کا دل بیدار ہوا اور تیسری کتھا میں اس کے ہردے کی جاگ کی کہانی ہے۔

——— اور ابراہیم نے اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہا۔ وہ حیات و موت کے راز جانتا تھا۔ وہ ابدی زندگی کی فکری حقیقت سے واقف تھا۔ لیکن حقائق جب تک واردات نہ بن جائیں بے جان رہتے ہیں۔ ابراہیم کی آتما نے برہما سے پوچھا۔ "اے برہما! تو نے بسرشٹی کو رچا، تو خالق اکبر ہے۔ بتا! موت کے بعد تو کس طرح زندگی تو عطا فرمائے گا؟" برہما نے جواب دیا۔ "میں پرماتما ہوں۔ آتماؤں اور پرماتما کے درمیان پریم کا سمبندھ ہے۔ پریم کی ڈور میں بندھی ہوئی ساری روحیں میری طرف کھنچی آئیں گی اور مجھ میں حیاتِ تازہ پائیں گی۔" ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ چند پرندے پالے، انھیں کھلائے پلائے، سدھائے اور ان سے پیار کرے۔ جب پرندے اس سے ہل مل گئے، تو حکم ہوا کہ انھیں دور پہاڑوں پر چرنے چگنے کے لیے چھوڑ آؤ۔ ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ پھر حکم ہوا کہ انھیں چمکار کر آواز دو۔ پرندے بیتابانہ اس کی آواز سن کر دوڑے ہوئے آئے، اور ابراہیم کے دل کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اس کے ہردے میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس دنیا میں مردہ روحیں محبت سے ہی نئی زندگی پا سکتی ہیں۔ اور اس عالم میں بھی یہی محبت کی بجلی انھیں جی اٹھنے کے قابل بنا دے گی۔ عشق حیاتِ عالم ہے۔ محبت روحِ کائنات ہے۔

اور ابراہیم کی چوتھی کتھا شروع ہوتی ہے۔ ابراہیم حنیف کا دل گہوارۂ محبت بن گیا تھا مگر ——— ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں ——— علم بھی آگ ہے اور جہالت بھی آگ۔ محبت بھی آگ ہے اور نفرت بھی آگ۔ علم اور عشق آتش روشن ہیں اور جہل و نفرت آتش تاریک۔ آگ آگ کو جلا نہیں سکتی۔ مگر روشن آگ تاریک آگ کی ظلمتوں کو دور کر سکتی ہے۔ ابراہیم کے دل میں شعلۂ عشق بھڑک رہا تھا۔ جاہلوں نے اسے اپنی مخالفت اور نفرت کی سیاہ آگ میں جلانا چاہا۔ مگر ابراہیم کو یہ کالی ناگن ڈس نہ سکی۔ آگ ٹھنڈی ہو گئی اور ابراہیم کے لئے سلامتی ہی سلامتی تھی۔ محبت سلامتی ہے! محبت امن ہے! محبت حیات ہے۔!

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور ہمالہ نے دیکھا! نسل ابراہیمی نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ فرات پھیل گئی اور پھیلتی ہی چلی گئی۔

آلِ ابراہیم؟ ——— جیسے سمندر کی لہریں! ———
آلِ ابراہیم؟ ——— جیسے ریگستان کے ذرے! ———
آلِ ابراہیم؟ ——— جیسے آکاش کے تارے! ———

اور ہمالہ نے دیکھا! ابراہیم کی مشعل جلتی ہی رہی۔ اندھیرے شکست کھاتے ہی رہے۔ محبت مردوں کو زندہ کرتی ہی رہی۔ ابراہیم کی محبت یوسف کے حسن میں چمکی اور اس نے مصر کو نظام دیا۔ ابراہیم کا عشقِ موسیٰ کے یدِ بیضا میں تاباں ہوا اور اہرام سجدہ ریز ہو گئے۔ ابوالہول سکتہ میں آگیا۔ مصر کے پتلے ابدیت کی تلاش میں، اپنی لاشوں کو حنوط شدہ بناتے رہے۔ لیکن ان کی روحیں اہرام کے ظالمانہ بوجھ تلے سسکتی ہی رہیں۔ موسیٰ نے کہا! حیات اہرام مصری میں نہیں، زندگی سحر سامری میں نہیں، ضرب عشق میں ہے، عمل پیہم میں ہے۔ موسیٰ نے حسن کی آگ کو بر طور روشن دیکھا اور اس کے جلووں سے اپنے دل کو معمور کرلیا۔ اس نے اسی آگ سے ایک مردہ قوم کو زندہ کردیا اور اہرام مصر کی بلندیاں غرقِ نیل ہو گئیں۔

——— اور ہمالہ نے دیکھا: ابدیت حنوط شدہ لاشوں میں نہیں، سقراط کے زہر پینے میں ہے۔ حسن صداقت ہے، محبت حقیقت ہے۔ محبت نہ آگ میں جلتی ہے، نہ زہر سے مرتی ہے۔ محبت، حسن اور صداقت ابدی ہیں۔ خواب کے پتلے فانی ہیں۔ حقیقت، اور ابدیت ماورائے خواب ہیں۔ یہ تو عشق کی جرأتِ رندانہ ہے، جو سارے پردے اٹھا کر، برہما کے خواب میں رخنے ڈال کر، ماورائے خواب ابدیت کو جھانک کر دیکھ لیتی ہے۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، سقراط، کرشن، رام اور بدھ نے برہما کے خواب کے گورکھ دھندے سے آگے برہما کے پردے کو دیکھ لیا اور وہیں ابدیت تھی، حُسن تھا، عشق تھا۔ مگر ابھی برہما کے خواب کا ارتقاع باقی تھا۔ وہ دَور بھی آیا جب خواب کے ایک پتلے نے برہما کے دل میں جگہ پائی۔ آہ! برہما کے خواب کی پُرپیچ راہیں! اس مقامِ معراج کے پہلے بھی صلیب اور بعد بھی صلیب! خواب کے پتلوں کا راستہ پُرخار و پُرخوں ہے۔ برہما خود نرکامل ہے۔ لیکن وہ ناتمامی کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ اور داغ دورِ ناتمامی کو مٹانے کے لئے

آرزومندانہ طور پر یہی یہیم بھی کرتا رہتا ہے۔ وہ فانی پتیلوں کی بندگی کے دردِ جگر کا درماں بھی پیدا کرتا ہے اور کبھی دردِ لادوا بھی بخشتا ہے۔ وہ خواب وجود میں اہرمن آفرینی کرتا ہے۔ اور پھر اہرمن شکاری بھی۔ غالب و قادر ہونے کا احساس و اظہار اسی طرح ہوتا ہے۔ ناکامل کو کامل بنانے اور شیطان کو شکست دینے میں اسے لذت ملتی ہے۔ مگر حقیقت تو صرف یزداں کی ہے۔ حسرتیں تو اس کی خواب ہی میں پوری ہوتی ہیں۔ آرزومندانہ خواب! جاگتے ہوئے تو اسے شعورِ کمال اور کمالِ شعور حاصل ہوتا ہے۔ یزداں اپنے اوپر خواب طاری کرتا ہے۔ وہ روزہ رکھ لیتا ہے تاکہ افطار کر کے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک نئے پہلو سے اظہار کرے۔ خواب میں اس کی حسرتیں جاگتی اور پوری ہوتی ہیں۔ وہ پتیلوں کی تکمیل کے لئے کڑھتا ہے اور کس حسرت سے کہتا ہے:

تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے؟ بیداری میں بر تماما ورائے حسرت و ارمان ہے۔ اَحد ہے، صمد ہے۔ اس کے جلوۂ احدیت کی کسے تاب ہے! نہ کائنات کو، نہ فطرت کو، نہ حیات کو — !

— اور رہاکہ نے دیکھا:

موسیٰؑ نے غلام بنی اسرائیل کو ظالم فرعونوں کے پنجہ سے نجات دلائی۔ سمندر شق ہوا اور موسیٰ کی بھیڑیں سلامت نکل گئیں۔ مگر فرعون اور اس کے لشکر کو بحر احمر نے نگل لیا۔ موسیٰ صحراؤں میں تعمیرِ ملت کرتا رہا اور یونانی، رومی، مصری، عاشوری، بابلی، کلدانی، میدی اور ایرانی دستِ قدرت کی عجوبہ کاریاں حیرت سے دیکھتے رہے۔ اور موسیٰ نے کہا: قیدار کے خیموں میں بھی زندگی دوڑے گی، صحرائے عرب میں بھی قیامت آئے گی اور میرے بھائیوں میں سے خدا مجھ سا ایک نبی پیدا کریگا۔" خدا فاران سے طلوع ہوا اور شعیر پر چمکا۔ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور ایک آتشیں شریعت لایا۔ اور موسیٰ کے دوسرے خلیفہ یوشع بن نون کو یہوواہ نے ارضِ موعود عطا کر دیا۔ کیونکہ وہ اسرائیل اور ابراہیم کا خدا تھا۔ اس کے حمد میں داؤدؑ نے نغمے گائے۔

زمین رب العزت کی ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسی کا ہے۔ ساری دنیا اور اس کے تمام باشندے اسی کے ہیں .... اے پھاٹکو کھل جاؤ اور اے ابدی دروازو، وا ہو جاؤ۔

وہ صاحبِ جلال و جبروت بادشاہ آرہا ہے۔ یہ ملک ذوالجلال کون ہے؟ رب العزت، قوی و عزیز،

جنگ میں غالب، رب الافواج!

اور داؤدؑ کے بیٹے سلیمان نے میراث داؤد کو مستحکم بنایا اور یروشلم میں ہیکل تعمیر کیا۔

اس نے حسنِ منتظر محبوب خدا کو کشف میں دیکھا اور اس کی نعت میں نغمۂ نغمات پیش کیا۔

میرے محبوب، تو سراپا حسن ہے، بے داغ! ایک محفوظ باغ، ایک مستور چشمۂ صفائی، ایک مختوم فوارہ!

میرا محبوب سرخ و سفید ہے۔ وہ دس ہزار اصحاب کے درمیان سربلند ہے۔ اس کے لب و دہن شیریں ہیں۔ محمدیم، سراپا حسن و توصیف! یہی میرا محبوب ہے، یہی میرا دوست ہے۔ اے یروشلم کے بیٹیو!

——— اور پھر خطاکاروں اور فاسقوں نے یروشلم کے تقدس کو اپنے گھناؤنے اعمال سے گرد آلود کر دیا۔ ارض موعود بنیوں کی پاک سرزمین ٹکڑے ٹکڑے ہوئی۔ یروشلم کا دودھ خشک ہو گیا۔ یہودا کے باغہائے زیتون و نارنج ویران ہو گئے۔ صیہون کی پہاڑیاں سخت اور چٹیل ہو گئیں۔ اور اسرائیل اغیار کے قدموں تلے روندا گیا۔

یسعیاہ نبی نے کشف میں دیکھا:

بیل بھی اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا بھی اپنے آقا کو جانتا ہے۔ مگر بنی اسرائیل نہیں شناخت کرتے۔ انھوں نے رب العالمین کو بھلا دیا اور اس کے غضب کو بھڑکایا۔ یہودا نے اپنی محبوب قوم کو ایک انگوری باغ دیا اور اسے ثمر ور بلندی پر قائم کیا۔ اسے دیواروں سے محفوظ بنایا گیا۔ اس میں اعلیٰ قسم کے انگور کی بیلیں لگائی گئیں اور نفیس انگوری شراب نچوڑنے کی بھٹی تعمیر کی گئی۔ توقع تھی کہ اس باغ میں اعلیٰ درجہ کے انگور پھلیں گے۔ لیکن اس میں جنگلی کھٹے انگور لگنے لگے۔ آخر ش باغ سے حفاظت کی جھاڑیاں کاٹ دی گئیں اور چاردیواری کی دیواریں ڈھا دی گئیں۔ جانوروں نے بیلیں چر لیں اور کیاریوں کو روند دیا۔ باغ ویران ہو گیا۔ اس میں خاردار جھاڑیاں اور کانٹے اُگنے لگے۔ یہودا نے بادلوں کو حکم دیا کہ اس باغ پر اب نہ برسیں۔ اور جانتے ہو رب الافواج کا انگوری باغ کیا تھا؟ خانوادۂ اسرائیل، اور یہودا کے لوگ اس کے پودے تھے۔ اور ان پودوں نے ناحق بغاوت کی، قانون کو توڑا، سبت کے دن کا احترام نہ کیا،

توبہ کی اور پھر اُسے فراموش کر دیا۔ یہاں تک کہ یہوداہ کا جلال ظاہر ہوا اور اس نے بنی اسرائیل کو عاشوریوں کا شکار بنا دیا۔ بے انصاف خاکی پتلوں کا انجام! محتاجوں کو رد کرنے والے، اور یتیموں کو لوٹنے والے عاشوری، خدا کے غضب کی لاٹھی، اس کی ناراضگی کا ڈنڈا!

فتنۂ عاشور سے بچے کچھے لوگ معاف کر دیئے گئے۔ ان کی اصلاح ہو گئی۔ اور ان میں

منصف، زمین، دور بین اور خدا ترس فرماں روا پیدا ہوئے۔ یہوداہ تعریف کا مستحق ہے۔ وہی نغمۂ مسرت ہے، وہی راہِ نجات ہے! عاشوری طاقت توڑ دی گئی۔ مگر آلِ اسرائیل پھر بگڑ گئے۔

اُسے باب یروشلم زاری کر! اے شہر رو! اے فلسطین تو برباد ہو گیا۔!

کبھی عاشوریوں اور مصریوں میں جنگ ہوئی اور کبھی صلح۔ فلسطین مرکزی حیثیت سے پھلا پھولا اور پھر اپنی خطاؤں کی آگ میں آپ جل گیا۔

ہمالہ نے سنا!

یسعیاہ اور یرمیاہ نے اسرائیل، یہوداہ اور صیہون کو نصیحتیں کیں۔ ان نبیوں نے یروشلم کو ڈرایا، مگر متکبر گردنیں نہیں جھکیں، سخت دل نہیں پگھلے۔ یہوداہ نے کہا:

"پس میں اس سرزمین سے تمہیں نکال باہر کروں گا۔ اور بیگانہ علاقوں میں تم غلامانہ زندگی بسر کرو گے۔ بھیڑیے آئیں گے اور تمہیں پکڑ لے جائیں گے۔ شکاری حملہ آور ہوں گے اور تمہیں نشانہ بنائیں گے۔ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں نے زمین و آسمان بنائے ہیں۔ میں سارے آدمیوں اور تمام مخلوقات کا خالق ہوں۔ میں اپنی قدرتِ کاملہ اور وسیع اختیارات کے تحت جسے چاہتا ہوں، زمین کا وارث بناتا ہوں۔ اور اب میں نے ارضِ فلسطین اور بہت سارے ملک بخت نصر شاہ بابل کو عطا کر دیئے۔ بادشاہوں اور قوموں کو اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ آلِ اسرائیل اسیر کیے جائیں گے اور بابل کی غلامی کریں گے۔ تا آنکہ ستر سالہ مدت پوری ہو جائے گی اور پھر میں ان کی رستگاری کی طرف متوجہ ہوں گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ یہودیوں کا بادشاہ صدقیاہ اپنی تمام قوم کے ساتھ مفتوح اور اسیر ہوا اور پابہ زنجیر بابل کو لے جایا گیا۔ یہود نے اخوت، مساوات اور آزادی کی تعلیم کو بھلایا۔ اپنے بھائی اپنے ہمسایہ اور یہوداہ کے کمزور غریب و محتاج بندوں کا حق ادا نہ کیا۔ یہوداہ کا غضب بھڑکا اور

اب اس نے تلوار، وبا اور قحط کو آزادی دے دی کہ وہ اسرائیل کی فربہ بھیڑوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

بخت نصر نے ایک خواب دیکھا اور اسے بھول گیا۔ اس نے اپنے وزیر دانا کو بلایا اور حکم دیا کہ مملکت کے سارے کاہنوں، ربانوں، ساحروں، نجومیوں، فلسفیوں، مذہبی پیشواؤں اور عالموں کو بلاؤ۔ اگر وہ بھولا ہوا خواب نہ یاد دلا سکیں اور اس کی تعبیر نہ سنائیں تو سب کے سر قلم کر دو۔

سلطنت بھر میں سنسنی اور خوف پھیل گیا۔ لوگ دانیال کے پاس آئے اور یہ وحشت ناک خبر سنائی۔ دانیال بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے تعبیر خواب کے لئے وقت مانگا۔ سارے عقلا اپنے عجز کا اعلان اور اپنی بے بسی کا اقرار کر چکے تھے۔ بادشاہ نے دانیال کو مہلت دے دی۔

دانیال اپنے گھر واپس لوٹا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ ماجرا کہہ سنایا۔ ان سبھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خدائے ارض و سما کے آگے سجدہ ریز ہو کر دعائیں اور التجائیں کریں گے تاکہ وہ علیم و قدیر اس بھید سے انھیں آشنا کر دے اور ان سب کی جانیں بچ جائیں۔ آخرش اللہ تعالیٰ نے دانیال پر اس راز کو منکشف کر دیا۔ اس نے خدائے بزرگ و برتر کی تحمید و توصیف کی اور اسکا شکر ادا کیا۔ پھر دانیال بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی: "اے شہنشاہ! جس بھید کا پتہ عقلا نہ پا سکے اس بھید سے خداوند عرش نے مجھے آگاہ کر دیا ہے تاکہ میں عالی جاہ کے حضور خواب اور تعبیر خواب دونوں بیان کروں۔ وہی صاحب عرش و کرسی علام الغیوب ہے۔ وہی اپنے بندوں پر رازہائے سربستہ کا انکشاف فرماتا ہے۔"

"اے شہنشاہ! حضور والا نے خواب میں ایک عظیم الجثہ مجسمہ دیکھا۔ یہ تاباں اور مہیب پیکر حضور کے سامنے استادہ نظر آیا۔ اس کا سر خالص سونے کا تھا۔ سینہ اور بازو چاندی کے تھے۔ پیٹ اور رانیں پیتل کے۔ ٹانگیں لوہے کی اور پاؤں لوہا اور مٹی کے آمیزہ کے بنے تھے۔ حضور عالی اسے دیکھتے رہے۔ تاآنکہ ایک پتھر بغیر کسی ہاتھ کی مدد کے پہاڑوں سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا اور بت کے پاؤں پر دے مارا گیا۔ پاؤں چکنا چور ہو گئے۔ پھر سارا بت ریزہ ریزہ کر دیا گیا اور بھس بنا کر اڑا دیا گیا۔ اور جس پتھر نے مجسمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا وہ بہت بڑا پہاڑ بن گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام روئے زمین پر وہ پھیل گیا ہے۔

یہ تو جناب والا کا خواب ہوا اور اب میں اس کی تعبیر عرض کرتا ہوں۔

"اے بادشاہ! آپ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں۔ خدائے عرش نے حضور عالی کو سلطنتِ عظیم، اقتدار اعلیٰ اور قوت و جبروت کی نعمتیں بخشی ہیں۔ حضور اس شہنشاہیت عظمیٰ کے فرق زریں

ہیں۔ حضورِ عالی کے بعد اور حکومتیں ہوں گی، جن کی مثال چاندی کی ہے۔ وہ حضورِ والا کی سلطنت سے فروتر ہوں گی۔ بعد ازاں تیسری حکومت پیتل کی مانند ہوگی۔ چوتھی لوہے کی طرح مضبوط ہوگی۔ دوسروں کو توڑے گی اور جب خود ٹوٹے گی تو اپنا ہاتھ آپ مجروح کرے گی۔ اور پایان کار پانچویں حکومت آئے گی۔ یہ بٹی ہوئی ہوگی، کچھ کمزور کچھ مضبوط۔ منظم و مربوط نہ ہوگی۔ اس دورِ آخر میں غیب کا ہاتھ ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالے گا اور اسے مستحکم و طاقت ور بنائے گا۔ وہ ساری حکومتوں کا خاتمہ کرنے والی حکومت ہوگی اور زمانۂ دراز تک قائم رہے گی۔ خدائے ذوالجلال نے بادشاہ کو مستقبل کی خبر دی ہے۔ اور حضور کو بتایا ہے کہ سلطنت بابل کا انجام کیا ہوگا۔ یہ سچے خواب کی سچی تعبیر ہے۔"

بادشاہ نے اقرار کیا کہ اس نے یہی خواب دیکھا تھا اور کہا۔ "بے شک تمھارا رب رب الارباب اور ملک الملوک ہے۔ وہ علام الغیوب اور کاشف الحقائق ہے۔"

بخت نصر دانیال پر مہربان ہوا۔ اس نے خدا کے پیارے کی قدر کی تو خدا نے اس پر رحم کیا۔ ایسا ہوا کہ اس سے سلطنت چھن گئی مگر خدائے غالب نے بخت نصر کو پھر تاج و تخت دلوا دیئے اور دانیال نے ایک اور رویا دیکھی۔

دانیال نے دیکھا کہ وہ دریائے اولائی کے کنارے پر ہے۔ سامنے ایک دو سینگوں والا مینڈھا کھڑا ہے۔ سینگ بہت بڑے بڑے ہیں۔ لیکن ایک نسبتاً چھوٹا ہے۔ پہلے چھوٹا سینگ سامنے آتا ہے پھر بڑا سینگ۔ مینڈھا مغرب، شمال اور جنوب کی طرف سر مارتا ہے، کوئی جانور اس کے مقابلے کی تاب نہیں لاتا اور کسی کو اس سے نجات نہیں ملتی۔ وہ اپنی من مانی کرتا جاتا ہے اور بڑا بنتا جاتا ہے۔ اچانک ایک بکرا مغرب سے آنکلا اور تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ اس کی آنکھوں کے بیچ میں ایک بڑا سا سینگ نمایاں تھا۔ بکرا مینڈھے پر غضب ناک ہو کر حملہ آور ہوا، اس نے مینڈھے کے دونوں سینگ توڑ دیئے، اسے زمین پر دے مارا اور پاؤں سے خوب روندا۔ بس بکرا بہت عظیم الشان بن گیا اور ابھی وہ طاقت ور تھا ہی کہ اس کا سینگ ٹوٹ گیا۔ پھر چار اور سینگ نکل آئے۔ ان میں سے ایک سینگ کے اندر ایک اور چھوٹا سا سینگ پھوٹا اور بہت بڑا ہوتا گیا۔ یہ جنوب کی جانب، مشرق کی جانب اور "ارضِ نشاط خیز" کی طرف بڑھتا

رہا اور رفتہ رفتہ بہت عظیم الشان بن گیا اور آسمان تک جا پہنچا۔ یہاں تک کہ اس نے چند مخلوقات سماوی اور چند تاروں کو زمین پر گرا لیا۔ اور انھیں پاؤں تلے روندا۔ اس نے اپنی کبریائی کا دعویٰ کیا اور آسمانی بادشاہت کے شہزادے پر حملہ آور ہوا، عبادات کو بند کیا اور مقدس مقامات کو مٹایا۔ اس کے اندر ظالم افواج کی طاقت تھی۔ دانیال کو پھر مکاشفہ ہوا۔ اس نے مقدس ارواح کی باتیں سنیں اور اسے خواب کی تعبیر بتائی گئی۔

اسے معلوم ہوا کہ آخری زمانہ کے اس فتنۂ عظیم سے مکمل رستگاری دو ہزار تین سو سال کے بعد ہوگی۔ جبریل نے بتایا کہ مینڈھے اور اس کے دو سینگوں سے مراد ہے میڈیا اور فارس کے بادشاہ اور بکرے سے مراد ہے یونان کے بادشاہ۔ دونوں آنکھوں کے درمیان والے طاقت ور سینگ کا مطلب یہ ہے کہ یونان کا پہلا شہنشاہ عظیم طاقتوں والا ہوگا۔ چار سینگوں کی تعبیر ہے چار سلطنتیں جو یونانی تہذیب کی پروردہ ہوں گی، مگر پہلی شہنشاہیت سے کمزور ہوں گی۔ اور مغربی یونانی تہذیب کے دورِ آخر میں دجل و ظلم کی انتہا ہوگی اور ان میں ایک مہیب بادشاہ پیدا ہوگا۔ اس کے تاریک عقائد ہوں گے۔ وہ قوت و جبروت کا مالک ہوگا۔ تخریب کا دیوتا بن جائے گا۔ مضبوط اور مذہبی لوگوں سے دشمنی کرے گا۔ اس کے نظام کی ترقی سے صنعت و حرفت کو بڑا فروغ حاصل ہوگا۔ وہ امن کا نام لے کر لوگوں کو تباہ کرے گا۔ اور روحانی شہزادہ شہزدگان کے خلاف کھڑا ہوگا۔ آخر ش کرامات کے ذریعہ وہ توڑا جائے گا۔

دانیال کو شمال اور جنوب کے مختلف بادشاہوں اور سلطنتوں کے درمیان جنگوں کا ایک سلسلہ کشف کے ذریعہ دکھایا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ سلسلہ آخری زمانہ تک پھیلتا جائے گا۔ تا آں کہ شمال کی سلطنت میں ایک آمرِ مطلق رونما ہوگا۔ وہ ساری پرستیدہ ہستیوں سے اپنے کو بلند و بالا قرار دے گا اور رب الارباب کے خلاف حیرت ناک باتیں کرے گا۔ وہ اپنے آبائی مذہب کا انکار کرے گا اور کسی ماورائی طاقت کا قائل نہ ہوگا۔ لیکن اپنی مملکت میں وہ طاقت کے دیوتا کی عبادت کرے گا۔ اور بالکل نئے تصورات کی پوجا میں لگ جائے گا۔ قوت و جبروت، چاندی اور سونا، اور مادی لذات کو اپنا معبود بنائے گا۔ وہ منفعت کے لئے زمینوں کی تقسیم کرے گا اور بہتیری قوموں پر جابرانہ حکومت کرے گا۔ جنوب کے بادشاہ سے اس کی لڑائی ہوگی اور اہلِ

جنوب پر وہ طوفان کی طرح چھا جائے گا اور ارضِ مقدس تک جا پہنچے گا۔ مصر کے خزائن پر بھی اسے قدرت حاصل ہوگی۔ اچانک شمال اور مشرق سے اس کے لئے بری خبریں آئیں گی اور اسے اپنے علاقہ کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ آخرالامر وہ تباہ کر دیا جائے گا اور بے یار و مددگار اپنے برے انجام کو پہنچے گا۔

خواب کے پتلے بھی خواب دیکھتے ہیں۔ یہ سارے سپنے برہما کے من کی موجیں ہیں۔ یہی من موجی سپنے حقیقت کا روپ دھارتے رہتے ہیں۔ سپنے بھی اسی کے، سپنوں کا دیس بھی اسی کا سپنوں کے پتلے بھی اسی کے۔ اور تعبیریں بھی اسی کی۔!

ہماؔ نے دیکھا: آخرش میڈیا اور فارس کا بادشاہ خورس اعظم ذوالقرنین یعنی دو سینگوں والا مینڈھا بنا اور اس نے مشرق و مغرب میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ اسی کے ہاتھوں بابل کی سلطنت برباد ہوئی اور آلِ اسرائیل اسیری سے آزاد ہوئے اور یروشلم پھر آزاد ہوا۔ فارس کی طاقت کو سکندر یونانی نے پاش پاش کر دیا۔ بکرے نے مینڈھے کو مار گرایا۔ سکندر یونان کے مرکزی سینگ نے دارا کی دارائی توڑی مگر ایام شباب میں ہی اکھڑ گیا۔

ہماؔ نے دیکھا:

ستر سال کے بعد آلِ اسرائیل کو بابل کی قید سے رستگاری حاصل ہوئی اور یہوداہ یروشلم میں واپس آیا۔ دخترانِ صیہون نے خوشیاں منائیں اور رقص کناں ہوئیں۔ ذکریا اور یحییٰ نبی کی دعاؤں کے سایہ میں بنی اسرائیل پھر پروان چڑھنے لگا۔ کچھ دنوں بعد یہودیوں نے پھر شریعت کی بے حرمتی کی۔ علماءِ یہود بھی بگڑ گئے۔ وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے اور ان کے ہاتھوں قوانین توریت کی مٹی پلید ہوئی۔ آخرش یہوداؔ نے ان کو بھی رسوائے عالم کر دیا۔ رومی شہنشاہوں نے انھیں کچلا اور ان کی فوجوں نے انھیں پاؤں تلے روندا۔ بنی اسرائیل اپنے گھر میں اسیر ہو گئے۔ غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی گئی۔ خدا کی رحمت جوش میں آئی اور آلِ اسرائیل کی حیاتِ تلخ کی شام کے وقت اچانک روشنی ہوئی اور صدق و محبت کا ستارہ طلوع ہوا۔ رومی بادشاہ ہیروڈ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اس کے ہوش اڑ گئے۔ یہودیوں کا بادشاہ پیدا ہوا۔ بپتسمہ دینے والے جون نے اعلانِ عام کیا کہ آسمانی بادشاہت قریب ہے۔ توبہ کرو تا کہ بخشے جاؤ۔ صحرا بہ صحرا اس مردِ خدا نے منادی کی اور شہزادہ امن کے لئے راستہ صاف کئے۔ عیسیٰ مسیح کا نزول ہوا۔ آسمانوں کے دروازے

کھل گئے۔ اور روحِ سماوی فاختہ کی شکل میں اس پر نازل ہوئی۔ خدا کے اس پیارے نے یہودیوں کو درسِ محبت اور دعوتِ اخلاص دی۔ اُس نے فقیہوں اور فریسیوں کو ظاہر داری اور مکاری سے روکا۔ اور بد یقینیوں اور بدبختیوں کو مادہ پرستی اور سنگ دلی پر ٹوکا۔ اُس نے بتایا کہ انسان روٹی کے سہارے نہیں بلکہ محض خدا کے فضل سے جیتا ہے۔

عیسیٰ نے کہا:

برکت والے ہیں عاجزی کرنے والے، کیوں کہ وہی زمین کے اصلی وارث ہیں —

— برکت والے ہیں رحم دل کہ اُن پر ہی رحم کیا جائے گا۔

برکت ہوئی مخلصوں پر کہ وہی خدا کا دیدار کریں گے

صاحبِ برکت ہیں اہلِ صلح کہ وہی خدا کی اولاد کہلائیں گے

برکت والے ہیں وہ جنھیں صداقت کی خاطر ظلم وستم سہنا پڑے، کہ وہی آسمانی بادشاہت میں داخل ہوں گے۔ اے مظلومو! تم زمین کا نمک ہو۔ دیکھو اپنے مزے اور مزاج کو قائم رکھو۔ تم اگر بدمزہ ہوئے تو تمھاری بدنمکی بھلا کون دور کرے گا۔

تم سارے جہان کی روشنی ہو۔ اپنے نور کو مینارِ روشنی کی طرح سربلند و باقی رکھو!

اے لوگو! تم کامل بنو۔ جیسے تمھارا آسمانی باپ کامل ہے۔

مگر افسوس! یروشلم نے اس کی نہ سُنی اور بُرا درخت بُرا ہی پھل لایا۔

بدبخت یہودی نے ہیرے کو پتھر سے توڑا اور امن ومحبت کی روح کو سولی پر چڑھوایا۔ کون گنہگار تھا۔ رومی گورنر پائلٹ یا لانبی داڑھیوں والے شقی القلب یہودی علماء وفقہا؟

ارض وسماء کانپ اُٹھے۔ روحِ محبت صلیب پر سے پکاری: ایلی! ایلی! لما سبقتنی؟ اے میرے خدا! اے میرے خدا۔ تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا؟ طور کی چٹانیں پھٹ پڑیں، ہمالہ کی بلندیاں لرزیں۔

خدا نے اپنے پیارے کو نہیں چھوڑا ۔ مگر اُسے آزمائش کا تلخ پیالہ پینا پڑا ۔ اس کی نشاۃ الثانیہ ہوئی اور پھر وہ اپنے گیارہ حواریوں سے جھیل گلیلی کے کنارے ملا ۔ بعض نے اس کی حیات نو پر شک کیا عیسیٰ نے انھیں نصیحت کی کہا !

ساری قدرت مالک ہی ہے ۔ اسی نے مجھے زمین و آسمان کی طاقتیں بخشی ہیں ۔ بخت دلی اور بے یقینی کی عادتیں ترک کرو اور جاؤ قوموں کو تعلیم دو اور اُن کے لیے برکت کے دروازے کھولو ۔ بعد ازاں وہ بادلوں میں غائب ہو گیا ۔

یہودیوں پر خدا کا غضب بھڑکا اور وہ ذلیل بندر بنا دیئے گئے ۔ انگوری باغ کے مالک نے یہ امانت اُن سے چھین لی اور اس باغ کی نعمت دوسرے مالیوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا ۔ اسرائیل کا درخت بے ثمر کاٹا گیا ۔ فلسطین برباد ہوا اور رومیوں نے بدخصائل غلاموں کو سارے عالم میں رسوا ہونے کے لئے بکھیر دیا ۔ داؤد کی پیش گوئی کا ایک حصہ پورا ہوا اور دوبارہ آخر تک کے لئے اسرائیل کی سلطنت نابود ہو گئی ۔

ہمالہ کی بلند چوٹیوں نے ابنِ آدم کی بے قرار دعاؤں کی گونج سنی تھی ۔ وہ اپنے آسمانی باپ سے رو رو کر دُعائیں کرتا تھا چشموں کے کنارے ، خاموش وادیوں میں ، بلند پہاڑوں پر مقام بہ مقام ، گام بہ گام ۔ ولی طوما اُنھیں دُعاؤں کی بازگشت سُن کر اپنے آقا کی تلاش میں دیارِ ہند میں آیا ۔

آسمانی باپ نے ابنِ آدم کو برکتوں پر برکتیں دیں اور مشرق و مغرب میں اس کی امت پر روحانی اور مادی نعمتیں نازل کیں ۔ اصحاب کہف اور صاحبانِ رقیم کبھو کے شیروں کے سامنے ڈالے گئے ۔ ریچھوں نے انھیں پھاڑ کھایا ۔ سیافون نے تالیاں بجانے والے درندہ صفت رُومی تماش بینوں کے سامنے اُن کا خون بہایا ۔ اُن کی تکا بوٹی کی ، مگر وہ کانٹوں کا تاج پہننے والے مصلوب بندہ خدا کی سچائی کا اور آسمانی باپ کے وجود کا برملا اقرار و اعلان کرتے رہے ۔ وفاداروں نے انعامِ وفا پایا ۔

بھگوان کی لیلا عجیب ! اس کے سپنے نرالے ! ایشیا کے ایک شہید نے اپنے خون سے یورپ کی سرزمین کو سینچا ۔ لیکن ہمالہ نے دیکھا کہ عیسیٰ کو اپولو کے مندر میں بٹھا دیا گیا ۔ صلیب کا خون

سوکھ گیا اور محض ایک چوب خشک ہو کر رہ گئی۔ پھر چاندی اور سونے کی صلیبیں گڑھی گئیں۔ مگر خون کا بدل کچھ نہیں۔ خون بے بہا ہے۔ خون زندگی ہے۔ خون الوہیت کے چہرے کا غازہ ہے۔ ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اٹھانی پڑتی ہے۔ اپنا خون آپ بہانا پڑتا ہے۔ روحانیت سچی قربانی چاہتی ہے۔

پولوس رسول نے کہا تھا: "میں جانتا ہوں میرے چلے جانے کے بعد درندہ بھیڑیئے تمھیں چیر پھاڑ کر کھائیں گے اور گلہ پر تباہی آئے گی۔ نیز تمھارے اندر بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو گمراہی کی ساحرانہ باتوں سے شاگردوں کے دل موہ لیں گے اور انھیں اپنا پیرو بنا لیں گے۔ پس ہوشیار رہو۔"

بہاالله نے دیکھا: سارے سنسار میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ خود بہاالله طبق در طبق گھپ اندھکار میں لپٹ گیا۔ ایک اتھاہ رات ٹوٹ پڑی۔ ستارے بے نور ہو گئے۔ چاند کالی ٹکیہ کی طرح کالا پڑ گیا۔ سورج طلوع ہوتا تھا مگر روشنی نہ تھی۔ آکاش اور پرتھوی ایک ننھی سی کرن کے لئے بھی ترس رہے تھے۔

ابراہیم کی دعائیں ایک تاباں صبح نو کے لئے تاریک فضاؤں میں لرزاں تھیں۔ کرشن کی بانسری کے بول نیا اوتار لینے کے لئے اندھیرے میں لرز رہے تھے۔ طور اور ہمالہ اور بہتری بلند پیشانیاں نئے سورج کی کرنوں کا صندل ملنے کے لئے بے قرار تھیں۔ موسیٰ کی تمنائیں ایک آتشیں شریعت کے فروغ کے لئے دیدہ و دل فراش کئے ہوئے تھیں۔ عیسیٰ کے انگوری باغ کا مالک بنی اسرائیل کے بھائیوں کے نخلستانوں میں ظاہر ہونے والا تھا۔ ابن آدم ایک طویل سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ملازمین کے سپرد مکان کی حفاظت کر دی تھی اور ہر شخص کو اس کے کام سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے چوکیداروں کو حکم دیا تھا کہ نگہبانی کرتے رہیں۔

پس تم سب نگہدار رہو۔ تمھیں کیا معلوم مکان کا مالک کب آ جائے، سرشام، یا آدھی رات کو، مرغ کے بانگ دینے کے وقت یا علی الصباح۔ ہوشیار رہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمھیں سوتا اور غافل پائے۔

لیکن اس روز سعید، اس مبارک گھڑی کی کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ نہ کسی آدم زاد کو اور نہ فرشتوں کو۔ خود ابن آدم بھی بے خبر تھا۔ بس ایک آسمانی باپ اس راز سے آگاہ تھا۔

اس نے ارض طہا میں ظہور کیا۔ وہ شیراز سے طلوع ہوا اور کوہ فاران پر چمکا۔ دس ہزار

قدوسی اس کے جلو میں تھے اور وہ تخت نشیں ہوا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب عظیم تھی۔ سات مہروں سے سر بہ مہر۔ اس کا ہاتھ ید بیضائے کلیم سے زیادہ روشن تھا۔ اس میں سات ستارے تابندہ تھے۔ اس کی آواز میں پرشوکت آبشاروں کا نغمہ تھا۔ اس کی گفتار تیغ دو دم تھی۔ یہ تیز و براں دو دھاری تلوار باطل کو پاش پاش کئے دیتی تھی۔ اس کا چہرہ آفتاب عالم تاب کی طرح درخشندہ تھا۔ اس سراج منیر کی پیشوائی کے لئے سات سنہری شمعیں روشن تھیں۔ شمعوں کے اس جھرمٹ میں ایک مردِ خدا ابنِ آدم کے مماثل کھڑا تھا۔ بردبار شیل ابن آدم نے بڑھ کر اس پر جلال صاحب تخت و نگیں کے دستِ رحمت سے کتاب مبین کی نعمت پائی۔ فرشتے نے کنوارے کومل گیت گائے اور شیل ابنِ آدم کی تحسین کی: اے آسمانی روح تو اس کتاب عظیم کی حامل برحق ہے۔ اور تجھ سے ہی ساتوں مہریں کھلیں گی۔ اور ایک مقدس نے پکارا: داؤد کی ذریت میں ایک مردِ کامل اٹھے گا جو سات مہروں کے معارف بیان کرے گا۔ پس تم زاری مت کرو اور خوش ہو جاؤ کہ اب لوگ کتابِ عظیم کے معارف سے محروم نہیں رہیں گے اور سراج منیر کی روشنی تا قیامت پھیلتی رہے گی۔ اُسے ملکِ لازوال اور شوکت بے مثال دی گئی ہے۔

شہنشاہِ یثرب و بطحیٰ آگیا۔ خواجۂ بدر و حنین کا پرچم فضاؤں میں لہرایا۔ ماہِ عرب و عجم نے طلوع کیا۔ رحمتِ عالم، فخرِ آدم ظاہر ہوا اور اس کا فیض بے کراں جاری و ساری ہو گیا۔ آسمانی بادشاہت کا استحکام و استقلال منتظر آنکھوں نے دیکھا۔

دس کنواریاں دیا جلائے دولہا کے استقبال کے لئے نکلیں۔ ان میں پانچ عقل مند ثابت ہوئیں اور پانچ بے وقوف۔ جو عقل کی کوری تھیں انھوں نے تیل ساتھ نہیں رکھا۔ مگر جو ہوش مند تھیں انھوں نے دیئے کے ساتھ اپنی کپّیوں میں تیل بھی لے لیا۔ دولہا کے آنے میں دیر تھی۔ ساری کنواریاں سو پڑ رہیں۔ آدھی رات کو شور اُٹھا: دیکھو! دیکھو! دولہا دروازہ لگ رہا ہے۔ جاؤ، اُس کا سواگت کرو! دس کنواریاں جاگ پڑیں اور انھوں نے بتّیوں کو تیز کیا۔ بے وقوفوں نے عقل مندوں سے کہا: ہمیں اپنے تیل میں سے تھوڑا دو، ہمارے دیے بجھ گئے ہیں۔ خردمندوں نے کہا: نانا! ایسا نہیں۔ ہمارا تیل گھٹ جائے تو؟ جاؤ بازار سے خرید لاؤ! وہ اُدھر خریدنے گئیں اور اِدھر دولہا آگیا جن کے دیئے روشن تھے، دولہا کے ساتھ تقریب میں شاداں و فرحاں شریک

ہو گئیں اور دروازہ بند ہو گیا۔ پیچھے آنے والیاں محروم رہ گئیں۔

حسین دولہا تخلیق کا شہکار تھا۔ خود خلاق اس پہ ریجھا۔ فن کار اور فن کے ازلی دائرے، دو کانوں کی قابیں مل گئیں، منزل قرب اور عالم وصل نزدیک تر ہو کر ابدی عشق میں تبدیل ہو گیا۔

نوشاہ شہنشاہ لولاک بنا، ابن انسانیت، نگین نبوّت! موسیٰ کے کشوف کی رسائی مقام محمدؐ کے حاشیہ تک ہوئی تھی۔ بعد ازاں موسیٰ اور انسانِ کامل میں دور فراق شروع ہوا۔ مجمع البحرین پر دونوں علیحدہ ہو گئے۔ مشاہدات محمدؐ یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو، اور تا قیامت اس کی آبرو!

شہنشاہ لولاک نے انسانیت کے نفس امارہ کو قتل کیا، یتیم قوموں کی گرتی ہوئی دیواریں اٹھا دیں اور اپنی اُمت کو شکستہ کشتی پر ظلماتِ حیات پار کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ محمد کا نظام اخلاق کامل، نظام سیاست کامل، نظام اقتصاد کامل، اس کا نظام روحانی ارفع و اکمل۔ محمدؐ یزداں کا تابندہ ترین شعلہ، یہوداکی کامل ترین تجلّی، برہما کا سب سے سُندر سپنا۔

ہالہ نے دیکھا: پچھم دیش سے ایک سورج نکلا۔ وہ چاند تاروں کے جھرمٹ میں تھا۔ ہالہ نے ایسا پرکاش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا پرکاش کبھی نہیں دیکھے گا۔ ہالہ نے یہ بھی دیکھا کہ سورج کی کرنیں ذرّوں پر پڑتی تھیں اور وہ سلگ کر جگنو، تارے اور چاند بن جاتے تھے۔ اندھیرے کافور ہوتے جاتے تھے۔ ہر طرف جوت جاگ اُٹھی تھی۔

ہالہ نے دیکھا: شرارِ بولہب شعلہ بن کر اُٹھا اور بگولہ بن کر سورج کا مقابلہ کرنے بڑھا۔ شیطان نے انسان کو ابوجہل و ابولہب بنایا۔ ان دونوں اہرمن زادوں نے مکّہ اور طائف کی گلیوں میں سورج کو خراماں پایا اور بھڑک اُٹھے۔ ابنِ آدم کے دُشمن بھی جی اُٹھے اور گدھوں کی سیرت وصورت کے ساتھ سورج کی طرف مُنہ اُٹھا کر رینکنے اور خرمستیاں دکھلانے لگے۔ آفتاب خراماں کی راہ میں کانٹوں کے جنگل بکھیرے گئے۔ مگر اس خورشید درخشاں کے لہو سے کچھ تو گلستاں بن گئے، اور کچھ اس کی آتش عریاں سے جھلس کر فنا ہو گئے۔ فرقِ آفتاب پر شور پشت اونٹوں نے اپنے مکر و کید کی اوجھڑیوں کی کمندیں پھینکیں مگر وہ سب ان کی متکبّر گردنوں میں پھانسی کی رسّیاں بن گئیں اور نیّرِ اعظم کا روئے زیبا تاجِ افتخار سے اور جگمگا اُٹھا۔ سورج آکاش پر تھا:

ہالہ نے دیکھا: فرعون و ہامان کی میّاں بھی اُٹھ بیٹھیں۔ سامری کا سحر بھی جاگا۔ ان

سبھوں نے مل کر سورج کو نگلنا چاہا۔ مگر ایک شہابِ ثاقب نے ان سب کو بھسم کر دیا۔

ہمالہ نے دیکھا: نمرود، بخت نصر، ہیروڈ اور نیرو کی روحیں بھی مہر روحانیت کے گرد ابر سیاہ بن کر منڈلانے لگیں۔ لیکن آخرتار عنکبوت کی طرح پارہ پارہ ہو کر بکھر گئیں۔ کنس اور کوروؤں کی آتماؤں نے بھی اوتار لیا اور سارے راکشش ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جو دھرتی سے لپٹے ہوئے تھے انھوں نے آکاش کے سورج اور تاروں پر تیر پھینکے۔ آکاش کی کرنوں نے بھی حملہ آوروں پر اپنے بان برسائے اور سارے راکشش دھرتی میں دھنس گئے۔ اب کے پانڈو نے جیت کر راج گدی چھوڑی نہیں۔ بلکہ ساری پرتھوی پر سورج اور اس کے چاند تاروں نے راج کیا۔

ہزار سال تک اندھیرا پاتال میں مُنہ چھپاتا پھرا — لیکن برہما کے سپنے میں اندھیرے نے ہمیشہ اُجالے پر حملہ کیا۔ اندھیرے اور اجالے کی لڑائی ازل سے تا ابد جاری رہے گی اور خود برہما ازل اور ابد سے پرے رہے گا۔ ازل اور ابد برہما کے ان گنت گنوں میں سے دو گن ہیں۔ یا یہ اتھاہ برہما کو ناپنے کی ایک چھچھلی سی کوشش ہے۔ سپنے کے پتلے حقیقت کے کسی گوشے، کسی زاویئے، کسی سطح، کسی پرت کو ہی جان سکتے ہیں اور وہ بھی بے حد ادھورے طور پر حقیقت تو صرف برہما کی ہے۔ اور سب کچھ بے حقیقت، سب کچھ محض خواب و خیال!

برہما اور نندو کی کہانی میں سب سے اجیالے بندو کی جیوتی پر بھی اندھیارے نے آکرمن کیا۔ پہلی فتح کے ہزار سال کے دور میں بھی دو بار روشنی پر تاریکی نے حملے کیے۔ پہلے حملہ اتر پورب دیش سے ہوا اور دوسرا حملہ اُتر پچھم دیش سے۔

ہمالہ نے سُنا:

سبا کے لیے ان کے اپنے ملک میں ایک بڑی نشانی موجود تھی اور وہ دو باغوں کی صورت میں تھی، جن میں سے ایک داہنی طرف اور ایک بائیں طرف — اور ہم نے اس سے کہ رکھا تھا کہ اپنے رب کے رزق کو کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ تمھارا شہر ایک خوب صورت شہر ہے اور تمھارا رب بہت بخشنے والا ہے۔ پھر بھی انھوں نے حق سے پیٹھ پھیر لی۔ تب ہم نے ان پر ایسا سیلاب بھیج دیا جو ہر چیز کو تباہ کر جاتا تھا اور ہم نے ان کے اعلیٰ درجہ کے باغوں کی جگہ انھیں دو ایسے باغ دیئے جن کے پھل بد مزہ تھے اور جن میں جھاؤ پایا جاتا تھا یا کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔ یہ سزا ہم نے ان کی ناشکری

کی وجہ سے دی تھی اور ناشکروں کو ہی ہم ایسا بدلہ دیتے ہیں۔

ہالہ گواہ ہے کہ شجرِ ابراہیم کی دونوں شاخوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہوا۔ پہلی شاخ کے انجام سے دوسری شاخ نے عبرت نہیں حاصل کی اور دونوں شاخیں برباد ہو گئیں۔

ہالہ گوش بر آواز تھا:

تم یقیناً اس ملک میں دوبار فساد کرو گے اور یقیناً تم بہت بڑی سرکشی اختیار کرو گے اور جب ان دو میں سے پہلے کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے بعض ایسے بندوں کو تم پر مسلط کر دیا جو سخت جنگجو تھے اور وہ تمہارے گھروں کے اندر رچ گھسے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنے والا تھا۔

اس کے بعد پھر ہم نے تمہیں دشمن پر حملہ کی طاقت عطا کی اور ہم نے مالوں اور بیٹوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی۔ اور ہم نے جتھے کے لحاظ سے بھی تمہیں زیادہ کر دیا۔

سنو! اگر تم نیکو کار ہو گے تو نیکو کار بن کر اپنی جانوں کو ہی فائدہ پہنچاؤ گے۔ اور اگر تم برے اعمال کرو گے بھی تو اپنی جانوں کے لئے برا کرو گے۔

پھر جب دوسری بار والا وعدہ پورا ہونے کا وقت آ گیا تا کہ دشمن تمہارے معزز لوگوں سے ناپسندیدہ معاملہ کریں اور اسی طرح تمہاری مسجد میں داخل ہوں جس طرح وہ اس میں پہلی بار داخل ہوئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیں۔ تو یہ بات بھی پوری ہو گئی۔

اب بھی کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم کر دے۔ اور اگر تم پھر اپنے غلط رویّہ کی طرف لوٹے تو ہم بھی اپنی سزا کی طرف لوٹیں گے۔

ہالہ نے یہ بھی سنا کہ داعیِ اعظم نے پکار کر کہا کہ اے میری امت کے لوگو! تم بنی اسرائیل کے قدم بہ قدم چلو گے یقیناً وہ ایک بزرگ رسول کا کلام تھا اور اس نے غیب کو افقِ مبین میں دیکھا تھا۔ سورج نے کہا تھا کہ ستاروں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ملیں گی اور انھیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ سب یہ پیش گوئیاں پوری ہوئیں۔

برہما کی لیلا: اندھیروں نے اپنی یلغار جاری رکھی۔ اُجالے اپنے کو تاب ناک نہیں رکھ سکے تھے۔ زرد جواہر کی جوت ہوئی مگر دل کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ دل ہی کو خون کرنے سے خاک

کے ذرّے ستارے بنتے ہیں۔ خوارزم و بغداد، قرطبہ و غرناطہ کے روشن محلوں میں اندھیرا تھا۔ دل کے الحمرا زرد پڑ گئے تھے۔ اور باغِ داد یاغِ بے داد تھا۔

ہمالہ نے دیکھا: شمال مشرق اور شمال مغرب سے اندھیرے کا طوفان اٹھا اور سورج کی دنیاوی سلطنت کو گہن لگ گیا۔ ستارے سوکھے پھولوں کی طرح جھڑ گئے۔ لیکن پھر پرانی ٹہنیوں پر نئے پھول کھلے اور نئی صبح طلوع ہوئی ——— اور ہزار سال بیتنے پر شیطان پورے طور پر آزاد کر دیا گیا۔

ہمالہ نے سُنا تھا:

——— اور چاند کو خوف لگے گا۔ سورج اور چاند دونوں کو ایک حالت میں جمع کر دیا جائے گا۔ ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور آسمان چاک ہو جائیں گے اور پہاڑ اڑائے جائیں گے۔ نورِ آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا۔ وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔ دریاؤں کو ملا دیا جائے گا۔ نفوس جمع کئے جائیں گے۔ کتابیں پھیلا دی جائیں گی۔ آسمان کی کھال اتاری جائے گی۔ جہنم کو بھڑکایا جائے گا اور جنّت کو قریب کر دیا جائے گا۔ زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال پھینکے گی۔ یاجوج ماجوج کے لئے دروازہ کھول دیا جائے گا اور وہ پہاڑی سلسلوں، سمندری اور ہوائی لہروں کو پھاندتے ہوئے دنیا میں پھیل جائیں گے اور سچا وعدہ قریب آ جائے گا۔ جب اس کے پورا ہونے کا وقت آئے گا تو اس وقت انھیں ایک دوسرے کے خلاف جوش سے حملہ آور ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا اور بگل بجایا جائے گا۔ رات اس کی گواہ ہے جب وہ کالی ناگن کی طرح کسمساتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ اور صبحِ تاباں بھی جب وہ ہولے ہولے سانس لینے لگتی ہے۔

ہمالہ نے رسولِ امین کے پیش خدمت عیسیٰؑ، حزقیل اور دانیال کی وعیدوں اور بشارتوں کو بھی سُنا تھا:

——— اور جب تم جنگ کی باتیں سنو گے اور جنگ کی افواہیں تمھیں لرزہ براندام کریں گی۔ اس وقت تم مت گھبرانا، کیونکہ ان امور کا برپا ہونا مقدّر ہے۔ قیامت ابھی تم سے دُور ہو گی۔ ایک قوم دوسری قوم پر چڑھائی کرے گی اور ایک حکومت دوسری حکومت پر۔ مختلف مقامات پر سخت زلزلے آئیں گے اور قحط پڑیں گے۔ مصائب کی زنجیریں تمھیں جکڑ لیں گی۔ اور یہ درد و غم کا محض آغاز ہو گا۔ سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند ماند پڑ جائے گا اور آسمان

گے تارے جھڑ جائیں گے اور آسمانی طاقتوں میں حرکت پیدا ہو گی اور تب لوگ ابنِ آدم کو بدلیوں کے اندر سے بہ جلال و جبروت طلوع ہوتا ہوا دیکھیں گے ۔

اور ایک حاملہ عورت سورج کی کرنوں کا لباس ، چاندنی کے پاپوش اور تاروں کا تاج پہنے رونما ہو گی ۔ مگر اس بار آور وجود کو ایک سرخ اژدہا نگل جانے کے لئے خوفناک طور پر حملہ آور ہو گا ۔ یہ ہفت سرہ ، دس سینگوں والا اژدہا صاحبِ ہفت تاج بھی ہو گا اور یہ اپنی طاقتور دُم سے آسمانِ دُنیا کے ایک تہائی تاروں کو جھاڑ کر زمین پر گرا دے گا ۔

لیکن جو قوموں کی رستگاری کے لئے معبوث ہونے والا ہے اس حاملہ عورت کے بطن سے پیدا ہو گا اور اقوام پر حکومت کرے گا ۔ وہ خدائے ذوالجلال کے تخت سے لپٹا ہوا ہو گا ۔ اور آسمان پر فرشتوں اور شیطانی اژدہے کے درمیان جنگ ہو گی ۔ فرشتے اُسے زمین پر دے ماریں گے اور پھر ایک پُر شوکت آواز منادی کرے گی کہ اب خدا کی بادشاہت زمین پر بھی قائم ہو گئی اور نجات کے دروازے کُھل گئے ۔

—— اور دانیال نے خواب میں دیکھا :

چو طرفہ ہوائیں چلنے لگیں اور وسیع سمندر میں لہریں اُٹھنے لگیں اور چار بڑے بڑے عجیب و غریب جانور سمندروں سے نکل کر باہر آئے ۔ یہ چاروں مختلف کینڈے کے تھے ۔

پہلا جانور شیرِ ببر کی طرح تھا اور اس کے عقابی پر لگے ہوئے تھے ۔ یہ ساری دنیا پر چھا گیا لیکن انجام کار اس کے شہ پر غیب کی طاقتوں نے توڑ دیئے اور اس کی بہیمیت دور ہو گئی ۔ اس میں آدمیت پیدا ہوئی اور وہ مادیت کو ترک کر کے آسمانی برکتوں کی تلاش میں آدم زاد کی طرح اُٹھا ۔ آخر کار اُسے قلبِ مومن عطا ہوا ۔

اور دیکھنا ایک دوسرا جانور رونما ہوا ۔ بالکل ریچھ کی طرح کا ۔ وہ محض ایک پہلو سے اُٹھا ۔ اُس کے مُنہ میں تین پسلیاں تھیں ۔ وہ انھیں دانتوں سے کرکرا رہا تھا ۔ اور لوگوں نے اس سے کہا ! اُٹھ اور خونخوار بن اور بے حد گوشت چبا ڈال !

پھر ایک تیسرا جانور چیتے کی طرح چالاکی سے نکلا ۔ اس کی پیٹھ پر چار پر لگے ہوئے تھے ۔ اس کے چار سر بھی تھے اور اسے سلطنتِ عظیم بھی بخشی گئی ۔

اور آخرالامر ایک چوتھا خوف ناک جانور گرجتا ہوا نکلا۔ بڑا مضبوط۔ اس کے لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے دانت تھے۔ اس نے خوب خوب خوں خواری کی۔ وہ مختلف جہتوں میں حملہ آور ہوا اور خلقت کو روندتا رہا۔ اس کی دس سینگیں تھیں۔ ایک چھوٹی سینگ تھی جس میں آنکھیں تھیں۔ آدمیوں جیسی آنکھیں اور ایک مُنھ تھا جو بڑے بول بولتا تھا۔

اس وقت آسمانی تخت بھی بچھ چکا تھا اور دنیا پر فرشتوں کا نزول شروع ہو گیا تھا۔ حکم و عدل آ چکا تھا۔ فیصلے کا دن قریب تھا۔ حساب کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔

آخرش معجزانہ طور پر وہ عجیب الخلقت جانور قتل کر دیا گیا۔ اس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور اسے آگ میں جھونکا گیا۔ تکبّر اور بڑے بول کا نتیجہ!

اور بقیہ جانوروں کا حشر بھی بڑا عبرت ناک ہوا۔ ان کی سلطنتیں ان سے چھین گئیں۔ مگر انھیں کچھ اور مہلت ملی۔

اور ایک ابن آدم کا مثیل آسمانی ابر پاروں کے ساتھ نازل ہوا۔ وہ قدیم و قدیر طاقت کے آگے جھکا۔ اُسے ملکِ لازوال اور طاقتِ باکمال بخشی گئی۔ مختلف نسلیں، قومیں اور زبانیں اس کی سلطنت میں شامل ہو گئیں۔

دانیال کو بتایا گیا تھا یہ چار جانور چار سلطنتیں ہیں۔ اور آج برہما کے خواب کے پُتلے یہ سوچ رہے ہیں کہ آئینہ ایام میں ہم نے یہ جانور دیکھے ہیں۔ آمریت کے دسوں سینگ ٹوٹ گئے اور آگ میں آہنی دانت پگھل گئے۔ سمندری شیر ببر کی ہوائی طاقت کمزور ہو گئی اور اب وہ آدمیت کی طرف مائل ہے۔ ابھی دل کا آپریشن ہونا باقی ہے اور اس کی نسل کا چیتا؟ بکھر ان ہوائی طاقت والا، صاحب ملک و دولت! اسے بھی مہلت ملی ہے۔

اور خوں خوار ریچھ؟ خوں ریزی کے لئے اسے بھی مہلت دی گئی ہے۔

خوں خوار ریچھ اور خون آشام چار سرہ پردار چیتا دونوں ٹکرائیں گے اور اُن کی طاقتیں غیبی قوت و جبروت سے توڑی جائیں گی۔ حزقیل نے خواب و کشوف میں دیکھا تھا کہ یاجوج ماجوج کی خوف ناک جنگوں کا آغاز اس دور سے ہو گا جب بنی اسرائیل ارض مقدس میں جمع کیے جائیں گے۔

——— اے حزقیل پیشین گوئی کر اور انہیں بتا کہ خدائے قدیر تمھاری قبریں کھول دے گا

اور تم اُن سے نکل کھڑے ہو گے۔ وہ تمھیں سرزمین اسرائیل میں لائے گا، تمام دیارِ کفر و ضلالت سے سمیٹ کر تمھارے اپنے ملک میں اکٹھا کرے گا۔ تم اسرائیل کی پہاڑیوں پر چڑھو گے اور تم جانو گے کہ تمھارا یہوداہ کتنا صاحبِ طاقت و جبروت ہے۔

——— اور تصدیق کرنے والی کتابِ مبین نے بھی یہ عظیم پیش خبری کی کہ اُمّتِ مرحوم کے دوسرے زوال کے دور میں بنی اسرائیل ارضِ مقدس میں لائے جائیں گے۔

——— پھر جب دوسری بار کا وعدہ آ پہنچے گا تو ہم تم کو جمع کر کے وہاں لے آئیں گے۔

——— اور ہماری آنکھوں نے دیکھا: پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ اور خواب حقیقت بن گئے۔

——— اور حزقیل نے ایک عظیم الشان ندا سُنی:

اے ابنِ آدم! یاجوج اور سرزمین ماجوج کے خلاف نبوّت کر۔ میسہک اور توبال کے آمرِ قاہر کے خلاف نبوّت کر! اور کہہ: ——— خداے ربّ العزت فرماتا ہے: ———

سُن اور دیکھ! اے یاجوج! اے میسہک اور توبال کے بڑے حکمراں میں تیرا مخالف ہوں۔

اور میں تیرا منہ توڑ دوں گا اور تیرے جبڑوں میں آنکڑے ڈالوں گا۔

اور میں تجھے اور تیری قاہر فوج کو نکال باہر کروں گا۔ تیرے بے پناہ اسلحے، آلاتِ حرب و ضرب اور آہنی زرہ بکتر اور دوسرے حفاظتی سامان تیرے کوئی کام نہ آئیں گے۔

ہوشیار رہ! تیرے ساز و سامان، تیری دوست قومیں، تیرے حلیف تجھے سے برباد کر دیئے جائیں گے۔

عرصہ دراز کے بعد تو پوچھا جائے گا۔ تو ایک ایسی سرزمین پر حملہ آور ہو گا جو تسلّطِ غیر سے آزاد کی گئی ہو گی اور یہاں مختلف قوموں میں سے جمع کئے ہوئے لوگ آباد ہوں گے۔

تو اسرائیل کی پہاڑیوں پر ٹوٹ پڑے گا۔ تو طوفان کی طرح اُٹھے گا۔ تیری حلیف قومیں اور تیری افواج ممالک پر ابرِ سیاہ کی طرح چھا جائیں گی۔

اور ترشیش، شیبا و ددان کے سوداگر تجھ سے پرسش کریں گے کہ کیا تو مال لوٹنے نکلا ہے۔ کیا تو جتھا جمع کر کے شکار کے منصوبے سے باہر آیا ہے۔ وہ شیر بچے تجھ سے سوال کریں گے۔

بس اے آدم زاد! یاجوج کے خلاف پیشین گوئی کر: تو اپنے شمالی ملک سے خروج کرے گا

اور اپنے جتھے کے ساتھ اسرائیل تک بڑھتا آئے گا۔

تیرا لشکرِ عظیم و قوی منحوس بادل کی طرح خیمہ زن ہوگا۔ یہ ساری باتیں آخری زمانہ میں رونما ہوں گی۔ اے یاجوج! یہ ظہور اس لئے ہوگا کہ مظاہر پرست دہریے بھی مجھ خدائے قادر پر ایمان لائیں۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر ہوگا۔ اور ارضِ اسرائیل میں سخت زلزلہ آئے گا۔ اس وقت پانی کی مچھلیاں، ہوا کے پرندے، میدانوں کے جانور، سطحِ ارض پر رینگنے والی ساری مخلوق اور روئے زمین پر بسنے والے تمام آدمی خدا کے حضور کانپیں گے۔ پہاڑ گر پڑیں گے اور بلند مقامات دھنس جائیں گے اور ساری دیواریں زمین پر آ رہیں گی۔ اور یاجوج کا زبردست مقابلہ کیا جائے گا۔ سارے عالم سے اس کے خلاف تلواریں اُٹھیں گی۔ قوموں میں خانہ جنگی اور برادر کشی ہوگی۔

اور میں یاجوج و ماجوج اور ان کے ساتھیوں پر بلائے ناگہانی نازل کر دوں گا۔ سخت خوں ریزی ہوگی۔ موسلا دھار پانی برسایا جائے گا۔ بڑے بڑے اولوں کی مار پڑے گی۔ آگ اور انگارے برسیں گے۔

اس طرح بہت سی قومیں مجھے پہچانیں گی اور میری تقدیس کریں گی۔

اور ماجوج پر ایک آگ برسے گی۔ اُن پر بھی، جو بے خوف جزیروں میں رہتے ہیں۔ اور وہ بھی خدا شناسی پر مجبور ہوں گے۔

دیکھ اے رشن! وہ انقلاب آیا اور خدا کی بات پوری ہوئی! —— ہمالے نے سُنا اور کانپ گیا۔ اس کی وادیوں میں ایک اور آواز گونجی۔ راوی کے کنارے اور ساحلِ گنگ و جمن تھرتھرانے لگے —— قیامت کے مشابہ ایک زلزلہ آنے والا ہے۔ اے مجرمو! آج تم الگ ہو جاؤ! حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ یہ وہ بشارت ہے جو نبیوں کو ملی تھی۔ اگر چاہوں تو اس دن خاتمہ!

سینوں کے دیس میں یاجوج و ماجوج موجیں مارنے لگے۔ کوہ قاف کے دیوزادوں نے آکاش اور پرتھوی پر قبضہ کر لیا۔ سندباد جہازی کے سفر الف لیلوی دنیا سے باہر نکل آئے۔ دجل و فریب کا عفریت اپنی مٹھیوں میں دوزخ و جنت لئے دنیا کو ناپنے نکلا۔ اُس نے ذرّے کو آفتاب سامان بنا دیا۔ اہرمن کو مادہ پر قدرت حاصل ہوئی اور دجال نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ مگر جوہرِ مادہ تک رسائی مادیت کی شکست بھی تھی۔ مادہ اماری نہیں، ازلی و ابدی نہیں۔ اصل توانائی ماورائے

مادّہ ہے اور خود اہرمن کے ہاتھوں مادّہ اور مادّیت کے لات ومنات ٹوٹ گئے ۔ عفریتوں نے طلسمی گولے لے کر ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیا ۔ عالم نو نور افشاں بھی تھا اور ہوش رُبا بھی ۔ بڑی سخت کشمکش پیدا ہوئی ۔ سخت تصادم رونما ہوا ۔ بھیانک دھماکے ہوئے ۔ کائنات لرزہ براندام ہوگئی ۔ خواب کے پتلے فنا ہونے لگے ۔ سپنوں کا سنسار تحلیل ہونے لگا ۔ شاید بند و اور برہما کی کہانی ختم ہو رہی تھی ۔ یہ عظیم دماغ کا ایک لمحہ تھا یا ابدیت کی ایک کڑی ؟ کون جانے ! عظیم دماغ خلفشار عالم سے بیدار ہو رہا تھا ۔ برہما کی نیند دھماکوں سے اُچٹ گئی تھی ۔ سپنوں کا سنسار چھایا ! خواب کی دنیا مایا ! —— کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اُٹھے گا ؟ کیا برہما اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا ؟

"سپنوں کے دیس میں"
۱۹۶۹ء

محشر

بلا وجہ طبیعت اُداس نہیں تھی۔ زندگی کی کون سی کل سیدھی تھی۔ اور احساس تو سب سے بڑی اذیت ہے۔ فن کار اپنی ذکاوت احساس سے نالاں تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ جذباتی ہے۔ ہاں گداز دل بھی بُری بلا ہے۔ اچھائی سے محبت مصیبت ہے۔ بُرائی سے نفرت زحمت ہے۔ جذباتی آدمی محبت و نفرت کے نور و نار میں تپتا رہتا ہے۔

وہ دن بھر کتابیں پڑھتا رہا اور سوچتا رہا۔ کوئی ایک کتاب ڈھنگ سے نہیں پڑھ رہا تھا۔ بس کتابوں کو اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ چند صفحے اس کے پڑھے، چند اُس کے۔ کبھی ٹالسٹائی کے ناول، کبھی ہنری جیمز اور راما دام کے، کبھی پریم چند یا پلیسر ڈنگ کے۔ ابھی 'آگ کا دریا' سامنے موجیں مار رہا ہے اور ابھی 'گلستاں' لہلہا رہا ہے۔ وہ دن بھر 'بالِ جبریل' کے سہارے پرواز کرتا، 'الفرنو' میں جلتا، فلک قمر کی سیر کرتا، دوری سے گذر کر حضوری تک پہنچا۔ مگر اُسے اطمینان اور چین نصیب نہ ہوا۔ وہ زمین پر اُتر آیا اور شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے لگا۔ اس کے المئے۔ دل اور کڑھا۔ کتابیں بند کر دیں اور پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند نہ آئی۔ آج تو اُسے بھوک پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا ذہن بڑے کرب میں مبتلا تھا اور اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

فن کار کو دنیا کے حسن سے محبت تھی۔ اپنے وطن اور اپنے ہم سایوں سے محبت تھی۔ اُسے کبھی کبھی خدا سے بھی محبت سی ہونے لگتی تھی۔ لیکن دنیا تو صد چہرہ تھی۔ خوب صورت چہرے، بدصورت چہرے اور وطن کا پیار؟ کبھی گل و لالہ، کبھی آہ و نالہ! ہم سائے؟ کبھی نسیم گلشن، کبھی برق نشیمن! اور نہ جانے خدا نے انسان کو آزاد کیوں پیدا کیا۔ اور کیا آدمی بالکل آزاد ہے؟ کاش

جبر مستقل ہوتا یا اختیار کامل۔ اور ابنِ آدم خیر و شر کے بھنور میں گرفتار نہ ہوتا۔ خیر ہی خیر ہوتا۔ حُسن ہی حُسن ہوتا ہے۔

فن کار اٹھ بیٹھا۔ سگریٹ جلائی اور بستر پر بیٹھا بیٹھا دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ بک شیلف سے فانی کی 'باقیات' نکالی اور پڑھنے لگا........ خواب ہے دیوانے کا: بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے: زندگی نے تو نوحے لکھے تھے۔ ہم سبھوں کو صرف نوحے لکھنے چاہئیں۔ مرثیے! صرف مرثیے! ...... ہے ہے علی اصغر! .... آسماں راحق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں! .... فن کار اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

جب غم ناقابلِ برداشت ہو گیا تو وہ رونے لگا۔ رونا غم کا تیکھا پن نہیں، ہلکا پن ہے۔ اس نے سوچا، کیا وہ اتھاہ دکھ کا اظہار بھی کر سکتا ہے؟ کیا دُکھ کی شدّت کا اظہار ہو بھی سکتا ہے؟ خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!

فن کار نے میز کی دراز میں رکھے ہوئے کاجو نکالے اور انھیں بڑے چاؤ سے کھانے لگا۔ جیسے زندگی کا سارا حُسن، سارا رس، سارا لطف صرف کاجو کھانے میں ہے۔ ساری نیکی صرف کاجو کھانے میں ہے۔ وہ کھاتا رہا۔ پھر اسے پیاس لگی۔ وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں ڈگڈگا کے اوک سے خوب پانی پیا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے دریچے کھول دیئے۔ پتہ چلا شام ہو چکی ہے۔ مگر وہ باہر نہ نکلا۔ بجلی کی روشنی گل کر دی۔ اب وہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ شام کے دُھندلکے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ بے ربط خیالوں سے الجھے ہوئے جالے۔ وہ اچانک ایک شعر گنگناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری یہی ہے بادِ مُراد

فن کار نے روشنی جلائی اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ کرشن چندر: 'ہم وحشی ہیں'! 'نہیں ہم تو نہایت مہذب ہیں۔ نہایت....... بہت مہذب! نہیں'....... "اپنے دُکھ مجھے دے دو!" 'موذیل' کی چتک نہ کرو۔ زندگی کو 'موتری' نہ بناؤ۔ "کالی شلوار" "ٹیڑھی لکیر"! اتنے سارے کردار، اتنے واقعات: خالق و مخلوق، فن کار اور اس کا فن۔ فن کار نے ساری کتابیں بند کر دیں۔ اور اپنے افسانوں کے مجموعے پہلی بار پڑھنے کے لئے کھولے۔ اسے اپنی تخلیقات سے اچانک بڑی

کشش محسوس ہوئی۔ وہ نہ جانے کب تک اُنھیں پڑھتا رہا۔ اور اسی عالم میں شاید سو گیا، شاید جاگ گیا۔ اور اُس نے پایا کہ وہ صاحبِ عرش و کرسی ہے۔ اس نے "کُن" کہا اور "فیکون" کی جلوہ گری ہوئی۔ اس کا کمرہ عالمِ کون و فساد بن گیا۔ اس کی کہانیوں کے مجموعے دخانی ہیولوں کی طرح رقص کرنے لگے۔ ان سے بہتیرے کُرے بن گئے اور فضائے بسیط میں ناچنے لگے۔ اُن کُروں پر جن و انس کی آبادیاں پیدا ہوئیں۔ انواع و اصناف نمودار ہوئیں، طرح طرح کی مخلوقات نے جنم لیا۔ حیات اور معاشرہ کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایک ایک کُرہ اس کے سامنے رقص کناں آیا۔ اس کی مخلوقات کی حاضری ہوئی۔ ایک ایک فرد کی پیشی ہوئی۔ اس نے خالق ہونے کا فخر محسوس کیا۔ اس کے ذہن کی ساری کہانیاں جی اُٹھی تھیں۔ ساری شخصیتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ "منظر و پس منظر" جاگ چکے تھے۔ اس کی تخلیق کی بوقلمونی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ زندگی کے سارے رُخ حقیقت کا رُخ دھار چکے تھے۔ اس کی "کلیاں اور کانٹے"، اس کی "تعمیر و شکست" "سیمنٹ اور ڈائنامائیٹ"۔ "حیات کی روشن راہیں" اور "پیچیدگیاں"، اس کی "انارکلی اور بھول بھلیاں" سب ظاہر ہو گئی تھیں۔ افراد و اقوام کی "حسرتِ تعمیر" کا قصہ ذی حیات بن گیا۔ مخلوقات کے عروج و زوال کی داستان جاندار ہو گئی۔ اس کی "کیچلیاں اور بالِ جبریل" مرتعش تھے "سپنوں کے دیس" جیتی جاگتی تاریخ بن گئے۔ عدم معدوم تھا اور وجود حشر ساماں۔

اس کی تخلیق کے کُرے رقص کرتے رہے اور فن کار پندارِ خالقیت میں محو ہو گیا اس کے دل میں اپنی مخلوقات کی محبت کا ایک بے پایاں جوش اُٹھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ ان سب کو اپنے قریب جمع کرے۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ پھیلایا اور ہر کُرے سے تمام مخلوقات کو سمیٹ کر اپنے بائیں کفِ دست پر اکٹھا کر لیا۔ ایک بیکراں محشرِ تخلیق سامنے تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ لطیف و خبیر اور سمیع و بصیر ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی ایک ایک ہستی مکمل طور پر اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس کی مخلوقاتِ فن اس سے سرگرمِ تکلم ہیں۔ اپنی انفرادیت اور ماحول کے ساتھ!

ٹائپسٹ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ داڑھی منڈی ہوئی مگر حجامت کو ترسی ہوئی — سانولا رنگ، چوڑی ہڈی مگر ڈھیلا ڈھالا ڈھانچہ، چہرے پر شکن، ماتھے پر بل، ناک پر ایک پرانی سی عینک

جس کی ٹوٹی ہوئی کمانیوں کے دھاگے سے جوڑا گیا تھا۔ اس کا مفلوک الحال رین بسیرا، بھوکی بیوی، فاقہ زدہ خاندان، بیمار دم توڑتا بچہ، سود خوار قرض خواہ اور موت کا منڈلاتا ہوا سایہ۔

ٹائپسٹ نے کہا "ہائے میرے بچے!" اور پھر فن کار کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے خالق! ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔"

فن کار خاموش تھا۔ ایک اور کردار ابھرا۔

ماما دھیا۔ اس کا مستحکم عقیدہ تھا کہ دنیا کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے قریباً گھر کی ہر بات میں دخل دینا چاہتی اور دخل دیتی تھی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اور دوسری کمزور۔ اسّی سال سے اوپر کی ہے۔ اس نے گھر کے سارے ملازمین کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے۔

"شبرتیا آج تک بھرپیٹ کھانا نا لکابیس۔ اور سلمتا کوڑھی دن بھر ہمرے تنگ کرتا رہے ہے۔ گھر میں پلو کی طرح آدمیتن آپلائے چلین۔ مرجیو نہ جاہیں سب!......"

اور شبرتیا باورچی گرجا۔ "بڑھیا خبردار! ہمرے سب کو اکو سامنے کر!"

ماما دھیا کی بے تحاشہ چیخ سنی گئی۔

"ہائے ہائے! سب پھینک پھاک دیس۔ ہیجا ہو سلمتا کو۔ پلیگ میں مرے!..... اب کا بابو! برتیا کا باوا ای سمجھی دہن تھا"۔

سلمتا فن کار کے کفِ دست پر بالکل گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ کا ٹو تو لہو نہیں۔ اور بڑھیا کے سُرمہ کی شیشی چکنا چور ہو چکی تھی۔

بڑھیا نے فن کار سے پوچھا۔ "تم میرے مرے ہوئے کھاوند کا بھید کاہے کھولیو؟"

۔ اور تبسم، ایک دل دوز انوکھا تبسم، پُر درد، ملتجی، مایوس، مترحم۔ وہ ایک مزدور ہے۔ عمر رسیدہ..... اس کا سارا جسم عریاں ہے۔ صرف کمر میں ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی ہے۔ بولا...... "حجور، کوئی کام!...... سرکار جو کام کا حکم ہو۔ کام مل جاتا تو پیٹ پالنے کا سہارا ہو جاتا۔ بچے سب بھوکا ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا ...... پھر بولا۔ حجور ہم کو بھوکا کتا کاہے بنا دیا؟"

——نوبہار لہراتی ہوئی رحمو کے ساتھ آگے بڑھی۔ بولی ۔" کوئی سفید پوش مجھے ملتا۔ رحمو قسمت میں کیوں ٹھونک دیا گیا"۔ اور شکور بولا۔" آنکھ کا اندھا، اکل کا پورا، میری جورو تو منشی کی رکھنی ہے۔ سب کے آگے تو آچکی ہے۔ پتریا سے بھی بدتر ہے"! اور پھر رحمو نے فریاد کی۔ "ہم کو بے بس کا ہے لا بنایا"

ایک پلّے کے بھونکنے کی آواز نے فن کار کی توجہ اپنی جانب منعطف کرائی۔ ایک بھکارن پلّے کے پاس پہنچی۔ اُسے اپنے میلے آنچل کی پوٹری سے نکال نکال کر ہڈیاں اور سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے کھلاتی رہی۔ جب بھکارن پلّے کو کھلا چکی تو اس نے خود کچھ روٹی کے کنارے کھائے اور اسکے بعد پلّے کو کھونٹی سے کھول کر گود میں لے لیا۔ اور پھر پیال پر جا کر اسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جا رہی تھی ....

"جینے کے سہارے"! بھکارن اپنے خالق سے ہم کلام ہوئی ۔" لوریاں نہیں، گھُٹے ہوئے نالے ہیں، جنھیں تو ناحق نغمہ بنوانے کی کوشش کر رہا ہے"!

اور پلّے نے شکوہ کیا ۔" پلّا ہی بنایا تھا مجھے تو ایک بھکارن کا پالتو نہ بنایا ہوتا"!

——بلی، خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں داخل ہو گئے۔ شاکرہ چاہتی، ناصر بھی شوخ، چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا۔ مگر وہ تو ایک بے وقوف سا، کم گو لڑکا تھا۔ اور شاکرہ کو موٹی، گول مٹول، باتونی، نصیحت افزا، بکر بکر پان چبانے والی خالہ جی سے پالا پڑا تھا۔ اس نے فن کار سے کہا ۔" کاش ناصر کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے"!

——شکور دادا اپنی مخصوص بذلہ سنجانہ ترنگ میں گانے لگے ۔" نیم شبے تر تو اتو چہ گفتی، چہ گفتی رے! نیم شبو ئے ......!" لیکن وہ بہت جلد تھک گئے۔ شکور دادا نے اپنی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ساری حسرتیں مجتمع کر کے نہایت پرسوز، گلوگیر لہجے میں کہا۔ "بڑے فن کار بنے ہو! رشید بیٹا سے اتنا بھی نہ کہلوا سکے کہ اس کو کتنا پرویں ...... ٹھنٹ ...... فنڈ کا روپیہ ملا ہے۔ ہائے کھیت کھر یدوا کے اُسے امیر بھی نہ بنوا لیو!"

اٹنگ پاجامہ، پھٹی بنیائن، کندھے جھکے ہوئے، سر نہوڑائے، آنکھیں زمین دوز، پر آنکھیں ہوں بھی۔ وہ تو گویا اندھا ہے۔ شمشیر دا نے آزردہ ہو کر سوچا، کاش اس کی آنکھیں ہوتیں

تو وہ بھی دنیا کے تماشے دیکھتا۔" "ہاں یار! بڑا امانے ہے میرے پھر دچیا"۔ شمشیر وا نے شرما کے کہا۔
"سات پُست حرامجادہ! کہے پھرے ہے کہ پھر دح جان پر عاسک ہیں۔ مُنہ تو دیکھے اپنا مُرغی چور!
مُرغے کا جنا!" اور شمشیر وا نے فن کار سے بھی یہ شکوہ کیا:

کیا ملا تم کو مرے عشق کا چرچا کر کے
خود بھی رُسوا ہوئے آخر مجھے رسوا کر کے

——— اور وہ تعداد میں تو تھیں۔ گوری، سانولی، گوارا اور ناگوار۔ بعض انھیں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوب صورت کوئی نہیں۔ سبھوں نے ایک ساتھ بڑھ کے فریاد کی۔ "فن کار بابو! آپ نے ہمیں بس ایک گڑیا کیوں بنایا؟ اور وہ بھی خوب صورت نہیں!" ——— اور گوپال نے فریاد کی۔ "مجھے تو موت ہی آئی شباب کے بدلے!" اور منگنی رام مارواڑی آگے بڑھا۔ بہت ہی موٹا تازہ تین من اس کا وزن تھا۔ یہ غریب ساڑھے تین سال سیناٹوریم میں رہ کر بغیر شفا یاب ہوئے واپس آ گیا تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ بولا۔ "تم جھوٹے ہو فن کار، جھوٹے یا جانب دار، میرے لئے کسی زہر سے تم نے لب و رخسار ارزاں نہ کروائے۔ میری خاطر تو کسی دیوی نے بِس گھول کر نہیں پیا۔ نہ محبت کے امرت میں ملا کر۔ نہ ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ بے ایمان!"

اور کرن پاگلوں کی طرح آگے بڑھا چیختا ہوا۔ "زندگی نہ خدا کے پاس ہے، نہ شیطان کے پاس، نہ کسی اور خالق کے پاس، ان سبھوں نے مل کر مخلوقات کے دل و جگر خون کئے ہیں اور بس! خون! خون! خون! خو.........ن!"

فن کار نے گھبرا کر اپنے بائیں ہاتھ کی مُٹھی بند کر لی اور آہ و بُکا کا ایک شور محشر اُٹھا۔ سارے کردار چیخنے لگے۔ اس نے اپنی مٹھی کھول دی، اس کے کفِ دست پر دیر تک شور مچتا رہا۔ آخرش سکون ہوا اور ——— ایک اور چہرہ فن کار کے مقابل میں آیا۔ "راشدہ کی زیست معلق سی تھی، بے بنیاد، کوئی وسیلہ ایسا نہیں تھا جو حیات کے مختلف حصّوں میں ربط، تسلسل اور موزونیت پیدا کر دے ....!" راشدہ نے جل کر فن کار سے پوچھا۔ "مجھے رومانی بنایا، میرے رومانوں کو مٹی میں ملایا اور اس پر ستم یہ کہ میرے سارے راز بھی افشا کر ڈالے۔ واہ!"

"پیشانی بالکل آپ کی طرح ہوگی اور آنکھیں ورڈزورتھ کی —— پر خدا نہ کرے کان آپ جیسے ہوں، ورنہ بالکل خرگوش معلوم ہو گا " پلٹ کر بیوی میاں دونوں نے فن کار سے کہا۔
"آپ نے تو ہمیں نام بھی عنایت فرمائے۔ تو پھر بے نام لوگوں کو آپ اولاد کیوں بخشتے! آپ کی تخلیق میں درد و گداز کیسے پیدا ہوتا بھلا! ہم تو آپ کے فن پر قربان ہوئے۔ شکریہ!"

اور ہجوم فن کار کے کفِ دست پر مظاہرہ کرنے لگا۔ نعرے لگنے لگے۔ احتجاجی شور و غل پیدا ہوا اور حسرتِ تعمیر و ناتمامی تخلیق کی لامتناہی شکایتیں پیش کرنے والا کرداروں کا ایک وفد فن کار کی نکہت کے ٹیلے پار کرتا ہوا اس کی کلائی تک بڑھ آیا۔

—— یوسف محبوب اس وفد کا لیڈر تھا، بولا۔ "بھائی جان! آپ فن کار نہیں، بدمعاش اور مجرم ہیں۔ مجھے پاگل ہی بنا دیا تھا تو میرے خوابوں کو حقیقت تو بن جانے دیتے۔ اگر میں برلا، ڈالمیا یا جمشید جی بن جاتا، تو آپ کا فن زیادہ دل چسپ ہو جاتا۔ آپ مردم آزار بھی ہیں اور احمق بھی! قصّے کی روح رواں کو آپ نے پاگل بنا دیا۔ واہ! چہ خوب! ننگا ڈوری ہے یہ! نہ ہوئی فرولی! کم از کم "فسانۂ آزاد" تو پڑھ لینا چاہئے تھا تجھے۔ میں آزاد سے بڑا ہیرو بن سکتا تھا اور لے کے تو نے مجھے کانکے پہنچا دیا۔ ابے تو خود کانکے کے قابل ہے......"

—— اور ایسا لگا کہ وفد کے سارے ارکان نے ایک ساتھ چیخ کر کہا۔ "ہم سب کو ٹیڑھا میڑھا کیوں بنایا؟ ڈھنگ کی ایک شخصیت بھی نہ بنائی۔ نہ بنانا آئے تو بگاڑو کیوں؟......"

پیارے پنڈت، سرور، سردار، اودو رسیر مجیب، جمیل انور، اور بیگم شمشیر الدولہ، کپتان ڈیوڈ امام، عذرا، شانتی، میر گھوسی، دیوان سنگھ وغیرہ وغیرہ کے چہرے ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ پس منظر میں سلمٰی سوکیتی کے پہلو میں منظر کا ڈول اُبھرا، اس کے تھرتھراتے ہوئے لب اور شربتی آنکھیں۔ آہ سرد کھینچ کر بولا۔ "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی!"

اچانک فن کار کے کفِ دست پر نارنگ رات چھا گئی اور یوسف محبوب کے سامنے ایک سیاہ گداز جسم اپنی فطری صحرائی صحت مندی کی لہک لئے ہوئے چمکا...... آدی باسی لڑکی بولی۔ "مالک یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے!" اور ایک شورِ قیامت برپا ہوا۔ چاروں طرف آدی باسی چہرے اُبھرے۔ منگا، ٹیرکی اور اَن گنت آدی باسی مزدور اور کسان یہ سب

کردار اپنے تیر کمان لیے فن کار کے سینہ کی طرف دوڑ پڑے اور جھار کھنڈی بولیوں میں چیخ چیخ کر بولنے لگے۔ "فن کار! اپنی دنیائے تخلیق میں تم نے آدی باسیوں کو اہم جگہ کیوں نہ دی؟ ہم سب بھرتی کے کردار بنائے گئے۔ دنیا تو تم نے بس محبوب، بیگم شمشیر الدولہ اور سلمیٰ سوگیتی کی بنائی۔ جھار کھنڈ زندہ باد! فن کار مردہ باد!"۔ اس وحشی جلوس کے پیچھے بھٹکتا ہوا سیکھ جہور "انار کلی اور بھول بھلیاں" کی پتریا کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ وہ سائیکل پکڑے ہوئے تھا اور اس کے پیچھے اور بہت سے کردار تھے۔ ایک اور شور مچا۔ "ہم کو شکایت کا موقع بھی نہ ملا! ہم شکوہ بھی نہ کرسکے! انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!"

فن کار نے بڑے رعب داب کے ساتھ باآواز بلند کہا۔ "خاموش!" اور اس کے بائیں کفِ دست پر سناٹا چھا گیا۔

فن کار نے بڑے وقار سے کہا۔ "اے کردارو! اپنے خالق کا احسانِ تخلیق بھول گئے۔ بڑے عجلت پسند اور ناشکرے ہو۔ میں تمھیں عدم سے وجود میں لایا۔ تم بے نام و نشان تھے۔ میں نے تمھیں شخصیت بخشی اور تمھاری شخصیت کو انفرادیت عطا کی اور تمھیں قابلِ ذکر بنایا۔ میں نے تمھیں آزادی اور لچک داری سے نوازا۔ مگر تم عقل، تدبر اور فکر سے کام نہیں لیتے۔ تمھارے اندر یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں۔ مگر تم صرف اعتراض کرتے ہو۔ شکوہ شکایت پر اتر آئے ہو۔ کیا انقلاب ذہن و فکر ہے کہ خلقت خود خالق کا حساب لینے پر تل گئی ہے۔ جمہور آمر و حاکم کا محاسبہ کر رہے ہیں اور آمر بھی وہ جو تمھارا خالق اور تمھاری پرورش و تربیت کرنے والی ہستی ہے۔ سنو، غور کرو اور سمجھو، خالق کو یہ حق ہے کہ وہ جیسا چاہے بنائے۔ فن کار تخلیق کی جدت و بداعت میں آزاد ہے۔ طربیہ کردار ہو یا المیہ، برا ہو یا بھلا۔ فن میں نیرنگ و تنوع کے بغیر نہ حسن ہے، نہ تاثیر۔ آزاد فن کار نے تمھیں بھی آزاد و ممتاز پیدا کیا۔ کاش تم احسان مانتے!"

"باز آئے ہم آزادی و امتیاز سے۔ اس کی قیمت بہت گراں ادا کرنی پڑی، ناتمامی، محرومی، دردمندی، دل ریشی، مظلومی......"

مجمع فن کار کے کفِ دست پر جوش سے بولتا رہا اور فن کار اپنی مخلوق سے مایوس ہونے لگا۔ وہ یاس و غمگینی میں مبتلا ہو گیا۔ کیا وہ اپنے فن کی توانائی کی تخلیق پھر سے کرے؟ کیا وہ اپنی

تجدید آپ کرے؟ اس نے پھر ایک بار اپنی مخلوق کو سمجھانا چاہا۔

"یہی سچی بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ یہی حق ہے کہ میں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق تمھارے وجودوں میں بڑے امکانات پیدا کیے۔ فن کار کی قوتِ اختراع اور اس کا بے ساختہ پن ایک لطیف و پرحکمت مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوا اور تم پیدا کیے گئے۔ تمھارا وجود عبث نہیں۔ ابدیت تمھارا انعام ہے۔ اور فانی انسانوں کو حساس، ذکی، ہمدرد اور ذہین بنانا تمھارا کام۔ ان کے اندر انقلابِ فکر و نظر برپا کرنا تمھاری تخلیق کا مقصد۔ تم اپنے خالق کی نعمتوں کا کب تک انکار کروگے؟"

میدانِ حشر میں پھر ایک شور مچا۔ "یہ جبرِ تخلیق ہے!...... یہ خود بینی ہے!...... ڈبویا مجھ کو ہونے نے!...... مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟...... جہاں تیرا ہے یا میرا؟...... انسانوں کی کج روی سے ہمیں کیا؟...... قصۂ آدم کو ہمارا لہو کیوں رنگیں بنائے؟......"

فن کار سوچنے لگا ___ "تخلیق دردِ سر نہیں، اذیتِ روح، دردِ ذہن و کربِ دل ہے۔ آہ میری مخلوق تیر اور وجگر میرے غم کے سامنے ہیچ ہے!"

اور فن کار کی بے قرار روح کے اندر ایک آواز گونجی ___ "تم نے سپنوں کا دیس پیدا کیا اور خود طلسم سازی پر تل گئے۔ تم کائنات کا راز جاننا چاہتے تھے اور تمھیں حسرت کے سوا کچھ نہ ملا۔ بھٹکنے والے امام! تم یہ بھی نہیں جانتے کہ امیبا ہو یا جیلی فش، مینڈک ہو یا بیبون، گوریلا ہو یا ڈارون۔ تم اپنی زہریلی روح کی محض ایک پہیلی ہو۔ تم بالِ جبریل بننے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہو۔ تم شیئیت کی بگڑی ہوئی تصویر ہو، ملعون!"

فن کار کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس پر انتہائی یاس و حسرت طاری تھی۔ دل جیسے آخری سانس لے رہا ہو۔ وجود جیسے فنا ہو رہا ہو۔ دور کہیں فائر انجن خطرے کی گھنٹیاں بجاتا ہوا تیز جا رہا تھا۔ شہر میں آتش زدگی کی وبا آئی ہوئی تھی، زندگی جل رہی تھی۔ انسانیت کے ساز و برگ خاکستر ہو رہے تھے۔ اس کے لاشعور سے ایک مصرع ابھرا۔

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

"سپنوں کے دیس میں" ۱۹۶۹ء

جراحتِ دل

روشنی کی بارش ہو رہی تھی۔ چھت سے آویزاں چینی کے بڑے بڑے ڈوم میں بجلی کے کئی پُرقوت قمقمے آپریشن کی میز پر روشنی بکھیر رہے تھے۔ ڈوم کے دائرے میں ایک سینہ چاک آدمی کا لال لال دل، شریان و وریدیں، رگ و ریشے، پسلیاں، عضلات اور بریدہ جلد سب کچھ منعکس ہو رہے تھے۔ مریض کے جسم کے اندر، اوپر اور میز کے سُرخ ربر پر آرٹری فورسپ، کلپ، مختلف قسم کے فورسپ، اسکیل پل، روئی، چھوٹے چھوٹے تولئے منتشر تھے۔ دوہرے ایپرن پہنے ہوئے ڈاکٹر، نرسیں، ہاؤس سرجن، سنیئر طلبا، میز کے گرد طرح طرح کے زاویوں میں کھڑے یا جھکے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے چوڑی پٹیوں سے اپنے ناک منہ ناگا سادھوؤں کی طرح بند کر رکھے تھے۔ بڑے بڑے چمکتے ہوئے ڈریسنگ بکسوں کی سطح پر اور روشنی کے ڈوم میں عجیب عجیب ہیئتوں اور نقاشوں کے عکس پڑ رہے تھے بے ہوش کرنے والی ایتھر سے ملی دوا کی بو تمام پھیلی ہوئی تھی۔ آکسیجن سلنڈر سے ربڑ کی نلکی نکل کر زیرِ جراحت مریض کی ناک تک پہنچتی تھی۔ ایتھر اور آکسیجن باری باری استعمال کئے جا رہے تھے۔ ماہرین مریض کی نبض اور سانس کی رفتار کا بار بار جائزہ لے رہے تھے۔ کبھی کبھی آہستہ آہستہ لوگ باتیں کرنے لگتے تھے اور سرجن شہاب کے احکامات کی طرف دھیان لگائے ہوئے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپریشن کمرے کا درجۂ حرارت ضبط و نظم میں رکھا گیا تھا۔ پھر بھی کام میں انہماک اور محویت کی وجہ سے سرجن شہاب کی بلند و تاباں پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور وہ کھلے ہوئے دل کے ایک اندرونی خانے کی ماؤف بلبلی کی جگہ پر ایک مصنوعی بلبلی لگا رہا تھا۔ آپریشن کا مرکزی مرحلہ کامیابی سے

ختم کر کے اسکے ذہن کو ذرا فرصت ملی اور اس نے سوچا۔ کاش ریحانہ کا آپریشن مرض کی ابتدا ہی میں ہو جاتا۔ بڑی ضدی ہے۔ ریومیٹزم کے پہلے حملے کے بعد ہی ڈاکٹروں نے اسے آرام کرنے کو کہا تھا لیکن اس نے ایک نہ سنی ....

شہاب آپریشن روم میں واپس گیا۔ اور دل کے شگاف کی اسٹچنگ میں لگ گیا۔ پھر پیری کارڈیم کی سلائی کی۔ پسلیوں کو ٹھیک ٹھیک بٹھایا اور جوڑا۔ جھلیوں اور عضلات کو درست کیا اور آخر میں کٹی ہوئی جلد میں اسٹچنگ کی جانے لگی ....

ملہوترا! سانس کی رفتار؟ بنرجی! آکسیجن! محمود! نبض!

سرجن شہاب نے جلد کی سلائی کا آخری مرحلہ اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کیا اور اپنے خاص ملحقہ کمرے کی طرف چلا گیا۔

کافی کی سہارا دینے والی خوشبو اور ایک حوصلہ افزا گھونٹ نے شہاب کو ریحانہ تک پہنچا دیا ...... ریحانہ کے دل کا آپریشن کرنا ہوگا۔ لیکن اب صرف پسلی کے اصلاح سے کام نہیں چلے گا۔ دل کے عضلات ماؤف ہو چکے ہیں۔ وہ کب تک اس طرح لیٹی رہے گی۔ اپنے جنازے کو آپ گھورتی رہے گی؟ بستر کی قبر میں آکسیجن سلنڈروں کے منکر نکیر اس کے سرہانے کب تک کھڑے رہیں گے؟ ...... شہاب کے دل میں درد سا اٹھا۔

"اچھا حال ہے سر"

"محمود، بنرجی، اور ملہوترا نے بیک وقت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رپورٹ پیش کی۔ گرم کافی کا آخری گھونٹ ختم کر کے سرجن شہاب آپریشن تھیٹر میں واپس جاتے ہوئے بولا۔

"بیرا! ہم سب لوگوں کے لئے کافی اور سنڈوچ تیار رکھو ...... مبارک ہو! آپریشن کامیاب ہوا۔ ایک ہفتہ میں مریض دوڑتا ہوا اپنے گھر جائے گا۔ سبھوں کا شکریہ"

موت کی لڑائی میں ہماری فوج کو فتح مبارک ہو! لیکن ہر وقت چوکس رہنا ضروری ہے ...... مریض کو ابھی ٹمپریچر کنٹرول روم میں رکھو!"

مریض کو پہیہ دار آپریشن میز پر کنٹرول روم میں لے جایا گیا۔

سرجن شہاب کارڈیک سرجری کا عالمی شہرت رکھنے والا ماہر تھا۔ اس نے انگلستان

اور کینیڈا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ دل کے بہت سارے آپریشن خود کیے تھے اور بہت سے معرکہ آرا آپریشنوں میں عظیم سرجنوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ تبدیلیِ قلب کے دو کامیاب آپریشنوں میں شمولیت اس کے تازہ ترین کارناموں میں شمار کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں اسے ایک بار انگلستان اور دوسری بار امریکا خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

پشاور کے قریب شمالی مغربی پہاڑیوں کے درمیان ایک پُر فضا سطحِ مرتفع پر شہاب نے امراضِ قلب کے لیے اپنا میڈیکل کلینک قائم کیا تھا۔ اس کے مددگار سرجنوں میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کئی ماہرین تھے۔ دو ہندوستانی بھی اس کے شریکِ کار تھے، جو کینیڈا سے اس کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ شہاب خود بھی ہندوستانی مہاجر تھا۔ اس کا خاندان تقسیمِ ہند کے فوراً بعد ہی پٹنے سے پاکستان چلا آیا تھا۔

شہاب نے اپنے بنگلے کے سادہ مگر آرام دہ ڈرائنگ روم کے ایک دریچے کو کھولتے ہوئے سوچا۔ یہ نیلے نیلے پہاڑ نہ معلوم کیوں اتنے خیال انگیز ہوتے ہیں۔ یہ کہستانی سلسلے پُرپیچ یادوں کو ماضی سے پکار کر بلا لاتے ہیں۔ میری زندگی یادوں کا ایک سنگستانی سلسلہ ہے، جس میں خال خال سبزہ زار ہیں۔ اور یہ سبزہ بھی سوکھتا جاتا ہے۔ ریحانہ تم بہت ضدی ہو لیکن اب تمھیں فیصلہ کرنا ہو گا۔ میں اب بھی تمھارا منتظر ہوں۔ میرا فن تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے صرف تمھاری خاطر کارڈی ایک سرجری میں مہارت حاصل کی۔ تم تو مجھے چاہتی تھیں ریحانہ پھر کیوں بدل گئیں۔ تم نے اپنی بیماری کو جان بوجھ کر بڑھایا۔ مجھ سے بھی کنارہ کش ہو گئیں۔ تم عجیب ہو۔ میں تمھارے دل تک پہنچا اور اس سے باہر نکال دیا گیا۔ میں تمھارے دل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہ میری محبت کا وطن تھا۔ کب دل کے دریچے بند ہوتے ہیں اور کب کھلتے ہیں۔ کون جانے۔ دل بدلتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میرے دل میں تم اب تک مکیں ہو ریحانہ۔ تم ایک معمہ ہو۔ شاید میرے وطن میں میری محبت اب تک کہیں چھپی بیٹھی ہو۔ یہ فریبِ تسکین ہے یا حقیقت۔ مجھے معلوم نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرا دل تمھاری نگاہِ اوّلیں کی جراحت سے ہنوز چاک چاک ہے۔ تم اپنی مہربان پلکوں کی سوزن سے اُسے سی دو۔

شہاب کے حافظے کے راکٹ نے دوسرے مرحلے پر پہنچ کر ایک جست لگائی ـــــ

سرحدی پہاڑوں کے راز پرور دھندلکے سورج کی کرنوں سے ڈر کر گھاٹیوں میں جا چھپے تھے۔ شہاب ابھی تک کھلے ہوئے دریچے کے سامنے کھڑا تھا۔ دیا سلائی پر رگڑ پڑتے ہی راکٹ نے چھلانگ لگائی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کے اندر سے ایک شہر ابھرا، عظیم آباد، جو پاٹلی پتر بھی تھا، عظیم آباد اور پٹنہ بھی ہے۔ شہاب کا تخیل تصویر آفریں اور صنم ساز تھا۔ وہ ٹیکسلا، دلی اور لکھنؤ گھومتے ہوئے پٹنہ پہنچا۔ اس کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ وہ اس کی محبت کی رو دشنیوں کا شہر تھا۔ شہاب کو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب سے محبت تھی، پٹنے سے محبت تھی، ———— ریحانہ سے محبت تھی۔ اس نے سوچا۔ کاش لوگوں کے دل بدل جاتے۔

وہ سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ مرغولوں سے تاریخ ابھری، تہذیبیں ابھریں، شہر محبت ابھرا، اور ریحانہ کا حسین مگر سوگوار چہرہ ابھرا۔ یہ حسین چہرہ افق افق ہر شئے پر چھا گیا۔ پھر وہ پیارا چہرہ شہاب کے دل میں جا چھپا۔ دل وقت کی طرح دھڑکتا رہا۔ اور حافظ کا راکٹ کیپسول ماضی بعید میں جا پہنچا۔ بانکی پور کی نچلی سڑک کے قریب ایک چوڑی گلی سے ملحق افتادہ زمین کے بیچوں بیچ دو گھنیرے پیپل اور برگد کے درختوں کے درمیان ایک زرد دو منزلہ مکان پر اسرار انداز میں سانس لے رہا تھا۔ ٹین کا پھاٹک گلی میں تھا۔ سامنے ایک دیوار حائل تھی، جس کے بائیں جانب ایک دروازہ براہ راست آنگن میں کھلتا تھا اور داہنی جانب ایک لکڑی کی بوسیدہ سیڑھی کوٹھے کی چھت پر بیچاتی ہوئی چڑھ جاتی تھی۔ دس بجے دن کے قریب اس مکان میں تھوڑی دیر کے لئے کچھ رونق سی ہوتی اور پھر سناٹا۔ شام کے پانچ چھ بجے رونق لوٹ آتی اور غروب آفتاب کے بعد ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ ایک لالٹین کوٹھے پر جلتی رہتی اداس یک و تنہا۔ ان کی زرد روشنیاں مکان کی زردی کو زرد تر بنا کر تاریکی میں محلول کرتی رہتیں۔ ہم سایہ درختوں پر قازوں اور بگلوں کا بسیرا تھا۔ سر شام یہ پیڑ بہت آباد اور بہت چونچال ہو جاتے۔ پرندے اپنے نشیمن کو واپس آتے، پر مسرت شور مچاتے اور سورج ڈوبتے ہی خاموش ہو جاتے۔ ان کی خاموشی زرد مکان کی خاموشی کو اچانک زیادہ محسوس اور بہت پر کشش بنا دیتی۔

محلے والے اس زرد مکان کو بلادری کی حویلی، کہنے لگے تھے۔ ایک تیس سالہ کنوارا دراز

ریش جوان، چار کنواری جوان لڑکیاں اور ایک نہایت گوری چٹی بوڑھی خاتون، 'پادری کی حویلی' کے مکین تھے۔ کبھی کبھار ایک ملازم چھوکرا یا کبڑی سی خادمہ بھی وہاں نظر آجاتی تھی، معمر خاتون بیوہ تھیں، ان کے مرحوم شوہر وکیل تھے۔ ایشیائی جوان بی۔ اے پاس کرکے خاکسار تحریک میں شامل ہوگیا، مختلف قومی پارٹیوں میں رہا اور آخر کاران سبھوں کو بے قدر شوق نہ پاکر خانہ نشیں ہوگیا۔ ایام طالب علمی میں بڑی فلسفیانہ بحثیں کیا کرتا تھا اور اب درود وظائف کی طرف مائل تھا۔ ذوقِ سے زیادہ نوافل اور عملیات کی جانب توجہ تھی۔ اس لانبی، بھوری داڑھی، گورالمبوترہ چہرہ، لانبا کرتہ اور عربی پاجامہ والے شخص کو سب پادری کہتے تھے۔ اسے تری پولیا کے بڑے کیتھولک پادری سے بے حد مشابہت حاصل تھی۔

پست قد، گداز جسم، گول چہرے، کمھلائی ہوئی سفید رنگت اور تیز عقابی آنکھوں والی بڑی کنواری بی۔ اے پاس کرنے سے پہلے دل شکستہ ہوکر خانقاہ نشیں ہوگئی تھی۔ الہ آباد سے آنے والی ایک دبی دبی افواہ تھی کہ بڑی کنواری سے نہایت تقویٰ پرور قسم کا رومان وابستہ ہوگیا تھا لیکن اسے راس نہ آیا اور اب یہ حال تھا کہ کنبے میں دور و نزدیک، کار، دکوٹھی، کیکیشن رکھنے والے "تکافیئے" نایاب ہوگئے تھے۔ دو بڑی بہنوں کی شادی قبل ہی دو تکافیوں سے ہو چکی تھی۔ تیسری کے لئے بڑی میں، ہڈی ملانے والے کسی خاندانی شہزادے کا صبر آگیں انتظار تھا ...... پادری کی حویلی کی بڑی کنواری پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتیں، پابندی سے رمضان کے روزوں کے علاوہ رجب، شعبان، محرم، ربیع الاول وغیرہ کے نفلی روزے رکھتیں، پُرتکلف افطار اور سحری کرتیں، رات کے کھانے سے بھی غفلت نہیں برتتیں۔ تلاوت میں مشغول رہتیں، دعائے گنج العرش چن چن کر پڑھتیں۔ ستر حج کا ثواب بٹورتیں۔ اور ہر وقت سر پر آنچل [illegible] رہتیں۔

پادری کی حویلی میں پچیس ۲۵ سالہ بڑی کنواری کے بعد منجھلی، سنجھلی اور چھوٹی کنواریاں، بائیس، بیس اور اٹھارہ سال کی عمر کی ہوں گی۔ منجھلی شعلۂ جوالہ تھی۔ سرخ و سفید رنگ، بھنویں تراشیدہ پتہ، نشیلی آنکھیں، چھریرا بدن، گھنیرے سنہرے لہراتے ہوئے بال۔ کم سن مولسری کے پودے جیسا قد، [illegible] چال اور تیز مرتعش آواز۔ گویا نگاہوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ایم۔ اے پاس

کرکے ایک عیسائی زنانہ کالج میں لکچرر ہو گئی تھی اور بڑی کنواری کی نسل کے مرکھنے کا انتظار کررہی تھی۔ منجھلی کنواری سانولی سلونی، دراز قد، نرم خو، منکسر، لیکن بے حد بیدار آنکھوں والی تھی۔ اس کے مضبوط کینڈے کے مردانہ پن کو بریدہ زلفیں اور نمایاں کیے دیتی تھیں۔ شاید سائنس کی طالبہ ہونے کی وجہ سے اسے بال ترشوانے پڑے تھے وہ جوڑا باندھنے کی عادی نہیں تھی اور گیسوئے پریشاں کو برنر کی لو سے لاگ تھی۔ لیکن اس کے شانوں کے درمیان واضح نسائیت موجود تھی۔

کنجھلی کنواری۔ چنبیلی کی ادھ کھلی کلی کی طرح تھی۔ نرم سفید ہلکی خالسئی رنگت اور کومل زردی لیے ہوئے سنہرے لانبے بال، شربتی شرمیلی مگر چمکتی ہوئی آنکھیں، کتابی چہرہ، ستو، بجل، سجے سجے دمکتے ہوئے دانت، رسیلی آواز، پھاگن کی برہنہ صبح جیسی مسکراہٹ اور لجائی ہوئی ہنسی کے درمیان ابھرتی ہوئی بالے پن کی موہنی خوشبو بڑے بھولے پن سے دل نشیں ہو جاتی تھی۔

سگریٹ کے دھوئیں اور خیالات و تصورات کے مرغولے رقص کرتے رہے۔ سرجن شہاب نے بار بار اپنے کو "پادری کی حویلی" میں داخل ہوتے اور نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ زرد مکان کی نچلی منزل کے دالان میں بڑی بی کو خاموش بیٹھی ہوئی فضا میں گھورتے ہوئے پاتا۔ بڑی بی عادتاً بہری ہو چکی تھیں۔ اور مصلحتاً نابینا۔ دالان کے متصل بچھلے کمرے کے تخت پر زروت کو عموماً سویا ہوا یا کسی زیارت میں جانے کی تیاری میں مشغول دیکھتا۔ حکمت گلی برتتے ہوئے وہ کچھ دیر انھیں لوگوں کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور پھر کوٹھے پہ چلا جاتا۔ کوٹھے پر دو کمرے تھے۔ ایک میں نسیم رہتی تھی اور دوسرے میں فرحت اور ریحانہ۔ تینوں بہنیں اسے شام کو کھلی چھت پر ملتیں۔ نسیم اسے قصے سناتی۔ ادبی گفتگو کرتی اور کبھی شعر و شاعری کے چرچے ہوتے۔ فرحت شعر وادب کا مذاق اڑاتی اور ریحانہ ہر بات پر مسکرا دیتی۔

شہاب پٹنہ میڈیکل کالج میں ہاؤس مین تھا اور شہرۂ آفاق سرجن، بوتراب قلی کا چہیتا اسسٹنٹ بن گیا تھا۔ سرجن قلی اپنے فن میں بڑی مہارت تو رکھتا ہی تھا، وہ ایک مثالیت پرست دانشور اور سماجی احساس رکھنے والا انسانیت دوست شخص بھی تھا۔ شہاب کی شخصیت سرجن قلی کے سیرتی سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ مرشد و مرید دونوں ہر دل عزیز تھے۔ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے زہر سے یہ دونوں بالکل محفوظ رہے تھے۔ وہ انسانیت کش حالات پر کڑھتے

رہتے اور اپنی اپنی بساط بھر اپنے وطن کو مجروح ہونے سے بچانے کی کوششوں میں لگے رہتے۔

مرغولوں کے بادلوں سے خون کی بارش ہونے لگی۔ بچلپر کوارٹر کی فضا سے بور ہو کر وہ بعض دفعہ سویرے ہی پادری کی حویلی چلا آتا تھا۔ اس وقت تک نسیم، فرحت اور ریحانہ کالج سے واپس نہیں آئی ہوتیں تو پادری وہاں ضرور مل جاتا۔ وہ چھت پر ٹہل ٹہل کر کوئی مذہبی کتاب زور زور سے پڑھتا ہوا ملتا اور شہاب کو بالکل خاطر میں نہ لاتا۔ جب کنواریاں آجاتیں تو پادری، نچلی منزل کو چلا جاتا۔

دھوئیں کے مرغولے سے پادری نکلا اور زرد حویلی کی کھلی چھت کے شمالی حصے میں دھیرے دھیرے ٹہلنے لگا۔ اس نے شہاب کو نہیں دیکھا۔ وہ بالجہر ورد کر رہا تھا۔

"قل اعوذ...... قل اعوذ...... اوں ہنہ...... اوں ہنہ! قل اعوذ...... اوں ہنہ!"

علی وارث صحیح قرأت کی سعیِ بلیغ میں سرگرداں تھا۔ کوئی مخصوص دعا تھی جس کی تاثیر صحیح قرأت کے بغیر ناممکن بتائی گئی تھی۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر عجیب پراسرار حرکتیں بھی کر رہا تھا۔ شہاب گھبرا کر نسیم کے کمرہ میں جا بیٹھا اور بال جبریل پڑھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر سامنے اٹھ گئی۔ دونوں کمرے کے مشترک دروازے کے چوکھٹے میں ریحانہ بت بنی کھڑی تھی۔ شہاب کو اب معلوم ہوا کہ وہ دیر سے اسے دیکھ رہی ہے۔ انھیں نگاہوں کی شعاعوں سے بن دیکھے متاثر ہو کر وہ چونکا تھا۔ ان خاموش متمنی نظروں نے شہاب کے دل کی دھڑکنوں کو نیا سرگم عطا کر دیا۔

"ریحانہ!" اور وہ جا چکی تھی۔

شہاب نے اپنی قسمت کا ستارہ پالیا تھا۔ چاروں کنواریوں میں سے ایک نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ آہستہ آہستہ اس کشش میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ اوروں کی توجہ میں کمی ہوتی گئی۔ معلوم نہیں کیوں علی وارث اب اس سے ناراض رہنے لگا۔

شہاب مغرب کے تھوڑی ہی دیر بعد واپس ہو جایا کرتا تھا۔ اسے آپریشن تھیٹر جا کر سرجن علی کے ساتھ آپریشن میں شریک ہو جانا تھا۔ مشغولیت کے باوجود وہ وادیِ ریحانہ کی طرف جاتا

رہا ہے۔ صرف تین کنواریاں چھت پر ہوتیں۔ لیکن کبھی کبھی ثروت بھی آنکلتی اور ہر بار کسی نہ کسی پر کوئی تیز طنز کر جاتی۔ عموماً شہاب ان طنزوں کا نشانہ بنتا۔ نسیم اور فرحت کی دست برداری کے باوجود شہاب سے ان کا ربط ایسا پرفیلا بھی نہیں ہو گیا تھا کہ خوش دلانہ ہنسی مذاق کے پھول سرِ شام نہ کھلتے۔ لیکن علی وارث اور ثروت دونوں شہاب کی طرف سے دن بدن تلخ تر ہوتے جا رہے تھے۔

شہاب کے وارڈیا آپریشن تھیٹر چلے جانے کے بعد پادری کی حویلی پر گھٹن پیدا کرنے والی خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ علی وارث عملیات میں مشغول ہو جاتا۔ ثروت کھانا کھا کر چادر تان کر سو رہتی۔ نسیم ٹُوریل کی کاپیاں دیکھ دیکھ کر بے حد بور ہوتی رہتی۔ فرحت سائنس کے فارمولے یاد کرنے میں لگ جاتی اور ریحانہ، جس نے شہاب کے کہنے کے باوجود سائنس نہیں لیا تھا، مومن اور میر کی غزلیں یا کیٹس اور شیلی کی نظمیں پڑھتی اور آہستہ آہستہ آہیں بھرتی۔

ریحانہ سنجیدہ، متین اور تخیل پرست تھی۔ والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہو چکا تھا اور والدہ اپنے چار بیٹوں اور چھ بیٹیوں کے درمیان بے اثر ہو کر رہ گئی تھیں۔ گھریلو محبت کی فضا بجھی بجھی سی تھی۔ اور ماحول میں انتشار پایا جاتا تھا۔ حویلی پر ثروت کی ناکامیاں آمریت کا سایہ خود اس کی ناآسودگی اور دوسروں کے اضطراب اور بغاوت کا موجب بن گیا تھا۔

ریحانہ جذبات کی تشنگی اور حالات کے کرب کو شدت سے محسوس کرتی مگر سارے زہر کو اپنے دل میں گھول لیتی۔ اس کا تبسم بھی دردناک ہوتا۔ وہ برملا اظہارِ محبت سے قاصر تھی لیکن اس کی نمناک آنکھیں، اس کا عنوانِ نظر، اس کی محویتِ انتظار اور علیحدگی کا خاموش درد، ریحانہ کی جاگی ہوئی خاموشی کو گویا بنا چکا تھا۔

۱۹۴۷ء کی برسات میں لہو کی برکھا بھی ہوئی اور پانی بھی خوب برسا۔ سیلاب آئے۔ آدمیت اور آدمی ڈوب مرے۔ اسی برسات میں ایک شام ریحانہ کالج سے آتے ہوئے زوردار کی بارش میں رکشے پر شرابور ہو گئی۔ گھر پہنچی تو اس وقت بھی موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ چھت پر دو کمروں سے بننے والے زاویے میں برسنے کے پانی سے اس نے فرحت کے ساتھ مل کر خوب نہایا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ سنکی ہوئی اُتری پُروائی چل رہی تھی۔ رات ہی کو ریحانہ شدید بخار میں

مبتلا ہو گئی۔ اور صبح اس کے ہر جوڑ بند میں بے حد درد تھا۔ دوپہر تک جوڑوں میں ورم، سرخی اور سوزش بھی پیدا ہو گئی تھی۔ ریحانہ پر بحرانی کیفیت طاری تھی۔ ڈاکٹروں نے "ریومیٹزم" کا مرض تشخیص کیا۔ دریافتِ حال سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ آٹھ نو سال کی عمر میں ریحانہ پر "وجع المفاصل" کا حملہ ہوا تھا۔ غالباً اسی وقت قلب پر ضرب پڑی تھی۔ آلے سے دل کی آوازوں میں "مرمرہ" صاف سنائی دیتا تھا اور قلب کی مریضانہ کیفیت کا دائرہ وسیع تھا۔ طبی مشورے کے ماتحت ریحانہ کو تین ماہ تک پلنگ پر آرام کرنا چاہیے تھا۔

ایک ہفتہ تک بخار رہا۔ درد کی شدت آسپرین نے بہت کم کر دی۔ ریحانہ کو سوڈی سیلیسیلیٹ مکسچر سے سخت نفرت تھی۔ پھر بھی شہاب کے کہنے سے وہ تلخ گھونٹ پی جاتی تھی۔ بخار اترنے کے بعد ریحانہ چند دنوں تک تو بستر پر آرام کرتی رہی۔ لیکن اس عرصے کے بعد طبی ہدایات پر اچھی طرح عمل نہ کر سکی۔ اس علالت کا ایک خوش گوار پہلو یہ تھا کہ علاج، عیادت اور تیمارداری کے فرائض انجام دیتے ہوئے شہاب ریحانہ سے بہت قریب ہو گیا۔

محبت عجیب عجیب کرشمے دکھاتی ہے۔ لیکن اس کی کرشمہ کاریاں غضب بھی ڈھاتی ہیں۔ عالمِ محبت میں انسان کی غیر متوقع صلاحیتیں ابھر آتی ہیں۔ محبت بدگمانیاں سکھلاتی ہے۔ گریہ تاب بھی کرتی اور توقعات پیدا کر دیتی ہے۔ یہ نیاز آگیں بھی ہے اور ناز پرور بھی۔ اعتماد اور شکوک و شبہات ہی اس کے جلو میں ہوتے ہیں۔ یہ امرت بھی ہے اور زہر بھی۔ نہ جانے کب محبت کون سی کروٹ بدل لے۔

ریحانہ نے شہاب کی خاطر بہت احتیاطیں کیں۔ لیکن کسی طرح اسے معلوم ہو گیا کہ [illegible] کے دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔ کبھی اگر کبھی [illegible] ڈاکٹروں کی [illegible] شہاب کو سخت فکر لاحق رہتی اور وہ ریحانہ کو سمجھایا کرتا کہ اسے بستر سے بالکل بھی نہیں اٹھنا چاہیے [illegible] تین مہینوں میں دل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ وہ بڑے بھلے تین ماہ بار بستر رہی اور اس کے بعد بھی اسے بڑے نپے تلے انداز میں رہنے سہنے کا حکم ملا۔ شہاب کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ریحانہ اصول کی پابندی نہیں کرتی۔

ایک سال بعد شہاب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کا امتحان دینے انگلستان چلا گیا اور وہاں

ایک اسپتال میں اس نے ملازمت کر لی۔ وہاں دو سال مقیم رہا اور اس عرصے میں اس نے ایف۔ آر۔ سی۔ اس کے دونوں پارٹوں میں کامیابی بھی حاصل کر لی۔ اور امراض دل کے اسپتال میں ایک ماہر فن کے ساتھ کام بھی کرتا رہا۔ ریحانہ کی محبت بڑھتی رہی اور سلسلۂ مراسلات بھی جاری رہا۔ لیکن وہ اس کی صحت کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ وہ اپنی فکرمندی کا بار بار اپنے خطوں میں ذکر کرتا رہا اور ریحانہ سے التجا کرتا رہا کہ وہ طبی مشورے پر عمل کرے۔ اور ستم یہ ہوا کہ اس کے ولایت سے لوٹنے کے قبل ریحانہ پر ریومیٹزم کا تیسرا حملہ ہوا اور اس کی حالت اندیشہ ناک ہو گئی۔

جب شہاب انگلستان سے واپس آیا تو اس نے ریحانہ کو ذی فراش پایا۔ لیکن اب کے دفعہ وہ بالکل لاپرواہ ہو گئی تھی۔ احتیاط بالکل نہیں کرتی تھی۔

شہاب بے تابانہ زرد مکان کی دوسری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اس کا دل جذبات سے لبریز ہو کر چھلک رہا تھا۔ وہ چھت سے گذر کر ریحانہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی ایک اُردو ناول پڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح پڑھتی رہی۔ پھر کتاب سرہانے رکھ کر بیگانگی سے شہاب کی طرف متوجہ ہوئی۔

شہاب نے پہلے یہ سمجھا کہ وہ ناز کر رہی ہے لیکن یہ انداز ملاقات کے اختتام تک قائم رہا۔ اور روزانہ ریحانہ کا یہی رویہ رہا۔ مجبوراً شہاب بھی 'پادری کی حویلی' آنے میں جھجکنے لگا۔ اور جب بھی وہ بے قرار ہو کر آیا، ریحانہ کی روش نہ بدلی۔ شہاب کی حیرت بڑھتی گئی اور امید سوتی رہی۔

ایک روز شہاب نے دیکھا کہ اس کے رخصت ہونے سے کچھ پہلے ہی ریحانہ نے کتاب اٹھائی اور منھ پھیر کر پڑھنے لگی۔ اس بے رخی سے شہاب کا دل خون خون ہو گیا۔ جب وہ اٹھ اور کمرے سے باہر نکلنے لگا گوشۂ چشم سے اس نے دیکھا کہ کتاب کی اوٹ میں ریحانہ کی خوب صورت آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں اور وہ بڑے ضبط سے آنسو پی رہی ہے۔ مگر وہ رکا نہیں۔ زینے سے اتر گیا۔

باتوں باتوں میں شہاب نے ریحانہ کے ـــــ اس دل شکن رویّے کا ذکر نسیم سے کیا۔

"ریحانہ ایک معمہ ہے۔ آخر اب اتنی بیگانہ وشی کیوں؟"

"وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔ رانو نہیں چاہتی کہ تمہارے لیے بوجھ بنے۔"

"رانو اور میرے لیے بوجھ، اس کا یہ احساس میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ریحانہ نے اس

بات کا اظہار کیا ہے ؟"

"شہاب! تم لوگ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ عورت کے ایثار میں اس کا پندار چھپا ہوا ہے۔ رانو اپنے دل پر پتھر کی سل رکھے ہوئے ہے۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا لیکن میں خوب سمجھتی ہوں کہ وہ قلب کی ناقابل علاج بیماری کی حالت میں تم پر بارِ گراں بن کر اپنے کو ہلکا کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی محبت کو بھی اپنی خودی پر قربان کر سکتی ہے۔"

"تم عورتیں!" شہاب کراہا۔

"محبت بے وقعت ہو کر محبت ہی نہیں رہتی، محض نوازش و کرم رہ جاتی ہے یا حقارت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

"نسیم! محبت، حقیقی محبت کو زوال ہو ہی نہیں سکتا۔" شہاب نے بڑے جذبے سے کہا۔

"تم جراحتِ دل کے ماہر بن رہے ہو لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دل میں صرف خون ہی نہیں ہوتا۔" نسیم نے بیدار شعور کے ساتھ جواب دیا۔

دھوئیں کے دائروں میں ماضی حال کے لمحات کا زنجیرہ بنتا رہا۔ شہاب، دور کی نیلی پہاڑیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی فلم اسکرین کو دیکھے۔ شہاب نے نسیم کے لب و لہجہ کے پیچھے جھانک کر دیکھا تھا۔ اس نے الفاظ کے پرت اُلٹ پلٹ کر حرفوں کی سیڑھیوں کی مدد سے معنی کے تہہ خانوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا نسیم مثلث محبت کا ایک زاویہ تھی۔ کچھ دنوں سے شہاب ایسا محسوس کر رہا تھا اور گفتگو کے بعد اسے نہ ریحانہ کا رویہ سمجھ میں آیا نہ نسیم کی تشریح۔ تشریحیں معنی کو مستور کر دیتی ہیں۔ وہ اُلجھتا رہا۔ اور اُلجھتے اُلجھتے مزید تعلیم و تجربے کے لئے انگلستان واپس لوٹ گیا۔

حادثاتِ زمانہ نے شہاب کے خاندان کو پاکستان پہنچا دیا۔ ریحانہ کا خاندان بھی ہجرت کر چکا تھا۔ صرف ایک شادی شدہ بہن ہندوستان میں رہ گئی تھیں۔ بہنوئی انجنیئر تھے۔ ریحانہ عموماً ہندوستان میں ہی رہتی تھی۔

شہاب نے شادی نہیں کی اور اپنے فن میں غرق ہو گیا۔ ماہ و سال گذرنے لگے اور وہ امراضِ قلب اور جراحتِ دل میں مہارت حاصل کرتا رہا۔ یہ فن اس کا مشغلہ بھی تھا اور مسئلہ بھی؛

مقصد بھی اور راحت بھی، ریحانہ کی محبت اور اس کے دل کے علاج کی فکر اسے قوت عمل عطا کرتی رہی۔ اور اب جب کہ شہاب ایک بہت ہی معیاری کارڈیک کلنک کا ڈائرکٹر تھا اور قلب کی سرجری میں عالم گیر شہرت حاصل کر چکا تھا، وہ اس فکر میں غلطاں تھا کہ اس سے کنارہ کش ریحانہ پھر اس کی طرف مائل ہو جائے اس کی گم شدہ جنت کی بازیابی ہو۔ لیکن ریحانہ صرف شہاب ہی سے نہیں زندگی سے بھی بیزار ہو چکی تھی۔

شہاب کو جنوبی افریقہ بلایا گیا تھا۔ امراض قلب کے مشہور اسپتال میں تبدیلیِ قلب کا ایک اہم آپریشن ہونے والا تھا۔ ایک موت کی سزا پانے والے حبشی نے ایک سفید فام نسل کے بیمار ماہرِ دندان کے لئے اپنا صحت مند دل پیش کیا تھا۔ شہاب وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے سوچا شاید دل بدل جانے سے سفید و سیاہ کا فرق مٹ جائے۔ ملکوں کی تقسیم سے زیادہ الم ناک رنگ و نسل، چھوت اچھوت اور طبقات کی تقسیمیں ہیں۔ کاش دنیا والے کے دل صحتمند ہو جاتے!

پیچیدہ خیالات اور موج در موج جذبات اس کے وجود میں اُبلنے لگے۔ اور ایک تیز لہر اُٹھی۔ ان موجوں کے درمیان اس کے ارادے کی چٹان اُبھری۔ وہ ریحانہ کے دل کو ضرور بدلے گا۔ وہ اپنے اسپتال میں تبدیلیِ قلب کا آپریشن کرے گا۔ وہ اپنی محبوب ہستی کو موت کے پنجے سے چھڑائے گا۔

شہاب اب تک دریچے کے مقابل کھڑا تھا۔ کئی سگریٹوں کی راکھ لمحات ماضی کی طرح گرتی اور بکھرتی رہی۔ اُمڈتے ہوئے خیالات و جذبات کے گردابوں میں وہ گھرا رہا۔

ریحانہ پٹنے میں تھی۔ افریقہ سے واپس آکر اسے پٹنا ورلانا تھا۔ کیا وہ اس میں کامیاب ہو سکے گا؟ اتنے بڑے آپریشن کے لئے لوگ راضی ہوں گے؟ خود ریحانہ موت کی آغوش سے نکلنا پسند کرے گی؟ موت شہاب کی رقیب تھی۔ وہ اس سے نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

ریحانہ کے ساتھ شہاب کو اپنا آبائی وطن یاد آیا، پیارا پٹنہ یاد آیا۔ پادری کی حویلی یاد آئی۔ اور بہت سے دردخیز "کاش" اس کے دل میں رینگنے لگے۔

ریحانہ اپنے دل کے زخموں کے مقابل تصورات کے صد پہلو آئینے رکھتی اور انھیں جشنِ تخیل

سے دیکھتی رہی۔ برسوں اس نے شہاب کی محبت کے صنم تراش کر اپنے دل کے مندر میں سجائے تھے اور اس کے جذبات ان کی پوجا کرتے تھے۔ لیکن بیماری کے شدید حملے کے بعد اس نے صنم خانے کے دروازوں کو بند کر دیا تھا۔ اور اسی کے اندر دھونی رما کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ شہاب کی شبیہ کو پوجتی تھی اور شہاب سے رو گرداں تھی۔ اسی لئے وہ پاکستان میں بہت کم قیام کرتی تھی۔ زیادہ تر ہندوستان میں رہتی تھی۔

پادری کی حویلی ٹوٹ کر نئے سرے سے بن رہی تھی۔ ہمسایہ گھنیرے درختوں پر فاختاؤں کی نئی نسلیں رین بسیرا لینے مسلسل آتی رہیں۔ مگر زرد مکان کے مکیں نئے بسیروں کی تلاش میں چاروں اور بکھر گئے تھے۔

اس گھر کی کئی کنواریاں اور کنوارے اب تک اسی عالم میں تھے۔ لیکن بعض کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ نسیم نے بڑی حقیقت شناسی سے کام لے کر مثلث محبت کو توڑ دیا تھا اور اس پنجرے سے آزاد ہو کر ایک خوب صورت پنچھی کی طرح اڑ گئی تھی۔ شہاب اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ لہذا اس نے ایک فوجی افسر سے شادی کر لی۔ لیکن ثروت اور علی وارث نے ابدی رہبانیت قبول کر لی تھی۔ ایک موٹاپے کے شکنجے میں پناہ گزیں ہوئی اور دوسرا زندگی کی کڑی دھوپ میں گھلتا پگھلتا رہا۔ مگر دونوں شہاب کے راستے کی رکاوٹ تھے۔

دھوئیں کے مرغولے فضائے بسیط میں تحلیل ہوتے رہے۔ کئی سگریٹ ختم کر کے شہاب ایک عزم تازہ کے ساتھ ناشتہ کی میز پر آبیٹھا۔ اس نے دو ابلے ہوئے انڈے اور دو توس کھائے۔ کافی کی دو گرم گرم پیالیاں پیں۔ اس کے پُر وقار چہرے پر صحت مند خون خوش فعلیاں کرنے لگا۔ اس کا ارادہ اور قوی ہو گیا۔ اور اس نے بڑی طمانیت سے فیصلہ کیا کہ افریقہ سے واپس آکر وہ ریحانہ کو اپنے اسپتال میں لا کر رکھے گا اور پشاور کے صدر اسپتال کے تعاون سے تبدیلی قلب کا آپریشن کرے گا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے شہاب اپنے کلینک کی طرف بڑے اعتماد سے روانہ ہو گیا۔

جب شہاب تبدیلی قلب کے آپریشن میں شریک ہو کر افریقہ سے کامیاب و کامران پشاور واپس آیا تو اسے ریحانہ کی شدید علالت کی خبر ملی۔ وہ ہندوستان میں تھی۔ شہاب طیارے

سے پٹنہ پہنچا اور ریحانہ کا علاج اور دیکھ بھال شروع کر دی۔ دل کا بدترین دورہ پڑا تھا۔ لیکن وہ جانبر ہو گئی۔ یہ فن کا نہیں محبت کا معجزہ تھا۔ شہاب دو ہفتے پٹنے میں رہا اور اس نے چٹانوں کو پگھلا لیا۔ اس نے ریحانہ کے بھائی بہنوں کو سمجھایا کہ تبدیلیِ قلب کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں۔ کسی وقت دل کا دورہ پڑے گا اور وہ چل بسے گی۔ سارے اعزہ جمع ہو گئے تھے۔ علی وارث بھی شہاب سے متفق ہو گیا مگر ثروت نے شدید مخالفت کی "یہ درندگی ہے۔ ریحانہ کو چین سے مرنے دو۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تقدیر ہو گی تو بچ رہے گی۔"

آخر ش ایک دن شہاب نے ریحانہ سے بڑی محبت اور اعتماد کے ساتھ بات کی۔

"رانو! تم خود بار بار کے دوروں سے اُکتا چکی ہو۔ آپریشن سے تم بالکل اچھی ہو جاؤ گی۔"

ریحانہ نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم میری محبت سے باز نہ آئے تو کیا میرا دل بدلنے کے ارادے سے ٹل جاؤ گے۔ تم جیتے، میں ہاری۔ شہاب! میری زندگی، میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میرا مالک جو چاہے کرے۔ میں آپریشن کے لیے خوشی دل سے راضی ہوں۔" شہاب کی آنکھیں پر نم ہو گئیں اور اس نے ریحانہ کے لب و رخسار بیتابانہ چوم چوم لیے۔

"میری رانو، میری رانو"

ریحانہ محبت کے شہپروں کے سہارے زندگی اور موت سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

"سر! میں نے کاٹج میں مس ریحانہ کے آرام کے سارے انتظامات کر دیئے ہیں۔"

"شکریہ مس ایلیس! اور ان کی تیمارداروں کے لیے؟" شہاب نے دریافت کیا۔

"جی ہاں! سب کے لیئے۔" مس ایلیس نے جواب دیا۔

"اور مس ایلیس ہی ریحانہ کے علاج و معالجے کی انچارج بھی ہیں۔" شہاب نے ذرا ناز سے کہا۔

"میں تو حکم کی بندی ہوں۔ ویسے مجھے مس ریحانہ سے محبت ہو گئی ہے۔ میں ان کے لیے سب کچھ کروں گی۔"

"مس ایلیس! یہاں ہم سب لوگ پارٹنر ہیں۔ حاکم کوئی نہیں۔"

شہاب نے پیار سے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ سسٹر ایلیس بڑے سکون کے ساتھ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

شہاب نے ریحانہ کے قلب کی تبدیلی کے آپریشن کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اُس کے بارے میں اپنے شرکائے کار محمود، ملہوترا، بنرجی، ایلیس وغیرہ سے مشورے کئے۔ پشاور کے صدر اسپتال کی دو ٹریں بھی لگائیں اور اپنے کارڈی ایک کلینک میں ایک اعلیٰ درجہ کے جنرل ایمرجنسی سرجیکل وارڈ کی تنظیم بھی کی۔ اس نے امریکا، انگلستان اور جنوبی افریقہ کے چند ماہرین سے تیار رہنے کی درخواست کی جو اس کے ہم مشرب سرجنوں نے منظور کر لی۔ کیبل گرام کے ذریعہ انٹرنیشنل اہمیت رکھنے والے سرجنوں سے مشورے ہوتے رہے۔ دل کے آپریشنوں کی رپورٹ کا مطالعہ کیا جاتا رہا۔

دوسری طرف ریحانہ کی صحت کو بہتر بنانے کے سارے جتن سسٹر ایلیس کی نگرانی میں ہوتے رہے۔ اس کے دل بہلانے کے لئے انتظام ہوا۔ انڈور گیم، قسم قسم کے ریڈیو، ٹیلی ویژن سٹ اور فلم منگوائے گئے۔ سسٹر ایلیس ریحانہ پر جان چھڑکتی تھی۔ شہاب زیادہ سے زیادہ وقت ریحانہ کے پاس گذارتا۔ اکثر ریحانہ، شہاب اور مس ایلیس تینوں مل کر کوئی کھیل کھیلتے، کتابیں پڑھتے اور سناتے، طرح طرح کی دلچسپ باتیں کرتے اور اپنی دنیا میں مگن رہتے۔

شہاب آپریشن کی نقشہ بندی، تفصیلات کی تعیین اور طریقہ کار طے کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ اپنے شرکائے کار کو ہدایت دیتا۔ ان سے مشورے لیتا اور آپریشن کی ٹکنیک کی بار بار وضاحتیں کرتا۔

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تبدیلیٔ قلب کے لئے کسی بدحال مریض کی موت کا انتظار کرنا صحیح طریقہ نہیں۔ پھانسی پانے والے مجرم کا انتخاب بھی مناسب نہیں۔ اس کے دل پر سخت خوفناک قسم کا نفسیاتی دباؤ پڑتا ہے۔ دونوں حالت میں دل کے رگ و ریشے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ وہ دوسرے جسم میں منتقل ہو کر اس کی دمسازی اچھی طرح نہیں کر سکتے"۔ شہاب نے اپنی ٹیم کو سمجھایا۔ "آپ کے خیال میں کون سی صورت سب سے بہتر ہے؟" سسٹر ایلیس

نے سوال کیا۔

"ماہرین قلب کی اکثریت حادثوں کے شکار صحت مند لوگوں کو ترجیح دیتی ہے۔ میں ان سے متفق ہوں۔ اگر کسی جاں بہ مجروح کا دل حاصل ہو سکے تو بہت سازگار ہوتا ہے۔ ورنہ جو میسر ہو۔ دماغی نقص و ٹیومس کے کیس بھی برے نہیں ہوتے۔ ان کے دل بھی کام کے ہوتے ہیں۔" سرجن شہاب نے تشریح کی۔

"ظاہر ہے کہ آپریشن شیڈول کو لچک دار ہونا چاہیئے اور کئی بدل مد نظر ہونے ضروری ہیں۔" سرجن محمود بولا۔

"بالکل صحیح! انتظار اور احتیاط! یہ ہمارا قول ہے۔" شہاب نے کہا۔

"اگر کسی مہلک بیماری کا مریض زندگی سے بیزار ہو کر مزید اذیت سے بچنے کے لئے اپنا دل عطا کرے تو آپ اسے قبول کریں گے؟" سرجن ملہوترا نے سوال کیا۔

"کیا قبل از وقت؟" بنرجی بول اٹھا۔

"بڑا نازک مسئلہ ہے۔ تبدیلی قلب کے آپریشنوں کے باب میں کئی اخلاقی سوال پیدا ہوں گے۔" شہاب نے وضاحت کی۔

شہاب کے سب ساتھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ پچھلے چند سالوں میں مسز ایلس بڑی جذباتی گہرائی سے شہاب کو چاہنے لگی تھی۔ وہ ایک تیس سالہ، دراز قد، نازک اندام، نیلی آنکھوں والی انگریز خاتون تھی۔ بڑی متین اور متوازن۔ اس نے اپنی زندگی شہاب کے اسپتال کے لئے وقف کر دی تھی اور نفسیاتی طور پر اپنے کو اس عظیم سرجن کی شریک حیات سمجھنے لگی تھی۔ مگر پاس وضع نے محبت کی چنگاری کو شعلۂ جوالہ نہ بننے دیا تھا۔ شہاب مس ایلس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ نہایت خلوص، جوش اور جذبے سے کام کیا کرتی تھی۔ شہاب کے گھر کی دیکھ بھال میں بھی منہمک رہتی اور اس کے کنوارے پن پر کڑھتی رہتی تھی۔ شہاب ایلس کے لئے مسیحا کی طرح تھا۔ کنوارا، پاکباز، دردمند نجات دہندہ۔ اور ایلس مارتھا یا مقدس لیلیٰ تھی۔

جب ریحانہ کلینک میں آئی تو ایلس کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ کوئی شہاب کا پرستندہ تمنا بھی ہے۔ لیکن اس کے جذبۂ پرستش میں کوئی فرق نہ آیا۔ شہاب مسیحا کا بروز تھا۔ مسیح کے

لیے اَن گنت کنواریاں اپنی زندگی وقف کر دیتی ہیں۔ ایلیس نے اپنے اندر کی عورت کو دل کی خانقاہ میں بٹھا دیا اور صلیب گلے میں لٹکا لی۔ خدا محبت ہے، خدا مسیح ہے۔ مسیح محبوب ہے اور محبوب سے وابستہ ہر شئے پیاری۔ ایلیس ریحانہ کو عبادت کے انداز میں چاہنے لگی۔

سرجن شہاب اپنے اسپتال کے ہر کارکن کا مکمل طبی معائنہ کراتا رہتا تھا۔ اس نے اُن کے خون کے گروپوں کا تعین بھی کر لیا تھا۔ اسپتال میں ہر قسم کے اعداد و شمار اور ہر نوع کی طبی اطلاعات کا باضابطہ ریکارڈ موجود تھا۔ مریضوں کے متعلق بھی ہر ضروری اطلاع حاصل کر لی جاتی تھی۔ ریحانہ کا طبی معائنہ اور ہر طرح کی جانچ باقاعدہ رنگ میں کر لی گئی تھی۔

"ریحانہ! ہمارے دل کس طرح مل گئے ہیں! دیکھو ہمارا بلڈ گروپ بھی ایک ہی ہے۔" ایلیس نے ریحانہ سے کہا۔

"مجھے بے حد خوشی ہے کہ ہم دونوں اتنے مل جل گئے ہیں۔ کاش ہم لوگ ہمیشہ ملے گھلے رہیں۔" ریحانہ بولی۔

منصوبہ کے شیڈول کے مطابق آپریشن کا مہینہ قریب آ گیا تھا۔ ہمہ جہتی طور پر تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ چند مریضوں اور پھانسی پانے والے قیدیوں کو بھی چن لیا گیا تھا۔ پیشاور اسپتال اور جیل سے رابطہ قائم تھا۔ حکومت سے باقاعدہ اجازت لے لی گئی تھی اور متعلقہ اشخاص سے ضروری اجازت نامے بھی حاصل کر لئے گئے تھے۔ لیکن شہاب حادثات کی طرف لو لگائے ہوئے تھا۔ وہ تبدیلیِ قلب کے لئے حادثات میں ہلاک ہونے والے کو ترجیح دیتا تھا۔ آپریشن کی صحیح تاریخ تو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ عمل سارے حالات کی سازگاری پر منحصر تھا۔ تاہم شہاب نے ایک مہینہ متعین کر لیا تھا۔ اس بات کا علم سوائے اس کے اور کسی کو نہ تھا۔ شرکائے کار کو اس نے تین مہینے کی مدت کی خبر دی تھی۔ اس دوران میں کبھی آپریشن ہونے والا تھا۔ پندرہ دن قبل خاص ماہرین کو اطلاع دے دی گئی۔ لیکن صرف یہ بتایا گیا کہ فلاں تاریخ سے مقررہ مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ بیرونی ممالک کے ماہروں کو بھی بلوا لیا گیا۔ سارے انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ ریحانہ کو ایک عام اطلاع دی گئی کہ اس کے آپریشن کا وقت قریب آ رہا ہے۔ مسٹر ایلیس اسے نفسیاتی طور پر تیار کرتی رہی۔ اسے بتایا گیا کہ تبدیلی

قلب کا آپریشن اب کثرت سے کامیاب ہونے لگا ہے۔ شہاب کی مہارت فن پر ریحانہ کو اٹل اعتماد تھا۔

ایک ہفتہ کی مدت مقرر کر لی گئی اور حادثات کے شکار اشخاص کی تیزی سے تلاش کی جانے لگی۔ دوسرے "بدل" بھی قطعی طور پر منتخب کر لئے گئے۔ تین شدید قسم کے مجروحین مل گئے۔ تینوں کو کلینک کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر لیا گیا اور ان کا علاج شروع ہو گیا۔ ہر طرح کی جانچ کر لی گئی۔ آپریشن تھیٹر اپنے جدید ترین ساز و سامان کے ساتھ تبدیلی قلب کے آپریشن کا منتظر تھا۔ مصنوعی دل، میکانکی پھیپھڑے اور گردے مناسب جگہوں پر سیٹ کر دیئے گئے۔ بلڈ پلازما اور ٹرانسفیوژن کے ساز و سامان تیار تھے۔ بے ہوش کرنے والی دوا کے آلات، آکسیجن سلنڈر اور ہر قسم کے ضروری اوزار جراحت موجود تھے۔ ماہرین فن ہر وقت چوکس رہتے تھے۔

مجروحوں کا علاج معالجہ بڑی دیانت داری اور توجہ سے ہوتا رہا۔ ایک اچھا ہونے لگا۔ دوسرے کی حالت جوں کی توں تھی۔ تیسرے کا حال بُرا تھا۔ حادثے میں خون بہت بہہ گیا تھا اور دو بار خون چڑھانے کے باوجود وہ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ اندازہ تھا کہ وہ ایک دو روز کا مہمان ہے۔

تیسرے مجروح کی حالت بگڑتی گئی۔ شہاب نے طے کر لیا۔ اس تیسرے شخص کی جانچ سے یہ پایا گیا کہ تبدیلیِ دل کے لئے یہ نہایت موزوں ہوگا۔

شہاب نے اپنے سارے رفقاء کو آگاہ کر دیا کہ اگلے تین دنوں میں سے کسی دن تبدیلی قلب کا آپریشن ہوگا۔ سب لوگ پورے طور پر تیار رہیں۔ پشاور کے مرکزی جیل اور اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ سے فون کے ذریعے 'بدل' کے تعین کے لئے باتیں کی گئیں۔ تفصیلات طے کرنے کے لئے شہاب نے کاغذات تیار کیے اور انھیں ایلیس کے حوالے کر دیا کہ کسی کو پشاور روانہ کر دے۔ وہ خود آپریشن تھیٹر کی آخری دیکھ بھال میں مشغول ہو گیا۔

ایلیس شہاب کے کاموں کو اپنا کام سمجھتی تھی۔ اس نے انتہائے اخلاص میں کلینک کی جیپ نکالی اور تمام کاغذات لے کر پشاور کو روانہ ہو گئی۔ اس کے ذہن کے اوراق میں بھی نہ جانے کتنی شعوری و لاشعوری تحریریں مستور تھیں۔

سہ پہر کو پشاور صدر اسپتال کے بڑے سرجن کا فون آیا۔ ایلیس کہساروں میں جاتے

کا شکار ہو گئی۔ اُسے اسپتال میں داخل کر لیا گیا ہے۔ شہاب پر بجلی گری۔

سارے کلینک میں کھلبلی مچ گئی۔ شہاب کے ساتھ محمود، بنرجی، اور ملہوترا بھاگم بھاگ پشاور اسپتال پہنچے اور سیدھے آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑ پڑے۔ ایلیس کو پہیئے دار اسٹریچر سے باہر لایا جا رہا تھا۔ سب بیتابانہ اسپیشل سرجیکل وارڈ کی طرف چل پڑے۔

"کھوپڑی پر سخت چوٹ ہے۔ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ لیکن دماغ پر کتنی گہری ضرب پڑی ہے کیا معلوم؟"

انچارج سرجن نے شہاب سے کہا۔

"شکریہ سرجن! آپ سب لوگوں کا شکریہ۔ آپ نے ایک نہایت قیمتی جان بچائی ہے"

شہاب بڑے گہرے تشکر سے بولا۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ پیاری روح ہماری تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لئے کب تک اپنے خوب صورت قالب میں رہے گی۔" سرجن فریدی نے کہا۔ سب متفکر سے آگے بڑھتے رہے۔

رات بڑی تشویش میں کٹی۔ کلینک کے سب سرجن پشاور اسپتال ہی میں رہے۔

"شکر خدا کا! جیپ اُس وقت اُلٹی جب گھاٹی کا آخری نچلا ڈھلوان آچکا تھا۔"

محمود نے سگرٹ انگلیوں میں دابے ہوئے کہا۔

"ایلیس بچ جائے گی۔ لیکن اس نے یہ خطرہ مول کیوں لیا۔ ویسے وہ ڈرائیونگ اچھی طرح جانتی ہے۔" بنرجی بولا۔

"پُر پیچ گھاٹیوں میں موٹر ڈرائیو کرنا موت سے آنکھ مچولی کھیلنا ہے۔" ملہوترا نے فکر مند انداز میں کہا۔

"ایلیس کو فرض شناسی کا گہرا احساس ہے۔ ہم لوگ آپریشن کی تیاری میں مشغول تھے۔ اس نے ہم میں سے کسی کو ساتھ لینا نامناسب سمجھا۔ اور وہ ریحانہ کو بے حد چاہنے لگی ہے۔ محبت و فرض کے دوہرے جوش میں وہ تنہا نکل کھڑی ہوئی۔" شہاب بولا۔

"کلینک کا ڈرائیور تو موجود تھا۔" بنرجی نے اظہارِ خیال کیا۔

"شکر ہے کہ وہ بچ گئی۔" ملہوترا نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو!" محمود بولا۔

صبح پُر امید اور روشن تھی۔ ایلیس کو ہوش آتا جا رہا تھا۔ شام تک اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ لیکن ایلیس بالکل بے ربط باتیں کرتی رہی۔ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان۔ ڈاکٹر ڈن کی رائے تھی کہ خون بہت ضایع ہوا ہے۔ بلڈ ٹرانسفیوژن کے باوجود نقاہت باقی ہے۔ اسی لیے دوران بے ہوشی کا اثر ابھی تک دور نہیں ہوا۔

"میری ایچی! میری ایچی! سرجن!......اور پُر پیچ راستہ......زندگی کا پُر پیچ راستہ! دُور نیلا آسمان......بلیڈ میری......شہاب! او کرائسٹ! مائی لارڈ......"

ایلیس ہذیانی کیفیت میں مبتلا تھی۔

تبدیلیِ دل کا آپریشن ایک ہفتے کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ ایلیس کی طرف سے ذرا اطمینان کے بعد کوئی تاریخ مقرر ہونے والی تھی۔ امید بندھی تھی کہ ایک دو دنوں میں ایلیس اچھی ہو جائے گی۔ مگر اس کی حالت ذرا سنبھلتی اور پھر بگڑ جاتی۔ سانحہ کے چوتھے دن اس کی آواز بہت نحیف ہو گئی اور جب وہ بے ہوشی سے ذرا ہوش میں آئی تو چار ہذیانی جملے دھیمی آواز میں بولتی اور خاموش ہو جاتی۔ پانچویں دن صبح کو ایلیس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ شہاب پاس بیٹھا تھا۔ وہ قریب تر ہو گیا۔ ایلیس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں بہت دھیمے سے کہا۔

"کرائسٹ! سیو مائی سول! میری یا سیو مائی ہارٹ! ایچی! ڈائری! او گاڈ......ہاؤ گرین واز مائی ویلی!......شہاب! سرجن شہاب! مائی لو! سیو مائی ہارٹ! گاڈ از لو!......!"

ایلیس نے نیم بے ہوشی میں کئی بار ایچی کا ذکر کیا تھا۔ شہاب نے وہ ایچی منگوائی جو حادثے کے وقت جیپ پر بھی ایلیس کے ساتھ تھی اور اسے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ کلینک کے سرجنوں کے سامنے ایچی کھولی گئی۔ ساری اشیاء کا جائزہ لیا گیا۔ ڈائری کا سرسری معائنہ بھی ہوا۔ یادداشت کے صفحات میں پہلے صفحے پر سُرخ روشنائی سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"میرے سینے میں ریحانہ کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ اُس کی امانت ہے۔ شاید میرا دل ریحانہ کے پاس ہے یا اُس کے پاس جس نے ریحانہ کا دل لے لیا ہے۔

اگر میں جلد کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں نو ریحانہ کی امانت اسے واپس دے دی جائے۔
یہ میری وصیت ہے" حادثے سے قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے کی تاریخ کے ساتھ ایلیس کے دستخط تھے۔

شہاب پر اس عبارت کو پڑھ کر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے جذبات کے موتی برسنے لگے۔

ایلیس کسی طرح سے جانبر نہ ہو سکی۔ سہ بارہ بلڈ ٹرانسفیوژن کیا گیا۔ جانچ کے بعد دوسری دفعہ خود شہاب نے ایلیس کے لئے اپنا خون پیش کیا۔ خون کافی مقدار میں چڑھایا گیا۔ ساری کوششیں کر لی گئیں لیکن کچھ نہ دوا نے کام کیا؛ ایلیس جان بحق تسلیم ہو گئی۔ اور محبت ہی حق ہے۔ آخر بہت بڑا فیصلہ کر لیا گیا۔

"اگر جی اُٹھنے پر ایمان نہ ہو تو صلیب پر مرنا اتنا بڑا المیہ نہیں"۔ پشاور کے بڑے اسپتال کے بڑے سرجن نے کہا۔

"اور مریم نے بھی اپنی صلیب آپ اُٹھائی۔ وہ اس پر شہید ہو کر دوبارہ جی اُٹھے گی۔" شہاب نے بڑے دردناک عزم کے ساتھ جوشیلے انداز میں کہا اور فیصلے کا دن آ گیا۔

ایلیس کا سینہ بڑی تکنیکی مہارت کے ساتھ چاک کیا گیا۔ مصنوعی دل اور پھیپھڑے کلینک سے منگوا لئے گئے تھے۔ خاص قسم کا بلڈ پلازما تیار تھا۔ مرحومہ کی کارونری آرٹری کو کاٹ کر اس کا سلسلہ مصنوعی دل سے ملا دیا گیا۔ اور قلب سے نکلنے والی شریان کو مصنوعی پھیپھڑے سے وابستہ کر دیا گیا۔ عضلاتِ قلب میں دوران خون ہونے لگا۔ ایلیس کے 'الورٹا' اور 'وینا کیوا' پر بھی جراحت کا عمل کیا گیا۔ مرکزی ورید و شریان کے ذریعہ دل کی صفائی عمل میں آئی۔ وہ آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا۔ بڑے اہتمام کے ساتھ خاص ایمبولنس کار پر ایلیس کی لاش کو اُس کے دلِ زندہ کو، بڑی تیزی کے ساتھ شہاب کے کلینک میں پہنچا دیا گیا۔ اسی رات کو تبدیلیِ قلب کا وقت مقرر کر دیا گیا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ریحانہ کا آپریشن عمل میں آیا۔ ماہرین نے "دو قلب زندہ" اور حاصل کر لئے تھے۔ ایک ضلع جیل میں پھانسی پانے والے مجرم کا دل تھا اور دوسرا کلینک کے ایمرجنسی سرجیکل وارڈ میں مر جانے والے ایک مجروح کا۔ پہلو کے آپریشن تھیٹر میں تینوں لاشیں

رکھی ہوئی تھیں۔ تینوں دنوں کے رگ وریشے اور عضلات کی مکمل کیمیادی اور خوردبینی جانچ ہوئی۔ دوسرے کمرے میں ریحانہ کا صدر چاک کیا گیا۔ محاذ قلب اور ورید وشریان کا معائنہ ہوا۔ مختلف چیزوں کے سارے ضروری امتحان ہوئے۔ ایلیس کا دل ریحانہ کے لئے سب سے بہتر ثابت ہوا۔ ان دونوں میں بڑی مماثلت تھی۔

"انسانی مماثلتوں کے لئے رنگ ونسل کی کوئی قید نہیں"۔ سرجن بنرجی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

ریحانہ کا ماؤف دل نکال لیا گیا۔ اس کے ورید وشریان مصنوعی میکانکی دل اور پھیپھڑوں سے عارضی طور پر منسلک کر دیئے گئے۔ بجلی سے چلنے والے مصنوعی دل میں ریحانہ کے مخصوص نمبر کا بلڈ پلازما بھرا ہوا تھا اور میکانکی پھیپھڑوں میں خون کی صفائی کے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔

ایلیس کا دل اس کے سینے سے بالکل علیحدہ کر لیا گیا اور پورے ساز وسامان کے ساتھ بڑی پہیہ دار ٹرالی پر بے ہوش ریحانہ کے قریب لایا گیا۔ اس پر ضروری سائنسی عمل کئے گئے اور اسے ریحانہ کے سینے میں نصب کر دیا گیا۔ مصنوعی دورانِ خون کے سارے سلسلے منقطع کر لئے گئے اور ماہر سرجنوں نے شہاب کی سرکردگی میں ریحانہ کے مرکزی ورید وشریان کے سلسلے ایلیس کے دل کے ورید وشریان سے ملا دیئے۔ اب ایلیس کا دل ریحانہ کا دل تھا — اور دیکھو وہ دھڑک رہا ہے! ریحانہ کے پھیپھڑے بھی کام کرنے لگے۔ شہاب کے ہاتھوں کا ایک معجزہ ظاہر ہوا۔

آپریشن کی ساری منزلیں بخیر وخوبی طے کی گئیں اور ماہرین کو کامیابی نصیب ہوئی۔ آپریشن کے بعد کی ساری احتیاطوں پر عمل کیا گیا۔

ایلیس کے مقدس جسم کو پھولوں سے ڈھک دیا گیا۔ دوسرے روز تجہیز وتکفین ہونے والی تھی۔

رات تسلی بخش طور پر کٹی۔ سہ پہر کو ریحانہ اس وقت ہوش میں آئی جب ایلیس کے پاک جسم کو کلینک کے قریب ایک سرسبز مرغزار میں سپرد خاک کر کے شہاب اور دوسرے لوگ سر جھکائے

آبدیدہ واپس آئے۔

— اور ایلیس جی اُٹھی!

ریحانہ آپریشن کے دس ماہ بعد تک کلینک میں رہی۔ اسے دو ماہ بعد کلینک سے اُٹھنے کی اجازت ملی اور بغیر سہارے کے وہ تھوڑا تھوڑا چلنے لگی۔ اس نے آپریشن کے چند ہی دنوں بعد پوچھنا شروع کیا کہ ایلیس کہاں ہے؟ وہ ایلیس کے لئے بے چین رہنے لگی۔ اسے بتایا گیا کہ آپریشن کے دوسرے دن انگلستان سے کیبل آیا کہ ایلیس کی ماں بستر مرگ پر ہے۔ اسی لئے وہ بذریعہ طیارہ ولایت چلی گئی۔ اس اطلاع کے باوجود ریحانہ ایلیس کی راہ تکتی رہی۔ وہ بار بار ایلیس کے بارے میں شہاب سے پوچھتی، اس کی ماں کی خیریت دریافت کرتی اور فکرمند رہتی۔

شہاب جب بھی ریحانہ کو دیکھتا، اس کا دل تیز تیز چلنے لگتا۔ اور اکثر اس کی آنکھیں پرنم ہوجاتیں۔ ریحانہ سمجھتی مسرت کے آنسو ہیں۔ محبت اور فن کی فتح کی خوشی ہے۔ لیکن آنسوؤں میں ایلیس کی المناک محبت کا درد بھی شامل تھا۔ شہاب ریحانہ کے دل کا معائنہ کرتا تو اس کی دھڑکنوں میں ایلیس کے پیار کی آواز سنتا۔ وہ بہت مسرور رہتا کہ ریحانہ زندہ ہے، اور بے حد رنجیدہ کہ ایلیس اب زندہ نہیں۔ لیکن اُسے یہ احساس ذرا مطمئن کر دیتا کہ ایلیس کا دل ریحانہ کے سینے میں زندہ ہے۔ اور اس کی محبت کی پرورش کر رہا ہے۔ محبت غیر فانی ہے۔

ریحانہ کے رشتہ داروں نے اسے لاہور لے جانا چاہا۔ ثروت اور علی وارث [illegible] پُر اصرار تھے۔ شہاب کہتا تھا کہ کلینک سے باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آخر شہاب راضی ہوگیا اور اس نے مشورہ دیا کہ خاص طیارہ کے ذریعے [illegible] کر لے جایا جائے۔

ریحانہ لاہور میں بخیر و خوبی تین مہینے رہی۔ شہاب پشاور سے آکر اسے ہر ہفتہ دیکھ جاتا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ اس نے بار بار لوگوں کو تنبیہہ کی تھی کہ ایلیس کی موت کی خبر اور تبدیلی دل کی تفصیلات اسے ہرگز نہ بتائی جائیں۔

ریحانہ کو حیرت تھی کہ ایلیس نے ولایت سے کوئی خط نہیں لکھا اور اس کی خیریت نہیں پوچھی۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ایلیس اسے کبھی بھول سکتی ہے۔

ایک دن پرانے میگزین کے اوراق الٹتے ہوئے ریحانہ کو ایلیس کی تصویر نظر آئی۔

اُس رسالے میں تبدیلیِ قلب کے آپریشن کی تفصیل بڑے فخر سے پیش کی گئی تھی۔ مضمون مصوّر تھا۔ سرجن شہاب، ریحانہ، ماہرین کی جماعت اور مسٹر ایلیس کی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔

ریحانہ اصل حقیقت کی تاب نہ لا سکی اور چیخ کر بے ہوش ہو گئی۔ مقامی ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ شہاب کو تار دیا گیا۔ بہت دیر کے بعد ریحانہ کو ہوش آیا۔

"ایلیس! ایلیس! میری جان ایلیس!" ریحانہ دردناک طور پر سسکتی رہی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ بڑی نازک حالت سے گذر رہی ہے۔ اس پر نشنجی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

شہاب اپنے کلینک کے ڈاکٹروں سمیت لاہور چارٹرڈ طیارے سے پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ ریحانہ کے کمرے میں داخل ہوا وہ اُٹھ بیٹھی اور اپنے بازو پھیلا کر روتی ہوئی بولی۔

"شہاب! میری ایلیس!" —— اور وہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

شہاب اور اس کے رفقاء نے لاکھ جتن کئے مگر ریحانہ کی حالت خراب ہوتی گئی۔ دوسرے دن ریحانہ کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ اس کے سینے میں ایلیس کا دل رُک گیا۔ شہاب دو دھاری تلوار کی جاں سوز جراحت سے تڑپ کر رہ گیا۔

ثروت اور علی وارث کی مخالفت کے باوجود شہاب ریحانہ کی لاش پشاور لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ کلینک کے قریب ہی ایلیس کی قبر کے پاس مرغزار میں ریحانہ کو پھولوں اور آنسوؤں کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

کارڈیک کلینک کے رفقاء شہاب کی طرف سے بے حد متردد و پریشان تھے۔ وہ دنیا سے بے خبر قبروں کے پاس دھونی رمائے بیٹھا رہتا۔ اشعار پڑھتا اور تبدیلیِ قلب و جراحتِ دل پر مختلف لٹریچر کا گھنٹوں مطالعہ کرتا۔ کبھی دور کی وادیوں اور کوہساروں میں گم ہو جاتا۔

"وہ عورت جو مر گئی ہے جی اُٹھے گی......اف ونٹر کمس کین اسپرنگ بی فار بیہائنڈ؟ ......تکیہ وعدے پر ہے، سب چپکے پڑے ہیں تہِ خاک......موت زندگی ہے۔ موت موت ہی ہے......وہ دوسری عورت جو مر گئی، کیا جی اُٹھے گی؟......"

مصحفی ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

میرے دل کا آپریشن کرو محمود، ملہوترا، بنرجی! سب کے دلوں کو بدلو۔ حوا کے دل کو بدلو۔ مگر دل کہاں سے آئیں گے۔ ایک پنجرا، ایک پنچھی...... طائر بے قفس، قفس بے طائر ...... آخر کام تمام کیا......"

شہاب پہروں گم سُم نیلے کہساروں کی طرف دیکھتا رہتا۔ اسے ہمیشہ دھڑکنے والے دل کا انتظار تھا۔

"سپنوں کے دیس میں"
۱۹۶۹ء

ایک درخت کا قتل

ایک کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا، مضبوط، گھنیرا اور خوب صورت درخت تھا۔ شہر کے مشہور باغ کو بڑی بدسلیقگی سے کاٹ کاٹ کر بے ربط، بدوضع کوارٹر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ بے ہنگم، نہ ناک درست نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند و بالا درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا، ہرا بھرا، سایہ دار، ماحول کے بے کیف سپاٹ پن اور بدآہنگی کو دور کرنے والا۔ گہری جڑیں، سڈول، بھاری بھرکم، اونچا تنا، پھلی ہوئی صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سُندر، ہرے، بولتے ہوئے پتے۔ اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ جس مٹی سے ایسا وِشال درخت اُگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔ اس پرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوب صورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیئے گئے ہوں گے، آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ اُفتادہ زمینوں اور بنجر قطعوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن نہ جانے کس جبلت کی تسکین کے لئے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔

اس برباد باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے جگری دوست ایک مہاراجہ کو تحفتاً یہ باغ پیش کیا تھا۔ اُنھیں دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رما بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ اراضی بھی شاہ صاحب کو دے دیا۔ آج بھی اس احاطے میں قبریں موجود ہیں۔ خدا رسیدہ فقیر کا سالانہ عرس ہندو مسلمان سب دھوم دھام سے

مناتے ہیں۔ جس عظیم الشان درخت کا ذکر ہے شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کئے ہوئے تھا، جیسے چتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطے کی خاک پاک ہے۔ جب انگریزوں کا راج ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر بہار نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ بہار اجہ سے اونے پونے خرید لیا۔ یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی۔ مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا۔ اور وقت پر پھل دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہوگئیں اور ان کے نشانات بھی مٹتے گئے۔ لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکامیاب ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہدوں کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔ انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔ اس وشال پیڑ نے یہ خونی ڈرامہ دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خونِ شہداء سے آبیاری ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتے یا شاخیں کوئی توڑ تا تو ان سے سرخ خون ٹپکنے لگتا تھا۔ اسی وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے تو کسی بڑھئی کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس متبرک، زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبۂ روزگار تھا۔ اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا، کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ نہ پھول نہ پھل۔ مگر ہریالی، شادابی، نینن سکھ اور سکون دل و جان۔ یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پہلے پھول لگتے تھے، پھل لگتے تھے۔ اس بات کی شہرت بھی تھی کہ فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ اِدھر سالوں سے کسی نے پھول دیکھے نہ پھل کھائے۔ شہر بھر میں ایک کوئی پیڑ نہ تھا۔ ریاست اور رنگ بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں۔ مجھے اس درخت کے وقار سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ ایک لگتا تھا کہ وہ آندھیوں اور طوفان کو آڑے لے گا۔ وہ ہماری سپر تھا۔ سہارا تھا۔ مربّی تھا، ہم سایہ تھا، ساتھی تھا، دوست اور غم گسار تھا۔ وہ قطب نما تھا۔ ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔ پورے احاطے کی انفرادیت اس سے قائم تھی۔ میں پہروں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ ہر موسم میں اس کی الگ بہار تھی۔ صبح، دوپہر، شام جب بھی دیکھئے وہ دل کش

تھا۔ چاندنی راتوں میں اس کا حسن دیدنی تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک بلند و بالا، قوی اور جاگتا ہوا سنتری دکھائی دیتا تھا اور اس کی حفاظت میں ہم سب لوگ سکھ کی نیند سوتے تھے۔ اس کی خاموش ہم کلامی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ آنکر ائے گا، اور ایک عظیم و سرفراز شجر بن جائیگا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور اسے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لال لال لہو تیرتا تھا اور اس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا تھا، وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسبان کی طرح چوکس کھڑا رہتا تھا۔ کبھی کوئی ٹھیکہ دار دور کے شہر سے مزدور لاکر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تبر چلاتے ہی سُرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور کام رک جاتا۔ ایک بار کوئی کلہاڑا چلانے والا درخت کی کسی اونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات اور رحمت کا علَم بردار درخت فضا کی رفعتوں پر لہلہا رہا اور اس کا ماحول اس کا گہوارہ بنا رہا۔ اسے دیکھ کر تسکین اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں نہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بے باک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہوا۔ بڑے بڑے، لانبے اور موٹے رسّوں سے اس درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی پر چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی، اور اُنھیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کئی مزدور کٹے ہوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جھُلاتے ہوئے زمین پر لے آتے۔ یہ اہتمام اس لیے تھا کہ قبر اور مزاروں کو نقصان نہ پہنچے۔ یہ پیڑ جڑ کے پاس سے گرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا وقار و جلال لرزہ پیدا کرتا تھا۔ اس میں زمین کا جاں بخش رس تھا، بلند آسمان کی کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اس درخت کو پھانسی دی جاتی رہی۔ عضو بہ عضو لال لال

عرق بہتا رہا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد خون کے چکتوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کوارٹروں کی نالیوں میں لال لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رستے پارہ پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لئے کام رک گیا۔ لانبے لانبے بالوں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکہ دار کو بڑی تشویش ہوئی۔ محلے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے لگے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اونچا چھتنار درخت کٹے تو وہ اپنے کوارٹروں کے چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اُگا کر کچھ پیسے حاصل کرلیں۔ اس عظیم درخت کی قلمرو میں مولی اور چقندر کہاں اُگ سکتے تھے۔ ہاں امن، سکون، طمانیت، راحت اور حُسن کی نشو و نما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی تھی۔

کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے بڑے موٹے تنے کٹنے لگے۔ کئی تنوں سے بھاری رستے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور ان کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے۔ درخت کے تنوں پر کلہاڑے اور آرے سے تیز دست مزدور اس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے اور مضبوط رسّوں سے باندھ کر انھیں آہستہ آہستہ جھُلا جھلا زمین پر کوارٹروں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے گٹھیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ اور اُن کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں۔ روزانہ دو ہی تین تنے کاٹے جا سکتے تھے اور انھیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رستے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رستے کو دھیرے دھیرے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیو قامت تنوں کے ٹکڑوں کو کوارٹروں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا کہ ان پر ضرب نہ پڑے۔ پھر بھی زور کا دھکا ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیسے جاگتے، شاداب و مسرت بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا، جیسے پہلے لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد ان کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن مہینے بھر تک سولی پر چڑھتا رہا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک مہیب رعب دار جڑیلا تنا اور اس سے نکلے ہوئے دوشاخوں تنوں کے ٹکڑے بے برگ و بار، بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رستے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطے میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر اس ٹھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سُدھ بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکہ دار بیل گاڑیوں میں لے جا چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے ایک دیو قامت غلیل ہے۔ اس کا عظیم دوشاخہ آسمان تک بلند ہو جانا چاہتا ہے اور مہیب دستہ دھرتی کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب شگفتی شالی دھرتی کٹے ہوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹونوں کو چوٹی پر جا کر شست باندھے گی اور قاتلوں پر بھرپور نشانہ لگائے گی۔

ایک روز دوشاخہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مگر گرتے گرتے دوشاخہ کے ایک بازو نے ایک کوارٹر کی دیوار سے ٹکرا کر اسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کوارٹر کی گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں بہیمیت قتل و غارت کا کام ٹھیکیدار نے روک دیا اور وسطی جڑیلا تنا دیوار سے اٹکی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔

ہفتوں یہ دردناک تنا مقتولِ امن و شادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیرِ نیم کش کی طرح پیوست رہا۔ اور دوشاخے کے دونوں بازو کسی عظیم ٹوٹی ہوئی بیساکھی کے بالائی حصوں کی مانند اس سر و تن بریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔

بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آ گیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آئے اور کچھ چھڑکاؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح روح پرور معجزہ رونما ہوا، اسے دیکھ کر ہم سب خوشی سے لہلہا اٹھے۔ چند ہی دنوں بعد ٹھیکہ دار پھر نمودار ہوا اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے کے لئے آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ ہم چوکنا ہو گئے اور بھاگتے ہوئے مقتول درخت کی طرف دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکہ دار اور عملوں سے پرزور احتجاج کیا اور انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹے گا۔ جو زمین پر تنوں کے گرے ہوئے ٹکڑے ہیں چاہو تو اٹھا کر لے جاؤ۔

جڑمیں اب ہرگز ہاتھ لگانے نہیں دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکہ دار اور اس کی ذرّیت دفع ہوئی اور دوسرے دن وہ لوگ تنوں کے اُفتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح برگد بلا کا صابر، استقلال، اطمینان اور امید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بالائی پہلو میں سرسبز نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور کوارٹروں کی چھتوں سے اونچا چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وہ رحمت نشان درخت مر کر بھی جی اُٹھا تھا۔

"آج کل" دہلی

مئی ۱۹۷۱ء

ناشر
بہار اردو اکادمی
پٹنہ ۴